

# چاہتیں کیسی

رضیہ بٹ



# چائے پیئیں کسی

رضیہ بیٹ

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

## فہرست

۷	صبح کا آنچل
۳۷	اب کے بچھڑے
۷۷	بہلاوے
۱۰۳	چاہتیں کیسی
۱۳۹	کایا پیٹ
۲۰۲	نفرتیں کیسی
۲۴۹	انتظار
۲۷۶	بلا عنوان

# صبح کا آنچل

عروسی لباس پر نگاہ پڑتے ہی اسے اپنی پہلی شادی یاد آگئی، احساس کے تواسے بڑے جاندار ہوتے ہیں۔ لباس کے رنگ میں وہی جھلک تھی یا جگر گاتے سسے ستارے میں۔ اسے اس یاد نے ہلا کر رکھ دیا۔ اس نے ڈبے سیماں کی طرف دھکیل دیئے۔

تین سالوں میں یہ اس کی تیسری شادی تھی۔ سیماں بندر س سڑھی والے سے دونوں ڈبے سے کر آئی تھی۔ رہا اپنے کمرے میں ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھی تیز برقی روشنی میں اپنی بھنوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی ایکس کو اچکا کی کبھی دوسری کو۔ ٹوئیز رہا تھ میں ننھا۔ جہاں کہیں کوئی فائبر بال نظر آتا کھاڑ لیتی۔ وہ بیوی پارلر سے بھنوں بنوا کر آئی تھی۔ بازوؤں اور مانگوں پر تھرڈ ہینڈنگ بھی کردانی تھی۔ کل شادی تھی اور ایک دن پہلے یہ کام کرنا تھا۔ وہ ابھی ابھی بیوی پارلر سے آئی تھی

اور۔

ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں بھنوں کو بنا سفوار رہی تھی۔

”آجاؤں؟“ سیماں نے نیم وا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تھا۔

”ہاں۔“ وہ اسٹول پر ہی گھوم کر دروازے کی طرف رخ کرتے ہوئے بولی تھی۔

”لو۔“ اس نے کپڑے بڑھائے۔

”آگئے کپڑے۔؟“

”ہاں!“

”ہوں!“

سیمان نے دونوں ڈبوں سے کپڑے باہر نکال کر اسے دکھائے۔ ”اتنا بھاری اور خوبصورت کام ہے۔ کپڑا تو نظر ہی نہیں آتا۔ جھٹک پڑتی ہے صرف قرمزی رنگ کی۔ نیل کے پاس پیسہ بھی ہے اور اچھا ذوق بھی!“

رما کے اندر ہل چل سی مچی تھی۔ سیمان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

”خوب موٹی آسامی ہے۔ تین چار لاکھ کا تو زیور ہی خرید رہے۔ پہلی بیوی کا زیور الگ ہے۔ شادی کے دن کہتا ہے نیاز زیور ہی پہنایا جائے۔ ویسے تم نے پہلی بیوی کے زیور کا بھی صفایا کرنا ہے۔“

”سیمان!“ وہ اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

”کیا ہے؟“

”کیا تم مجھے تھوڑی دیر کے لیے تنہا نہیں چھوڑ سکتیں؟“

”طبیعت خواہ ہو گئی ہے کیا۔!“

”یہی سمجھو۔“

”ڈاکٹر کے پاس چلو گی؟“

”نہیں۔ بس تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو۔“

”چھوڑ دیتی ہوں۔ دیسے بھی میں اور سلیم نیل کے ہاں جارا ہے ہیں۔ حق ہر کا تصفیہ کرنا ہے۔ ویسے تو وہ ہر بات مان رہا ہے۔ جتنا بھی کہیں گے مکہ دے گا۔ دوسری کا چاؤ سبھی بہت ہے تا اسے۔“ سیمان کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری۔ ہنس کر بولی۔ ”خوب آؤ بن رہا ہے۔ آگے میسے بنے گا۔“ رما کچھ نہیں بولی۔

سیمان نے اس کی پشت تھپتھپاتی پھر کپڑے سمیٹتے ہوئے بولی۔ ”تم تھوڑی دیر آرام کر لو۔ ہم لوگ ایک گھنٹے تک آجائیں گے۔“

”کیسے بنے؟“

”بہت خوبصورت۔“

”کام کیسا ہے؟“

”اٹھائیس ہزار کا عروسی لباس بنا ہے محترمہ۔ کام۔“

رما بے تابی سے اٹھ کر اس کی طرف آگئی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ڈبے لے کر بیڈ پر رکھتے ہوئے خود بھی بیٹھ کر وہ کپڑے دیکھنے کو بے چین تھی۔

سیمان نے ڈبوں کے ڈھکنے ہٹاتے ہوئے اسے جگمگ کرتا لباس دکھایا تھا۔

اور کپڑے دیکھتے ہی اپنی شادی یاد آگئی تھی۔

وہ چُپ ہو گئی۔

سیمان نے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔ ”پسند آئے کپڑے؟“

”ہاں!“ روکھا سا جواب اس کے منہ سے نکلا۔

”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“

”گھوٹی ہو کہیں؟“

اس نے اپنی خوبصورت اور کٹا دہ آنکھوں کو پوری طرح کھول کر سیمان کو دیکھا اور بولی۔

”کھوٹی تو برسوں پہلے تھی۔“

سیمان نے ہنس کر اس کا کندھا تھپتھپایا۔ ”کبھی کبھی تمہیں ماضی کا دورہ پڑتا ہے۔“

”ہوں!“ اس نے اپنی حسین آنکھیں بند کر لیں۔

”آنکھیں کھولو بھی رکپڑے دیکھو۔ کتنے خوبصورت ہیں۔“

”خوبصورتی کا احساں پہلی بار ہوا تھا۔“

”اب بھی ہوگا۔“

اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی اور پھر بولی: چلو آج کھانا باہر ہی کھائیں گے۔ ایک گھنٹے تم ریٹ سے سو۔ ٹھیک۔

رمانے سر ہلایا۔ سیمیاں دونوں ڈیسے میز پر رکھ کر پھر سے ریٹ کرنے کا کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

رمانے کے کمرے سے نکلتے ہی بیڈ پر گرنے کے انداز میں پڑ گئی۔ اس نے نرم و گداز نکیے میں مزدورے لیا۔ اس کے نرم و دیشی سیاہ بال بکھر گئے۔ وہ بے حد حسین تھی۔

قدرت کے ہاتھوں کا ترشا ہوا حسین شاہکار تھی۔ بے داغ چہرہ میدے اور سبندور میں نور گھٹی رنگت، حسین سیاہ آنکھیں جن پر لمبی اور گھنی پلکیں جب جھنجکیں اٹھتیں تو قیامت بپا کر دینے کی اہل ہوتیں۔ کوئل سی ناک گلابی گلابی بھرے ہونٹ جن پر عذیبی قطروں کے ٹھہراؤ کا احساس جیگا تار ہوتا۔ ترشہ ہوا جسم نرم و گداز ہاتھ اور گلابی گلابی پاؤں۔ وہ سراپا قیامت تھی۔ میک اپ اور صبح و صبح اس کے حسن کو جہاں سوز بنا دیتے۔ وہ جہاں جاتی جہاں جاتی لوگوں کو مرعوب و متاثر کرتی وہ کون تھی؟

کہاں سے آئی تھی؟

کس خاندان سے اس کا تعلق تھا؟

یہ بات سیمیاں کو معلوم تھی نہ اسے۔

برصوں پہلے بس کا حادثہ ہوا تھا۔

رمانے کیلئے میں چھپا چہرہ ذرا سا اوپر اٹھایا۔ کمرے میں چاروں طرف وحشت زدہ نظروں سے دیکھا بس کے حادثے کا دھماکا اس کے ذہن میں اب تک محفوظ تھا۔ وہ ہامنی میں کھو گئی تھی اور اسے برصوں پہلے کا حادثہ یوں لگ رہا تھا جیسا ہوا ہے۔ اس نے پھر سر کیلئے پر پٹ دیا اور اس کی اک غیر واضح سی شبیہ بہرے لگی۔ اس شبیہ کو اس نے ذہن کے پردے پر پوری طرح دیکھنا

چاہا سوچ کی مدد سے واضح کرنا چاہا۔  
لیکن نہ کر سکی۔

یہ شبیہ یقیناً اس کی ماں کی تھی۔ شفقت اور محبت کا احساس اسے اپنے چاروں طرف پھوار کی طرح پڑتے محسوس ہونے لگا تھا۔

وہ شاید اپنی ماں کے ساتھ بس میں سفر کر رہی تھی کہ بس حادثے کا شکار ہو گئی۔ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ چیخیں بلند ہوئیں۔ اس کے بعد کیا ہوا اسے کچھ یاد نہ تھا کہ وہ سیمیاں کے گھر کب آئی تھی۔ سنا ہی تھا کہ بس میں سیمیاں کی امی بھی سفر کر رہی تھیں۔

وہ کبھی کبھی رما کو بتایا کرتیں: بڑا خوفناک حادثہ ہوا تھا۔ صرف پانچ آدمی بچ پائے تھے۔ سب کے سب مر گئے تھے۔ کچھ لوگ وہیں موت کے منہ میں پلے گئے۔ کچھ ہسپتال جا کر دم توڑ گئے۔

رما پوچھتی: "میں بھی ہسپتال میں تھی؟"

وہ جواب دیتی: "ہاں۔ تمہیں معمولی سی چوڑی آئی تھیں۔ چنانچہ تمہارے ماں باپ مر گئے تھے۔ تم اکیلی اردو پیچ رہی تھیں۔ میں معمولی زخمی ہوئی تھی۔ مرہم بچا کر کے ہسپتال والوں نے مجھے ڈسچارج کر دیا تھا۔ میں ہسپتال سے واپس آنے کے لیے باہر نکلی تو تم نے رو رو کر میری ہانگوں کے گرد اپنے نختے نختے بازو کر دیے۔ میں نے تمہیں پیار کیا۔ تمہاری امی اب تو کا پوچھا۔ تم کچھ نہ بنا سکیں بس روئے گئیں۔ میں جان گئی کہ تمہارا یہاں کوئی نہیں ہے اس لیے گھر آئی؟"

"امی! رما کہتی۔ وہ سیمیاں کی امی کو امی ہی کہتی تھی۔ پالا پوسا جوان

تھا۔ آپ نے میرے گھر والوں کے متعلق پتا چلانے کی کبھی کوشش کی؟"

"ماں بہتری دفعہ۔"

"پھر۔"

"کچھ پتا نہ چل سکا۔"

”یقیناً سب اسی بس میں مر گئے ہوں گے۔“  
”ہو سکتا ہے۔“

سیما کی امی آسے ہمیشہ پیار کرتیں۔ اور وہ ان کے سینے میں منہ چُپا کر ممتا کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کی کوشش کرتی۔ یہ کوشش ہی ہوتی۔ رما کی روح کو کبھی تسکین نہ ملتی۔ بھوک کا احساس جاگ اُٹھتا۔ اسے لگتا وہ مجنم مجنم سے پیار کی بھوک ہے۔ اس کے اندر اک خلا ہے جو کبھی پُر نہیں ہو سکتا۔

خلا اور بھوک کا احساس من میں یہ وہ اسی گھر میں جوانی کی حدود تک جا پہنچی۔ سیما اس سے دو چار سال بڑی تھی۔ عام سی شکل و صورت اور پچھلے متوسط طبقے کی لڑکی تھی۔ شادی بھی اپنے ایسے ہی لوگوں میں ہو گئی۔ سلیم کے مالی حالات دو سال کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ معمولی سا کلرک تھا۔ اور کرائے کے گھر میں اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ سیما سلیم سے تو مطمئن تھی لیکن مالی حالات سے مطمئن نہ تھی۔ اسے اچھے اچھے مہوسات پہننے کا شوق تھا۔ زیورات کی بھی شوقین تھی۔ اچھا سا سجا سجا یا گھر پانے کی بھی تمنا تھی۔

لیکن —

یہ سب کچھ ایک کلرک کی تنخواہ میں کیسے پورا ہو سکتا تھا۔ شادی کے پہلے دو سال تو ٹیٹے جھگڑتے ہی گزر گئے۔ سلیم اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تو وہ الجھ پڑتی۔ وہ پریشان ہو کر پیسے بنانے کے ڈھنگ کیسے کے متعلق سوچنے لگتا۔ کبھی یہ سوچیں وہ اپنے تک ہی محدود رکھتا اور کبھی انہیں سیما پر آشکار کر دیتا۔

انہیں دنوں رما کے لیے ایک رشتہ آیا۔

سیما لڑ جھگڑ کر امی کے گھر آئی تھی۔ انہوں نے اس کے مٹائی جھگڑے کی داستان سُننے خیر

کہا۔ ”رما کے لیے رشتہ آیا ہے۔“

”کہاں سے؟“ وہ جلدی سے بولی۔

”یہیں شہر سے۔ بہت مالدار ہے۔ جائیداد بھی ہے اور کاروبار بھی۔“

”اچھا۔“ سیما تنک کر بولی۔ ”اپنی بیٹی کے لیے تو ایسا رشتہ نہ ڈھونڈا۔“

”اپنی اپنی قسمت ہے بیٹی۔“

”قسمت بھی بنانے سے بنتی ہے۔“

”اس کے سُن پر وہ لوگ معنون ہو گئے ہیں۔ درندہ اتنا مالدار رشتہ ہمارے ایسے گھروں میں

نہیں آتا۔“

سیما کو امی کی تاویل اچھی نہیں لگی۔

”ایک نقص بھی تو ہے نا۔“ امی نے آہستگی سے کہا۔

”کیا؟“ وہ جلدی سے بولی۔

”بڑے کی شکل و صورت واچھی سی ہے۔ اور ذرا سا سنگڑا تا بھی ہے۔“

سیما کو جیسے تسکین ملی۔ بولی ”کروں پھر۔ سوچتی کیا ہیں۔ مال و دولت تو ہے نا۔ عیش

کرے گی۔“

”عیش تو واقعی کرے گی۔ لیکن یہ نقص۔؟“

”تو پھر سلیم ایسا خوبصورت کنگلا ڈھونڈ لیں اس کے لیے بھی۔“ وہ جلدی سے بولی۔ امی

نے سر ہلا دیا۔

رما کی شادی طے پا گئی۔ ان دنوں وہ سولہ سترہ سال کی تھی۔

رمانے ایک بار پھر بستر میں کروٹ بدلی۔ نرم و گلاز ٹیکے سے سر اٹھایا اور پھر بچھڑا دیا۔ اسے

اپنی پہلی شادی یاد آ رہی تھی۔

سیما ہی نے اسے بتایا تھا۔ ”مے رما تیری شادی ہو رہا ہے۔“

”پچھی؟“ وہ ایک دم کھڑکی تھی۔

”ہاں۔“

”کہاں؟“

”یہیں اسی شہر میں؟“

”کس کے ساتھ؟“

”ایک لڑکے کے ساتھ اور کس کے ساتھ“

”وہ مڑا گئی تھی۔ لیکن میں میں پھسل گیا سی چھوٹے لگی تھیں۔“

”بہت امیر کیر ہیں وہ لوگ۔ تیرے تو عیش ہوں گے۔ ڈھیر سارے گہنے ہزارے ہیں۔“

تیرے لیے۔ کپڑے بھی بڑے قیمتی خرید رہے ہیں؟“

”رما کا چہرہ خوشی سے گلزار ہو گیا تھا۔ گہنے کپڑوں کا شوق اسے بھی بہت تھا۔ مگر کا تقاضا بھی یہی تھا۔ دلہن بننے کا ارمان بھی دل میں تھا۔ اس عمر میں سوچیں سمجھ کا دامن تھوڑا ہی پکڑتی ہیں۔ شتر بے مہار ہوتی ہیں جدھر رخ ہوا پھیل گئیں۔“

ہر نو عمر لڑکی کی طرح رمانے بھی بڑے سہلے رنگیں دھین خوب سجایے۔ رشید کیسے لے ہوا۔ کیا شرائط ملے ہوئیں۔ کیسے جہیز بنا اسے کچھ تیار نہ تھا۔ وہ تو دن رات خوابوں کی دنیا میں کھوئی رہتی جہاں اک ان دیکھا شہزادہ چپکے چپکے در آتا۔ ان خوابوں کی رنگینی اور بڑھ جاتی۔ اس شہزادے کی گھمبیر اور بوجھل آواز اس کے اندر ہل چلا جاتی۔

شادی کے دن تو اس کی حالت دیدنی تھی۔ بہکی جا رہی تھی۔ سہیلیاں اسے گھیرے میں لیے بیٹھی تھیں۔ کوئی اس کے خوبصورت ہاتھوں میں لنگھا کر رہی تھی۔ کوئی ہاتھوں پر فرہندی سجا رہی تھی۔ کوئی ڈھولک پیٹ رہی تھی تو کوئی ریلے ریلے پیالین کے گیت گا گا کر اسے چھیڑ رہی تھی۔ بارات آگئی۔ رما کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ چہرہ گلجانی ہو رہا تھا۔ بغیر کسی بچہ دھج کے بھی گلاب کے پھول کی طرح کھل رہا تھا۔

نکاح ہو گیا۔ سچا عروسی جوڑا اور چھوٹے بڑے کئی مٹھی ڈنڈے لیے اندر آئی۔

”لو! اس نے رما کی ایک سہیلی سے کہا: جلدی سے دلہن بنا دو۔ رخصتی کے لیے وہ لوگ

ابھی سے شور مچانے لگے ہیں۔“

”بہت اچھا!“ اس نے سچاں سے ساری چیزیں لے لیں۔

”دیکھو۔“ سچاں نے کہا: ”زیوروں کے کئی سیٹ ہیں۔ شاید چھ ہیں۔“

اسما نے جلدی سے ڈبے گئے۔ ”ہاں“

”سارے تو نہیں پہن سکے گی۔“

”کیوں نہیں؟“

”صرف کانوں میں ایک ہی سیٹ کے بندے پہنے گی۔ باقی سب چیزیں اسے پہنا دیں گے۔“

”اچھا بھئی۔ جو زیور نہ پہنا سکے سنبھال کر ڈبوں ہی میں رکھنا اب یہ ساری تمہاری ذمہ

داری ہے سمجھیں۔“

”بالکل ٹھیک۔“ اس نے کہا۔ سچاں باہر چلی گئی۔ مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف تھی

وہ سہیلیاں عروسی لباس اور زیورات دیکھنے کو بے تاب تھیں۔

اسما نے عروسی جوڑا نکالا۔

یہ قرمزی رنگ کے ٹیشو کا تھا۔ دوپٹہ بھی ویسا ہی تھا۔ اور خوب بھاری کام اس پر

ہوا تھا۔ زیورات کے سیٹ بھی جڑاؤ اور بھاری تھے۔ لڑکیاں بڑے رشک سے رما کو نکتے لگیں۔

پھر—

سب نے مل کر اسے دلہن بنایا۔ قرمزی ٹیشو کے بھاری کام والے عروسی لباس اور

زیورات نے اس کے حسن کو چار چاند لگا دیے۔ جس نے اسے دیکھا عش عش کر اٹھا۔ وہ خوشبوؤں

میں بسی زیور دے لے لگی جگ لگ کر تے لباس میں بھی پیگھر آگئی۔

خواب حقیقت کا پرتو، تو ہوتے ہیں۔

لیکن حقیقت نہیں ہوتے۔

حقیقت کے پرتو اور حقیقت میں جو فرق ہوتا ہے۔ وہ بسا اوقات بڑی سنجیدگی سے



زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور اس کی جڑیں ہلا دیتا ہے۔  
رما کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

اس کے خوابوں کا شہزادہ جب حقیقت کے روپ میں اس کے سامنے آیا تو وہ ویسا نہیں تھا۔ رما کے خوابوں کو اک دھچکا لگا۔ دوسرا دھچکا راشد کی ٹنگڑی ٹانگ نے لگایا۔  
لیکن —

یہ دھچکے عارضی تھے۔ ایسے نہ تھے کہ سینوں کی خوبصورت عمارت ان دھچکوں سے دم سے آن گرتی۔ کم عمری کی دہر سے رمانے یہ سب باتیں بری طرح محسوس تو کیں۔ لیکن ان سے بڑا کڑا ہونے کا بھی سوچا۔ راشد نے محبتوں اور چاہتوں کی چھوڑ برساتی نوہ اس کی وجودی خامیوں کو بھول کر میراب ہونے لگی۔ چند ماہ بہت اچھے گزرے۔  
پھر۔

ہذبات میں ٹھہراؤ آنے لگا۔ زندگی کی اور سچائیاں بھی آنے لگیں۔

وہ اک بھر سے پڑے کنبے میں بیا ہی گئی تھی۔ ساس سسر نندیں جھٹائیاں سسیمی اس جویلی نا گھر میں رہتے تھے۔ ساس بہو بیٹے کا پیار دیکھ کر جلتے لگیں۔ نندوں اور جھٹائیاں کو خشن ہو کر با نئے حسد پیدا ہوا۔ باتیں جھین بٹنے لگیں۔ رما کو ہر کسی نے اپنے تیر کا بدف بنایا۔ وہ پریشان ہو گئی۔  
راشد سے شکایت کرتی کرتی تو وہ درگزر کرنے کی بات کرتا۔

”اس گھر میں رہنا ہے رما۔ تو سب کی عزت کرنا ہوگی۔ تم چھوٹی ہو وہ بڑے اگر کٹا بات کر بھی دیں تو برا نہ منایا کرو۔“

وہ پہلے پہلے تو لامنت سے اسے سمجھا دیتا۔ لیکن جب رما اپنی نا سبھی اور نا عاقبت اندیشی کی بنا پر اس کے سامنے ہی اس کی ماں بہنوں اور بھائیوں کو برا سمجھا کہتے ہوئے ان کی شکایتیں اس سے کرنے لگی تو وہ جھنجھلا گیا۔

اکثر اس کی بات ان سنی کر دیتا۔

کبھی جھڑک دیتا۔

کبھی غصے سے بڑا بھلا کہہ دیتا۔

رما کی حالت عجیب سی تھی۔ گھماؤ میں آئے ہوئے لٹو کی طرح تھی۔ کچھ سمجھ نہ پاتی تھی کہ کہاں رُکے۔

حالات نے نفی ہی کا رخ اختیار کیا۔ تو ایک دن روتی دھوتی دہ امی کے پاس آگئی۔  
امی تو سیمان ہی کی دہر سے پریشان تھیں رما کا کیا کہتیں۔ سمجھانا بھجانا ہی تھا۔ رما کو واپس نیچھ دیا۔

کھینچنا تانی جاری رہی۔

یہ بات سیمان تک بھی پہنچی۔ اس نے رما کو اپنے ہاں بلا بھیجا۔ اس کی کہانی سنی۔ اسے سمجھانے کے بجائے اور مہتر کایا۔

”اس ٹنگڑے کی یہ بجاں شکل نہیں دیکھتا اپنے“ وہ غصے سے بولی۔ ”سمجھنا کیلئے اپنے آپ کو۔ غریب گھرانے کی لڑکی سمجھ کر یہ سلوک کر رہا ہے۔ دیکھو میں گے ہم بھی۔ گرم سے پڑے نہیں“ سلیم نے بھی رما کو شرمادی۔ راشد کو بڑا بھلا کہا۔ ”دب کر نہیں رہنا رما! وہ لوگ خود ہی جھکیں گے۔“

رما اس دفعہ خوب شیر ہو کر گھر لوٹی۔

لڑائی جھگڑے جو پہلے معمولی نوعیت کے تھے۔ اب رما کے باغیانہ اور خود سرانہ رویے سے سنجیدہ ہونے لگے۔

رمانے اب امی کے گھر جا کر ڈکھ ڈکھ کی باتیں کرنا چھوڑ دیا۔ جب بھی جھگڑا ہوتا سیدھی سیمان کے ہاں جاتی۔ حال دل کہتی اور روتی دھوتی۔ اور آئندہ کے لیے ہدایت کے کسوا پس چلی جاتی حالات سدھرنے کے بجائے بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ گھر والوں کا رویہ بھی جارحانہ ہوتا جارہا تھا۔ سب اس کے حسن سے جلتے تھے غریب گھرانے کی لڑکی کو اس گھر میں نہ دیکھ سکتے

سیماں اور سلیم نے مل کر ترکیب سوچ لی۔ اس ترکیب سے رما کو بھی آگاہ کیا۔ وہ کون سی جہان نیدہ تھی۔ جذباتی سی لڑکی تھی۔ کچھ سوچا نہ سمجھا۔ ہامی بھرنی اور واپس گھر چلی آئی۔ سلیم اور سیماں کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے اس نے اپنے ارادے میں تبدیلی پیدا کی۔ ساس سسر، نندوں اور چٹھانینوں سے خوش خلقی سے پیش آئی۔ بڑھ بڑھ کر کام کیے۔ راشد سے بھی معافی مانگی۔ گھر کی فضا قدرے خوشگوار ہو گئی۔

دوسرے ہفتے سیماں اس کے ہاں آئی۔ اس کی ساس نندوں سے بڑے تپاک سے علی حوالہ احوال محبت سے پوچھا۔ رما کو بھی گلے سے لگا کر خوب پیار کیا۔

”یکے آنا ہوا؟“ رما کی ساس سے یونہی پوچھا۔

”میری نند نے اپنے بیٹے کی سالگرہ کی ہے۔ اس نے رما کو بھی بلا یا ہے۔ آپ سے کہنے آئی ہوں۔ رما کو اس کے ہاں جانے کی اجازت دے دیجیے گا۔“

ساس پیار سے بولی: ”لو ہم نے اس پر کبھی کوئی پابندی لگائی ہے۔ خوشی سے جائے؟“

”بہت بہت شکریہ۔“ وہ کچھ کچھ گئی۔ ”میں خود اسی لیے کہنے آئی تھی۔ کہ آپ سے اجازت لے لوں۔“

”ایسی کیا بات ہے۔ رما پر ایسی ویسی کوئی پابندی نہیں۔“ نند نے کہا۔

”پھر بھی اجازت لینا اچھا ہی ہے نا؟“ وہ انکساری سے بولی۔

”تمہاری سعادت مندی ہے بیٹی۔“ ساس نے سیماں سے کہا۔

سیماں تھوڑی دیر وہاں رہی۔ سب کے دل موہ لیے۔ مروت، خوش خلقی اور سعادت مندی کا مظاہرہ کیا۔ سب نے بڑے خوشگوار ماحول میں چائے پی۔

جانتے وقت اس نے رما سے سب کے سامنے کہا: ”میرے سسرال کا معاملہ ہے اچھے سے کپڑے پہن کر آنا۔ زیور بھی پہنا ذرا عجب پڑے گا سب پر، سمجھیں؟“

رما مسکرا کر بولی: ”سمجھ گئی۔“

تھے طعن و تشنیع سے کام لیا جاتا تھا۔ رما کو بہن بہنوئی بھڑکانے تھے۔ راشد کو سارے گھر والے۔ یوں میاں بیوی کے درمیان تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ رما نے اب خود بھی راشد کو لنگڑا اور بڑبڑکا کہنا شروع کر دیا تھا۔

اس دن بھی لڑائی ہوئی۔ رما سیدھی سیماں کے پاس چلی آئی۔ رو کر روٹی یاد سنائی۔

”ان لوگوں کے تیور ٹھیک نہیں لگتے؟ سیماں نے سلیم سے کہا۔“

”واقعی۔“

”مجھے تو لگتا ہے۔ اسے گھر سے نکال کر ہی رہیں گے۔“

”ہاں سیماں۔“ رما نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ ”اب تو وہ لنگڑا بھی بات بات پہ گھر سے نکالنے کی دھمکی دے رہا ہے۔“

”تو پھر؟“

”کیا کروں میں؟“

”اپنا مستقبل سوچو۔“

”کیا سوچوں؟“

رما کی بات کا جواب اس وقت تو سیماں نے نہیں دیا۔ لیکن شام جب وہ سلیم کے لیے

چائے بنا رہی تھی۔ اس نے سلیم سے کہا۔

”رما کو چاہیے اپنے ہاتھ مضبوط رکھے۔“

”یہی میں کہنے والا تھا۔“

”کافی زیور ہے اس کے پاس۔“

”لیکن وہ اسے دیں گے تھوڑا ہی؟“

”یہی تو ہم نے سوچنا ہے کہ وہ زیور کیسے ان سے لے لے۔“

”ہوں۔“

رما کے دھم دگمان میں بھی نہیں تھا۔ کہ یہ دونوں اس سے اس طرح دشمنی کر رہے ہیں۔ وہ دوست دشمن کی تمیز نہ کر سکی۔ بات بڑھی۔ گھر والے زیور مانگتے رہے یہاں نے زیور نہ دیا۔

اور۔

نوبت طلاق تک پہنچی۔

طلاق ہو گئی۔ رما بوکھلا گئی۔ رو رو کر مڑا حال کر لیا۔ وہ راشد سے بچھڑ گئی تھی۔

راشد سے۔

جواں کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ جس نے اُسے پیار و محبت کے معنوں سے آشنا کیا تھا اور جو اپنی وجودی خامیوں کے باوجود اُسے اچھا لگتا تھا۔ جو اس کا اپنا تھا لڑائی جھگڑوں کے باوجود جو اُسے تحفظ کا احساس دلاتا تھا۔

لیکن۔

یہاں اور سلیم بڑے گھاگ تھے۔ نفرتوں کا غبار انہوں نے جس مقصد کے تحت پھیلا یا تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ انھوں نے تو لمبا چوڑا پلان بنالیا تھا۔ رما پیر بنانے کی شین بن سکتی تھی۔ وہ رما کو اپنے ہاں لے آئے تھے اور اس پر محبتوں، عنایتوں اور نوازشوں کی بارشیں برسا رہے تھے۔ تسلی پیار اور محبت سے اس سانچے کو بھول جانے کی تلقین کرتے تھے۔

رما بستر سے اٹھ بیٹھی۔ اپنے خوبصورت ہاتھوں کو مسٹے ہوئے اس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر دیوار پر لگے کاک پر نگاہ ڈالی سلیم اور یہاں کو گئے گھنٹہ بھر ہو گیا تھا۔ وہ اب لوٹنے ہی والے تھے۔ وہ نبیل کے ہاں حق جہر، زیورات اور دوسری ضروری باتوں کا فیصلہ کرنے گئے تھے۔ نبیل بہت امیر کیر آدمی تھا پہلی بیوی مرچکی تھی۔ دو سالہ معصوم سی بچی کا باپ تھا۔ اس بچی ہی کی خاطر وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔

کل نبیل کی دوسری اور رما کی تیسری شادی تھی۔

رما نے اک انگڑائی لی اور بستر سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی۔ برش اٹھا

دوسرے دن وہ خوب بن سنور کر یہاں کے ہاں جانے کے لیے تیار تھی۔ ساکس نے سیف کھول دی۔

”مے لوجو کچھ پہنا ہے۔ یہاں کی سسرال جانا ہے۔ ٹھیک ہی کہتی تھی وہ زیور ایسے موقعوں پر ہی تو پہنا جاتا ہے“

اس نے دوسٹ گئے میں ڈلے اور باقی ڈبوں سے چپکے سے زیور نکال کر بٹوے میں ڈال لیا۔ ہاتھوں میں جتنی انگوٹھیاں آسکتیں تھیں ڈال لیں۔ جڑاؤ کرے اور درجن بھر چوڑیاں بھی پہن لیں۔

”تقریب تو ایک پہنا تھی۔ یہاں کے گھر سے جب وہ واپس لوٹی تو زیور اس کے بدن پر نہیں تھا۔ ساکس کی نظر اس پر پڑی چھوٹے ہی پوچھا۔

”گلو بند اور ہار جو پہن کر گئی تھیں وہ؟“

”یہاں کے ہی گھر رکھ آئی ہوں۔“

”کیوں؟“

”شام اُترنے لگی تھی۔ اس نے کہا اتنا زیور پہن کر نہ جاؤ“

”تمہیں تو سلیم چھوڑنے آیا تھا۔“

”ہاں۔“

”پھر زیور وہاں رکھنے کی کیا ننگ تھی؟“

وہ جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پھر بھی زیور اتنے بڑے جھگڑے کا سبب بنا کر گھر والوں نے رما کو دھکے دے کر نکالا۔

”زیور واپس لے کر آؤ۔“

زیور اب سلیم اور یہاں کے قبضے میں تھا۔ ہاتھ آئی چمیز کیسے واپس دے دیتے۔ دھوکا

بازی پر اُتر آئے تھے اس لیے رما کو وہ بھڑکانے لگے۔

کمرہوں میں پھیرتے ہوئے اس نے آئینے میں اپنا آپ دیکھا۔  
اپنا آپ۔

جو اس کے ظاہری خوبصورت پسکے کے اندر چھپا ہوا تھا۔

”رما کیا کرتی پھرتی ہو کبھی سوچا بھی ہے۔“ اس وجود سے آواز نکلی۔

رما بے چین ہو گئی۔ سر کو ہلکا سا جھکا دیا اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اس اندرونی اکواڑ سے چھپا چھڑانے کے لیے اس نے ٹیپ ریکارڈ آن کر دیا۔ کوئی جوشیلی سی دھن زور و شور سے بجنے لگی۔

”رما!“ سیماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے آواز دی۔ سلیم بھی اس کے ساتھ تھا۔

رمانے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ سیماں نے بٹے جوشیلے انداز میں رما کو بازوؤں میں بھر لیا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولی۔ ”مبارک ہو۔“

”کس بات کی؟“ وہ بولی۔

سلیم خوشی سے ہنسنے ہوئے بولا۔ ”نبیل نے ساری باتیں مان لیں۔“

”یعنی؟“ رما بولی۔

”بھئی دو لاکھ نقد اس نے تمہارے اکاؤنٹ میں حق ہر کی رقم کا جمع کروا دیا ہے۔“ سیماں

اسے چھوڑ کر بستر پر دم سے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”سارے تین لاکھ کا زیور ہے۔“ سلیم کی باپھیں کھلی جارہی تھیں۔ وہ بھی تمہارے ٹاکھے گا۔“

”بڑا سادہ سا آدمی ہے۔“ سیماں بولی۔ ”اُسے آسانی سے ٹٹا جاسکتا ہے۔“

”بیچارہ۔“ سلیم ہنسا۔

”بس اُسے تو بچی کی فکر ہے۔ کہتا ہے رما بچی کو سنبھال لے ماں کا پیار دے دے۔“

اُسے بس یہی چاہیے۔ سیماں ہنس کر بولی۔ ”بچی کے لیے وہ سب کچھ کہنے کو تیار ہے۔ ساری

دولت تمہارے قدموں میں ڈال دے گا۔“

رما کچھ نہیں بولی۔ سلیم بھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

سیماں بولی۔ ”اس دفعہ ہمیں پروگرام تبدیل کرنا پڑے گا۔“

”یعنی؟“ سلیم نے پوچھا۔

”رما کو دولت بطور نئے کے لیے دو تین ماہ نیبیل کے ساتھ رہنا ہوگا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ سلیم بولا۔ ”موٹی آسانی ہے۔ کیوں رما۔؟“

رمانے دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی اندر کی بے چینی سے دو چار تھی۔ آنکھوں میں اندر کی تھی۔ ہمیشہ کی طرح آج وہ اپنی شادی کی باتوں میں جوش و خروش سے جھگڑ رہی تھی۔ کیا بات ہے؟ ”سیماں نے اس کے وجود کے اندر پہلی بے چینی کو شدید محسوس کر لیا۔“

”پریشان کیوں ہو۔؟“

”کچھ نہیں۔“ رمانے کہا۔

”تیار ہو کھانا کھانے چلتے ہیں۔“ سیماں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ پھر سلیم سے بولی۔ ”اسے باہر

گھمانے لے چلتے ہیں۔ اس کی طبیعت کچھ بوجھل سی ہے۔“

”پہلے جناب بندہ حاضر ہے۔“ سلیم گاڑی کی چابی انگلی کے گرو گھماتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

تیلیوں باہر نکل گئے۔

رما ماضی کی گرفت میں آتی ہوئی تھی۔ کوشش کے باوجود اس سے چھٹکارا نہ پاسکی۔ وہ سیماں

کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ سلیم گاڑی چلا رہا تھا۔ گنگنا رہا تھا۔ سیماں رما سے باتیں کر رہی

تھی۔ اُسے نیبیل کے ساتھ کس طرح رہنا تھا کیا کچھ کرنا تھا۔ سمجھانے کے انداز میں بتا رہی تھی۔

یا نہیں یہ اُسے پتا نہیں تھا۔

رما کچھ نہیں سُن رہی تھی۔ اس کے سامنے تو ماضی کے پرت اُلٹے جا رہے تھے۔ وہ کیا تھی

اور کیا بن گئی تھی۔ ہر پرت پر اس کی زندگی کے پرتوں کو لہڑا رہے تھے۔

انور سے دو سری شادی سیماں ہی نے کر دلی تھی۔ تیسرے چھپے ہی حالات اس طرح الجھ

گئے تھے کہ طلاق کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

”طلاق دے دو“ سیماں اور سلیم کا مطالبہ تھا۔ انور ڈیڑھ لاکھ کا زیور اور نقدی رما کو دے چکا تھا۔ آسانی سے طلاق پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ لیکن سیماں اور سلیم نے ایسا چکر چلایا کہ اسے طلاق دیتے ہی بی۔

یوں انہوں نے لاکھوں روپے ہتھیائے تھے۔ واردات کے بعد وہ شہر بدل لیتے۔ نئی جگہ جاکر کرائے پر کونٹری لیتے۔ گاڑی بدلتے شرفا کی طرح دہنا شروع کر دیتے۔ سلیم تلاش میں رہتا۔ دونوں رما کو ہوٹلوں، کلبوں میں لیے پھرتے۔ آسانی تلاش کی جاتی۔ لوٹا جاتا اور ٹھکانہ اسی دن بدل لیا جاتا۔

”رما۔ رما۔“ سلیم نے میز کی دوسری طرف بیٹھی رما کو پکارا۔ جو خیالوں میں گم تھی۔ رستوران میں میزوں کے گرد بیٹھے۔ کھاتے پیتے ہنستے مسکاتے لوگوں سے بے خبر تھی۔ سیماں نے سب کی من پسند ڈشیں آڈر کی تھیں۔ وہ ہال میں بیٹھے لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ رما کی گھبراہٹ کو اس نے نظر انداز کر رکھا تھا سلیم سے نہ رہا گیا۔

”رما!“ اس نے پھر پکارا۔

”بھئی کیا بات ہے۔ آج چہک نہیں رہی۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“

”اسے کوئی دورہ پڑا ہوا ہے۔“ سیماں نے قدرے تلخی سے کہا۔ ”شام سے اسی طرح گم مہم ہے؟“

”یہی کوئی بات نہیں سیماں!“

”پھر چپ چپ کیوں ہو۔ کوئی نئی بات نہیں۔“

”ہاں۔ نئی بات نہیں۔ تیسری بار۔“ نئی نہیں ہوتی؟ کھانا آگیا تھا۔ سیماں رما سے کچھ کہہ

نہیں سکی۔

تینوں کھانا کھانے لگے۔ رما کیے چینی ختم نہیں ہوئی۔ ہاں سلیم کی دلچسپ باتوں سے کچھ دور ضرور ہو گئی۔

”اس بار ہم باہر جائیں گے۔“ سلیم نے رما سے کہا۔ ”یورپ کا ٹور گائیں گے۔“

”کیوں مال بہت جمع ہو گیا ہے کیا؟“ سیماں نے مسکرا کر ہلے سے کہا۔

”وہ رازداری سے سنیں کہ بولا۔“ باہر بھی بزنس کریں گے۔ سارا خرچہ نکل آئے گا۔“

پھر رما سے بولا۔ ”ٹھیک ہے نارما۔“

اس نے یونہی سر ہلادیا۔

رات گئے ٹمک سلیم اور سیماں رما کو سمجھاتے رہے۔ نیل سے دولت بنورنے کے گڑ

سکھاتے سمجھاتے رہے۔

اگلی شام رما نے دلہن بن کر قیامت کا روپ دھارا تھا۔

فائیو اسٹار ہوٹل کا ہال روشنیوں اور رنگین جھنڈیوں سے سجا ہوا تھا۔ جگہ جگہ پھولوں کے ہار اور گلدرے سجے تھے۔ فضا میں ہلکی ہلکی مسورکن موسیقی کا رس گھل رہا تھا کچھ نشستوں پر لوگ بیٹھے تھے۔ کچھ کھڑے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ قہقہے لگ رہے تھے۔ عورتیں اپنے زیوروں اور لباس کی نمائش میں پیش پیش تھیں۔ ایک دوسری سے زیادہ سمارٹ اور خوبصورت نظر آتے۔ ان تمام تھا۔ محفل بھی شاندار تھی۔

رما خوبصورت عروسی جوڑے میں ادیش قیمت زیورات سے لدی پھنڈی نیل کے پہلو میں بیٹھی تھی۔ لوگ اس کے حسن سے مرعوب و متاثر تھے۔ تعریفیں ہو رہی تھیں۔ نیل کو اس کے انتخاب پر داد دی جا رہی تھی۔ جسے وہ بڑی انکساری اور خلوص سے سر جھکا جھکا کر سادہ ہاتھ ماتھے تک لے جائے جاکر قبول کر رہا تھا۔ وہ خود بھی خاصا ہینڈسوم اور اسمارٹ آدمی تھا۔ بتیس کے لگ بھگ عمر تھی مالی خوش حالی کا عکس اس کے چہرے پر تھا۔ خود اعتمادی اور وقار کا نمونہ تھا۔ اس وقت اس کا شمار شہر کے متمول بزنس مین میں ہوتا تھا۔

سیماں اور سلیم بہت خوش تھے۔ خوب چہک رہے تھے۔ اس وقت وہ رما کے بھائی اور بھابی بنے ہوئے تھے۔ نیل کے رشتہ داروں سے وہ اسی رشتہ سے متعارف ہو رہے تھے۔ رما

کے متعلق انہوں نے یہاں بھی کہانی گھڑی تھی۔

”سولہ سال کی تھی جب شادی ہوگئی سسرال والوں نے ٹکے ہی نہ دیا۔ اتنے ظلم توڑے کہ بیان نہیں کیے جاسکتے۔ تیسرے مہینے ہی طلاق ہوگئی۔ اتنی معصوم اور معصیٰ سمجائی ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تین سال اس نے جس طرح گزارے ہیں ہم سے پوچھیے۔ شادی کے لیے سینگٹروں پیغام آئے تھے۔ لیکن یہ اتنا ڈر گئی کہ شادی کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ یہ تو نبیل کی خوش بختی ہے یہ جو ماں گئی۔“

لوگ رما کے حوصلے اور صبر کی داد دیتے ہوئے نبیل کی خوش نصیبی کی باتیں کر رہے تھے۔ نبیل واقعی خوش تھا۔

کھانے کے بعد موسیقی کا پروگرام تھا۔ جو رات ایک بجے تک جاری رہنا تھا۔ لیکن مہمانوں کو شاید رجم آگیا۔ نبیل کے ایک دوست نے سنس کر کہا: ”بھئی تم دونوں تو جاؤ اپنے گھر۔ یہ محفل جمی رہے گی۔ سمجائی کی طرف سے مسٹر سلیم اور مسز سلیم ہیں۔ تمہاری طرف سے ہم ہیں۔“ نبیل مسکرا کر بولا: ”کوئی بات نہیں۔ سب دوست جمع ہیں۔ ایسے موقعے روز روز تو نہیں آتے۔“

”سمجائی سے پوچھ لو، دوسرے دوست نے چھیڑا۔“

رحمن نے شرما جانے کی ایسی لاجواب اداکاری کی کہ سامنے کھڑی سیماں قربان ہو ہو گئی۔ رات دو بجے کے قریب نبیل رما کو اپنی شاندار گاڑی میں اپنے پہلو میں بٹھا کر اپنے گھر آگیا۔ نبیل کی کوٹھی شہر کے خوبصورت ترین علاقے میں تھی۔ کوٹھی کی شاندار عمارت کئی ایکٹر رقبے میں گھری تھی۔ خوبصورت اور نفاست سے لگنے لگے چمنوں میں گھری ہوئی تھی۔

بات صرف خوبصورتی امارت اور نفاست سے آراستگی کی ہوتی تو شاید ماس قدر مغرب و متاثر نہ ہوتی۔ لیکن اسے تو اس کمرے میں آتے ہی یوں لگا تھا جیسے کسی فردوسی رعنائیوں سے منور گوشے میں آگئی ہو۔

جیسے مضبوط چار دیواری کے اندر محفوظ ہوگئی ہو۔

جیسے امن سکون اور شفقتوں کے سایوں میں پٹ گئی ہو۔

جیسے۔

جیسے۔

ماں کے ممتا بھرے سینے میں سما گئی ہو۔

اس کی زندگی بھر کی بھوک اس کمرے میں آتے ہی جانے کیسے مٹ گئی اور وہ خلا جو نہایت

کی شفقت سے مبرا تھا۔ کسی شوہر کی محبت سے اس بیڈروم میں آتے ہی بھر گیا۔

نبیل کے اندر آنے سے پہلے ہی وہ مطمئن اور شاد تھی۔

نبیل آیا۔ گھونگٹ تو تھا نہیں۔ پھر بھی رمانے سر جھکا رکھا تھا۔ نبیل نے بڑی آہستگی

سے اس کا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھا لیا۔ اور اس کی حسین شرکیں آنکھوں

میں آنکھیں ڈالتے ہوئے مستحکم آواز میں بولا۔

”رما۔ ہم ایک نئی زندگی کی ابتدا کر رہے ہیں۔ میں یہ ابتدا خلوص اور اعتماد کی بنیادوں پر

کرنا چاہتا ہوں۔ کہ یہی ایک کامیاب زندگی کی اساس ہیں۔ بولو میرا ساتھ دو گی۔“

الفاظ رما کے کانوں میں اترے اور رُوح کی گہرائیوں میں اتر گئے۔ وہ سرتاپا کانپ گئی۔

اپنے ساتھ کر دار اور استندہ بلان کی روشنی میں اپنے آپ کو دیکھا۔ نبیل کے خلوص اور اعتماد کو

محسوس کیا۔ گھبرا کر اس نے اپنا چہرہ نبیل کے ہاتھوں سے چھو کر گھٹنوں پر رکھ لیا۔

نبیل نے اسے رما کی حیا اور ادائے دہر بانی جانا۔ محفوظ سمی ہوا اور اس پر ٹوٹ کر پیار

بھی آگیا۔ لیکن اپنے جذبات پر قابو رکھا۔

”رما!“ اس نے گہیر آواز میں بیڈ کے سرے پر بیٹھے بیٹھے جھکی ہوئی رما کو پکارا۔ وہ ویسے

بھی بیٹھی رہی۔ اس کے من میں کتنی ہل چل تھی۔ کیسا طوفان تھا۔ کیا اتار چڑھاؤ تھے۔ نبیل نہ جان بلیا

”رما!“ اس نے پھر پکارا۔

”جی!“ وہ اسی انداز میں گھٹنوں پر سر رکھے مرلیں سی آواز میں بولی۔

وہ دکھاؤ مجھے۔ اے چلو اس کے پاس۔

وہ بہتر سے اترنے لگی۔ نبیل نے اسے علامت سے روکے۔ ہوئے کہا: ”وہ سو رہا ہے صبح مل لینا“ لیکن رمانے اسے اسی وقت دیکھنے کی فہم کی۔ وہ بیڈ سے اتر آئی۔  
”چلیے۔“ اس نے نبیل سے کہا۔

نبیل نے بڑے پیار سے اسے دیکھا اور پھر بازو بٹھا کر اس کے وجود کو سمیٹ لیا۔ چند لمحوں بعد وہ معصومہ کے کمرے میں تھے۔  
وہ بے خبری کے عالم میں پڑی سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اتنی معصومیت اور پاکیزگی تھی کہ رمانے چھوٹے ہونے لگے۔

”بڑی گہری نیند ہے اس کی جاگے گی نہیں۔“ نبیل نے پیار سے رما کو دیکھا وہ سمجھا شاید رما اس کے بیدار ہو جانے کے خوف سے اسے چھو نہیں رہی۔  
رما کو اس باختم سی کھڑی اسے نکلے گئی۔  
نبیل جھکا اور بستر سے بچی کو اٹھایا۔

”یہ تمام لو اسے۔ یہ میری امانت ہے رما۔“ اس نے بچی کو رما کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے کہا  
”شاید تمہیں اچھا نہیں لگ رہا۔ اس رات کی ابتدا ہم دقت دار یوں سے کر رہے ہیں۔ لیکن رما میں نے کہنا مجھے اس بچی کے لیے ایک ماں کی ضرورت ہے۔ اسے ماں کا پیار و لگاؤ۔ اسے ماں بن کر پا لگوں گا۔ اس کے کردار کو مضبوط اور اخلاق کو قابلِ رشک بناؤں گا۔ اسے اک نیک سیرت اور پاکیزہ“  
رما تھر تھر کانپ رہی تھی۔ بچی کا بوجھ اس سے سنبھالا گیا۔ نبیل نے جلدی سے بڑھ کر بچی اس کے ہاتھوں سے لے کر بیڈ پر ڈالی۔ اور لہراتی ہوئی رما کو وجود باز دؤں میں بھری۔

رما بے جان سی ہو رہی تھی، جسم ڈھیل پڑ رہا تھا اور نیم بے ہوشی کی کیفیت تھی۔ نبیل گھبرا گیا۔ رما کو دونوں ہاتھوں پر اٹھایا اور اپنے بیڈ روم میں لا کر بستر پر ڈال دیا۔  
”رما۔ رما۔“ وہ اس کا کندھا ہلاتے ہوئے پکار رہا تھا۔ نام بھی تھا متاسف بھی کہ سہانگ

”میرے حالات سے تمہیں آگاہی ہے نا۔ وہ چپ رہی۔“ میری ایک بچی ہے۔“ وہ اب بھی نہیں بولی۔

نبیل چونکے چپ رہا۔ پھر اس نے رما کا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی ٹھوڑی کو اپنے ہاتھ کا سہارا دیتے ہوئے اس کا چہرہ اُونچا کیا۔

”رما! میں نے شادی کی ہے۔ بیشک یہ میری ضرورت تھی لیکن یقین مانو مجھے اپنے لیے بڑی سے زیادہ اپنی بچی کے لیے ماں کی ضرورت تھی۔“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

رمانے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اتنی پاکیزگی اور اتنا تقدس تھا کہ رما کو اپنا سارا وجود انتہائی گھناؤنا لگا۔ وہ بے طرح گھبرا گئی۔

ایک بار پھر اس نے اپنا چہرہ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اور گھٹنوں پر سجدہ کیا۔ نبیل اس کی ذہنی دماغی اور دلی کیفیات سے بے خبر تھا۔ وہ بچی کے متعلق اسے بتانے لگا۔ بچی سے اسے بے حد پیار تھا۔ وہ اس کے لیے بہت کچھ کر سکتا تھا۔ اس کے پاس بے انتہا دولت تھی۔ ”میتا اگر خریدی جانے والی پسینہ ہوتی تو میں معصومہ کے لیے کب کا خرید چکا ہوتا۔“ وہ بٹسے ٹھہرے ہوئے پیچے میں بولا۔

رما سنتی رہی۔

”میں نہیں چاہتا کہ میری بچی کی زندگی میں کوئی خلل رہ جائے۔ یہ خلا ماں کی محبت کا خلا ہے۔ کیا تم یہ خلا بھر سکو گی؟“ اس نے بٹسے عاجزانہ پیچے میں کہا۔

”ہو لو رما۔ جواب دو۔ یہ خلا بھرنے کی کوشش کرنے کی ہامی تو بھر سکتی ہو۔ بھر سکو گی۔“  
”ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔“ وہ ایک دم جیسے پھینچ اُٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تمام لیا تھا۔ آنکھیں بند کر لی تھیں اور مراد مراد مارتے ہوئے ہاں ہاں کہہ رہی تھی۔

”رما!“ نبیل کچھ پریشان سا ہو گیا۔

رمانے جلدی سے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ پھر بڑے جذباتی پیچے میں بولی۔ ”یہ خلا میرے اندر بھی ہے نبیل میرے اندر بھی۔ میں اس خلا میں اس بچی کو بھر لوں گی۔ چلو مجھے اس بچی سے

رات رما سے عشق و محبت کے فاصلے بھلا گئے کے بجائے اپنی غرض کی کتھا سنانے لگا۔

کئی لمحوں بعد رمانے آنکھیں کھول دیں۔ ارد گرد دیکھا۔ ماحول سے شوگر ہوئی۔ نیل کی چوہا پڑا۔

”کیا ہوا تھا رما؟“ نیل نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

وہ اٹھ بیٹھی۔ وہ سخت پریشان تھی۔

اس کی پریشانی سے نیل اور پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا تھا؟ معاف کرنا میں نے تمہیں بے جا باتوں میں۔“ وہ ناسف سمیرے لہجے میں بولا۔

رمانے نفی میں سر ہلایا اس کی خوبصورت آنکھوں میں سادوں کے گھنے بادل لہلہ رہے تھے۔

”مجھے۔ اپنی سچی کے متعلق آج رات تم سے۔ ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تمہیں معذرت خواہ

ہوں کہ تمہیں؟“

”نیل۔ نیل۔“ وہ بے اختیار روتے ہوئے کہہ اٹھی۔

”پلیز رما۔ معاف کر دو۔“ وہ بے طرح گھبرا گیا۔

رما بے بسی سے روتے گئی۔ سادوں بھا دوں کی جھڑباں لگ گئیں۔ روتے روتے وہ مدعاں ہو گئی۔

نیل کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ کیا کرے۔ ہر مہر کر یہی مذمت محسوس ہو رہی تھی کہ آج کی رات اسے رما

سے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیے تھیں۔

”رما۔ میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے معصومہ کے لیے تمہیں یوں مجبور نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم معصومہ

کو یقیناً ماں بن کر۔“

”میں اس قابل نہیں ہوں نیل۔ اس قابل نہیں ہوں۔“ وہ بڑے جذباتی اور بے اختیار

انداز میں چیخ اٹھی۔

”مجھ پر اعتماد نہیں کرو۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھتے ہو۔ میں نیک

اور پارسانہ نہیں ہوں۔ مخلص اور۔“

”رما۔“ اب نیل کی گھبراہٹ اور نوعیت کی تھی۔ اس نے رما کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے

ہوئے بے تاب سے کہا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

”میں۔ میں بہت بُری ہوں نیل۔ بہت بُری ہوں۔ مجھ پر اعتماد نہیں کرو۔ مجھ پر اعتماد نہیں کرو۔“

اپنی پاکیزہ اور معصوم ہٹی کے لیے مجھ پر تکیہ نہ کرو۔ میں کسی قابل نہیں ہوں۔“

وہ پیٹھ پیٹاتے جذبات کی شوریدہ سر موجوں سے ٹکراتے ہوئے بے اختیار نہ کہے جا رہی تھی۔

نیل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ موقع کی نزاکت کو کیسے سنبھالے۔ رما کے جذباتی پن سے

کیا اخذ کرے۔

وہ اٹھا اور نفیس بلوڈیں گلاس میں پانی مہر کر رما سے کہا۔ ”رما پلیز ہوش میں آؤ۔ یہ پانی

پی لو۔“ رمانے گلاس پر سے ہٹا دیا۔

وہ اب بھی کانپتے ہوئے فقی رنگت لیے لرزتے ہوٹلوں کو دانتوں تلے دبائے آنکھیں

میچے اور کھولتے یہی ڈہائی دے رہی تھی۔

”مجھ پر اعتبار نہ کرنا نیل! مجھ سے غلوں کی توقع نہ رکھنا۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے

ہو۔“ اس نے کئی بار یہی کہا۔

تو نیل نے گلاس واپس میز پر رکھ دیا۔ اور اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے سپاٹ آواز میں

پوچھا۔ ”تم۔ تم یہ نہیں ہو۔ تو پھر کیا ہو؟“

رمانے پوری آنکھیں کھول دیں۔ نیل کو دیکھا۔ بے اختیار نہ اپنے دونوں ہاتھوں

میں اس کا چہرہ تھا لیا۔

پھر اس کے ہاتھ ٹوٹی شاخوں کی طرح کر گئے۔ وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔

”تمہیں کیا ہو رہا ہے؟“ نیل نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ”لیٹ جاؤ۔ تھوڑی دیر

کے لیے آرام کرو۔ تم سخت پریشان لگ رہی ہو۔“

نیل نے اسے زبردستی ٹٹاتے ہوئے کہا۔ ”چپ چاپ لیٹی رہو۔ تم بہت نرس

ہو رہی ہو۔“



دولت۔ صرف ایک درخواست ہے۔ اپنی بچی مجھے سوپ دینا۔ میں اُسے ماں کا پیار دوں گی۔ مجھ کے سوتوں کے منہ۔“

نبیل نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ بیتابی سے پوچھا: ”کچھ کہو تو ہسی۔ جب تک کچھ بتاؤ گی نہیں میں کیا کہہ سکتا ہوں۔“

وہ بچوں کی طرح خند کرنے ہوئے بولی: وعدہ تو کر سکتے ہو۔ بچی کی ماں سمجھ کر نہیں لگتا سمجھ کر رکھ لینا۔ میں۔ میں۔“

نبیل کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ پریشانی حد سے بڑھ گئی تھی۔ رما کیا کہنے والی تھی۔ اس بات کا اُسے علم تو نہیں تھا۔ لیکن یہ احساس ضرور تھا کہ وہ کوئی بھیسا تک اور بدترین بات کہنے والی ہے۔

پھر بھی اس نے اپنے حواس پر قابو رکھا۔ آہستگی سے بولا۔

”اب تو جو ہو چکا سو ہو چکا۔ میں ہر صورت حال کا مقابلہ کرنے کو نیا ہوں۔ باقی تمہارے متعلق میں بنا سنے کیا فیصلہ کر سکتا ہوں۔ بہتر یہی ہے تم تھوڑی دیر آرام کرو میں بھی بہتر تھک گیا ہوں۔ میں دوسرے کمرے میں۔“

”نہیں“ نبیل اٹھنے کو تھا کہ رمانے اس کا بازو پکڑ لیا۔ نبیل نے محسوس کیا وہ تھر تھر کانپ رہی ہے۔

نبیل پھر بیٹھ گیا۔ اس کی ذہنی حالت قابلِ رحم تھی۔

وہ روتے ہوئے بولی: ”نبیل یہاں سے نہ جاؤ۔ پہلے سن لو۔ فیصلہ کر لو۔ مجھے سننے سے

پہلے تو اپنی رفاقت۔“

نبیل کچھ نہیں بولا۔ رما کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

کئی بے سکون لمحے بے چینی سے ذہن کو نوچتے کھسوٹے گزر گئے۔ پھر رمانے اپنے آپ

کو سنبھالا۔ ہمت بحال کی بڑے ٹھہرے ہوئے لیے میں بولی۔

”ہیں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی نبیل۔ سب کچھ۔“ وہ ایک بار مچھر پکپکیوں سے رونے لگی۔

”میں ضرور پوچھوں گا۔ ضرور سنوں۔“ نبیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے لیٹے

سہنے کو کہا۔

”میں تمہیں دھوکا نہیں دے سکتی۔ پتا نہیں کیوں تمہاری بچی کی پاکیزہ اور معصوم صورت

نے مجھے ہلا کر رکھ دیا ہے نبیل۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ سب کچھ۔“

”اچھا جیسا بتا دینا۔ پہلے اپنے آپ کو سنبھالو۔“ نبیل میڈ کی پٹی پر بیٹھا تھا۔ ”لیٹی رہو۔“

لیکن وہ اٹھ بیٹھی۔ اک غزم، اک حوصلے اور اک جذبے کے ساتھ۔

گو وہ اب نروس نہیں تھی۔ لیکن جذبات کی موجوں سے اب بھی نبرد آزما تھی۔

”نبیل۔“ اس نے اک گہری سانس لے کر کہا۔ اُس کی آنکھوں کے گوشے بھیگے تھے۔ لب

کپکپا رہے تھے اور آنکھوں میں ویرانی کی دھول تھی۔

”ہوں۔“ نبیل اپنی پریشانی کو چھپانے کی کوشش میں آواز کو پُر سکون بنا رہا تھا۔

”نبیل میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔ لیکن تمہیں بتا

دوں گی۔“

”ہوں۔“ وہ کوئی بھی غیر متوقع بات سننے کو تیار ہو رہا تھا۔

”لیکن۔ لیکن۔“ وہ پھر جذباتی ہو کر رونے کو تھی۔

”ہاں ہاں کہو۔ رما۔ پلیز حوصلے سے کام لو۔ جو کہنا ہے کہہ دو۔“

”نبیل۔ میں جانتی ہوں تم مجھے معاف نہیں کر سکو گے۔“ وہ ہتے آنسوؤں کو پونچھے بغیر

بولی: ”نبیل چپ رہا۔“

”لیکن ایک بات۔ صرف ایک بات مان لینا۔“

”تم کچھ کہو تو ہسی۔“

”کہہ دوں گی۔ سب کچھ کہہ دوں گی۔ اس کے بدلے میں کچھ بھی نہیں چاہوں گی۔ دھن نہ

”نبیل! رمانے پھر افسردہ سی آواز میں کہا۔

”ہوں“

”مجھے گھر چھوڑ آؤ۔“ ٹوٹتے لہجے میں رما بولی۔

”کون سے گھر؟“ بے اختیارانہ نبیل کے منہ سے نکلا۔ وہ سرعت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور رما کے عین سامنے آ گیا۔

چند لمبے پھر دردناک سی خاموشی کا تسلط رہا۔ دونوں پتھر یسے ایسا دہ جسموں کی طرح آٹنے سامنے کھڑے تھے۔

”کس گھر جانا چاہتی ہو؟“ بالآخر نبیل نے سرد لہجے میں پوچھا۔

رمانے صرف دھکی نظروں سے اُسے دیکھا۔ ان نظروں میں کیا تھا۔ نبیل مضطرب ہو گیا۔ تڑپ اٹھا۔

”تم اس گھر میں آچکی ہو رما۔ یہ گھر تمہارا ہے!“ نبیل نے آہستہ آہستہ لیکن مستحکم لہجے میں کہا۔

”نبیل!“ رما شاید ان الفاظ کی بچائی کی متحمل نہ ہو سکی۔ ایک بار پھر لہر اگئی۔

نبیل نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔

ہمت و استطاعت سے بار کوئی بھی زیادہ ہو تو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بار خوشی کا ہو یا غم کا سنبھال نہیں پاتا۔

”رما! تم نے جس ہمت سے مجھے اپنے ماضی کا آئینہ دکھایا ہے اس نے میری ہمتیں بھی بڑھا دی ہیں۔ مجھے یہ سچ کہہ لینے دو کہ میں بھی اب تک فریب دیتا آیا ہوں۔ میں نے بھی تم سے پیشتر کئی لڑکیوں کو اسی طرح سہاگن بنایا، اور پھر ان کا جہیز ہتھیا کر انہیں چھوڑ دیا کرتا۔ پھر قدرت نے مجھے ایک بیٹی کا باپ بنا دیا اس کی ماں اسے غم دیتے ہوئے فوت ہو گئی۔ جب میں باپ بنا تو مجھے احساں ہوا کہ دوسروں کی بیٹیوں کی زندگی کے کھینا کس قدر خوفناک عمل تھا مجھے اپنی بیٹی کے لیے ایک ماں

”نبیل! میں وہ نہیں ہوں۔ جو کچھ کہ تم مجھے بیاہ کر لائے ہو۔“

”تو پھر کیا ہو۔؟“ نبیل جھلایا۔

رما اس کی جھلٹ ہٹ کی پروا کیے بغیر بولی۔ ”میں کیا ہوں۔ سب بتاتی ہوں۔“

اور۔۔

اسی تے شروع سے لے کر آخر تک اپنی رام کہانی کہہ سنائی۔ کچھ نہیں چھپایا۔ ساکھیا سچائی کھول کر رکھ دیں۔

نبیل تو جیسے پتھر ہی گیا۔

رمانے رو تیز داختم کی۔ نبیل کے کسی فیصلہ کا انتظار کیے بغیر وہ اٹھ کر ڈسٹنگ روم میں گئی۔ عروسی لباس اتارا۔ زیور بھی سارے اتار ڈالے۔ اک سادہ مابوڑا نکالا اور ہاتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر میک اپ تک اتار آئی۔

وہ واپس کمرے میں آگئی۔ بیڈ کے دوسری طرف کھڑے ہو کر نبیل کو دیکھا۔ وہ تو اب بھی اس انداز میں بیٹھا تھا۔ سُن ہو گیا تھا جیسے۔

”نبیل!“ رمانے بے جان آواز میں پکارا۔

نبیل نے اُس کی طرف دیکھا۔ دیکھتا ہی رہا۔ زبان سے کچھ نہیں بولا۔

رما چند لمبے چپ چاپ کھڑی رہی۔

کمرے میں بو جھل سی خاموشی کا کرب جان لیوا تھا۔ یوں لگتا تھا دم لیتے کائنات کا دم ایک دم ہی گھٹ گیا ہے۔

”نبیل!“ رما کی آواز جیسے بہت دور سے آئی۔

نبیل نے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آنکھیں میچ کر کھولیں۔ اُس کے چہرے سے کسی ڈراؤنے

خواب کا تاثر چھلک رہا تھا۔

اس نے دو تین بار ایسے ہی کیا۔

کی ضرورت تھی۔ میں چاہتا تھا، کراہی لڑکی سے شادی کروں جو خود کو کھی ہوتا کہ وہ میری بیٹی کا درد محسوس کر سکے، اسے ماں کا پیار دے۔ میں نہیں چاہتا کہ اپنے ماضی کا سایہ بھی اس پر ڈالوں یہی سوچ کر اس بار غرض سے پاک ہو کر تم سے دامن امید باندھا تھا۔  
نبیل نے ایک لمحے فقی ہوتی ہوئی رہا کو دیکھا اور پھر بولا۔

”لیکن رہا! آج احساس ہوا کہ دھوکا دینا کس قدر آسان اور اس کا وار سہنا کس قدر تکلیف دہ ہے۔ مجھے یقین ہے تم بھی مجھے معاف کر دو گی جس طرح میں نے تمہارے تمام داغوں کو اپنے ذہن سے محو کر دیا ہے۔ آؤ رہا! وعدہ کریں کہ اب کبھی کسی اور دھوکے کو زندگی میں جگہ نہ دیں گے۔ میں تمہک چکا ہوں رہا بہت تمہک چکا ہوں۔“

جذبائی لمحے بیت چکے تو نبیل نے رہا کو بیٹھ پر لٹا دیا۔  
وہ باتیں کرتے رہے۔  
اور رات، بیت گئی۔

عین اس وقت جب مسجدوں سے موذنوں کی اذانیں نئی صبح کے طلوع ہونے کا مشورہ سنارہی تھیں۔

رہا اور نبیل ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑے خدائے بزرگ و برتر سے اپنی ازدواجی زندگی کی طلوع ہونے والی نئی صبح کی کامیابی کا مٹائی کی دعا کر رہے تھے۔

## اب کے بچہ

ابا کو فوت ہوئے بارہ برس بیت گئے تھے۔ ان بارہ برسوں کی بچاپ، اس کے چہرے پر لگ گئی تھی۔ آئینے کے سامنے بیٹھی وہ اپنے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ وقت اس پر کیسے بہت گیا ہے۔ تب وہ بیس برس کی تھی۔ چمکیلی صاف شفاف دھوپ کی طرح۔ کدنی، سنہری، ہلکا سا دھوپ کی طرح۔ لیکن برس بچے بچے بیت گئے تھے۔ اور اب چمکیلی سنہری دھوپ، صاف لگتی تھی۔ لگتا تھا شاخ اتر آئی ہے، اجالے جگہ ہو گئے ہیں۔ روشنی کو اندھیرا لنگر رہا ہے جگہ جگہ چمکنے والا نکلش اب مدھم روشنی میں بے ڈھنگے اور غیر واضح سے نظر آنے لگے ہیں۔ اس نے خور سے اپنا آپ اٹھتے ہیں دیکھا۔ آئینہ دنیا کی واحد شے ہے جو جھوٹ نہیں بولتا۔ سب کچھ پچ پچ کر دیتا ہے۔ عرش کو بھی اس نے سب کچھ پچ پچ بنا دیا تھا۔ اس کا خوب صورت سا اسٹارٹ جسم اب مائل بہ لڑھی تھا چہرے کی نرم و نازک جلد کو خشکی کے روپ میں ڈھل رہی تھی، گہری گہری حسین آنکھوں کے کناروں پر جلد سکڑ کر سلوٹیں سی ڈال گئی تھی۔ ہونٹوں پر تنازگی کے بجائے تشنگی کا سوکھا پن پھیل چکا تھا بالوں کے اجمار ڈھلنے لگے تھے۔ ماتھے پر سوچوں کی ان گنت کیریں تھیں۔ بالوں میں روکھا پن تھا۔ چمک تو نام کو نہیں تھی۔

وہ ہولے ہولے اپنے روکھے سوکھے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کچھ اداس سی ہو رہی تھی۔ بارہ برس اس پر برہنہ بے رحمی سے بیت گئے تھے۔

بارہ برس

”ان چیزوں کو آج کل کوئی زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ دولت کی شمع پر لوگ ہر سولوں کی طرح گرتے ہیں، جو ہمارے پاس نہیں ہے۔ بے دے کے تہمداری تنخواہ ہی ہے نا۔ زائد آمدنی تو کوئی ہے نہیں۔ اسی میں سے کھانا پینا اور صاف پننا، سردی گرمی سے نباہ کرنا اور اسی میں سے بچپن کو بیاہنا ہے۔“

”بچپن کو۔۔۔ ارے جیسی! ابھی صرف ایک بچہ کی فکر کرو دوسری بے چاری تو ابھی آٹھ سال کی ہے برشر کی فکر میں مت گھلا کر ابھی سے بہت برس بڑے ہیں۔ اور اس کے بڑے ہونے تک حسنت بھی غیر سے کمانے لگے گا۔ یہ ذمے داری اس کے کندھوں پر ڈال دیا کرو۔“

”ہو جہ حسنت تو جوان ہو کر کمانے لگے گا نا، ابھی سے کیا دس گیارہ برس کے بچے کے کندھوں پر ذمے ڈالو گے۔“

”بھئی عرشہ کی نہیں برشر کی ذمے داری۔“

”تم ابھی عرشہ کی بات سوچو۔“

”یہ تو میں کہہ رہا ہوں۔“

”ایم! بے میں داخل کرانے پر جو خرچہ کرو گے، وہ اس کے جہیز کی کوئی چیز خریدنے پر صرف کر دو۔“

”میں اس کے لیے زیور خرید رہا ہوں۔“

”زیور!“

”ہاں سنا نہیں، تم نے علم زیور ہے۔ جو بچی اس زیور سے پوری طرح آراستہ ہوگی۔ کیا کہنے اس کی سچ دج کے۔ لوگ اندھے تو نہیں ہوتے۔ یہ زیور بھی کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ اہل بصیرت اس کی افادیت کو جانتے ہیں۔ اس لیے نکر نہ کرو۔ ایم! اے کر لے گی۔ تو اچھے اچھے رشتے آپوں آپ آجائیں گے۔ میں اپنی عرشہ کی شادی کسی بہت اچھے خاندان کے بہت ہی اچھے لڑکے سے کروں گا۔“

”بہت اچھے خاندان کے بہت اچھے لڑکوں کو لوگ جہیز کے ترانہ میں تو لیتے ہیں۔“

”ایسے ہی باتیں بنی ہوئی ہیں۔ روشن خیال روشن دماغ لوگوں کی شرح اتنی محدود نہیں ہوتی اور پھر۔ ہم بھی عرشہ کو کچھ نہ کچھ دے دلا کر ہی رخصت کریں گے۔ ایک ہی تو شادی کرنی ہے ہم نے۔“

جنھوں نے زندگی کے دھاروں کا رخ ہی بالکل انجانی سمت پھیر دیا تھا۔ قدم متعین راستوں سے ان خود ہٹ کر دوسری ڈگر پر اٹھنے لگے تھے۔ یہ سب کچھ جذباتی طور پر نہیں ہوا تھا۔ اباکا اچانک موت ہی نے سب کچھ کر دیا تھا۔ اس کے ہلکے پھلکے نازک نازک کندھوں پر ڈرتے داریوں کا بوجھ ڈال کر خود آنکھیں موند لی تھیں۔ بیمار تو اتنی رہتی تھی۔ لیکن مرنے لگے تھے۔ کتنی ہی دیر تو یہ رنگ اسے سمجھ ہی نہ آئی تھی۔

ان دنوں اس نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ بی اے فرسٹ ڈویژن میں کرنے کے بعد اس نے آگے پڑھنے کے لیے امر لیا تھا۔ امر لاتی بجانب بھی تھا۔ اتنی قابلیت ہو تو پڑھنے سے روکنا اتنے کے نزدیک مستحسن نہیں تھا۔ حالانکہ اماں نہیں چاہتی تھیں کہ اب وہ مزید مغر کھپائی کرے۔ ہر مال کی طرح انہیں بھی اس کی شادی کی فکر تھی۔

”کیا ضرورت ہے آگے پڑھنے کی۔ بی اے کس تعلیم کافی ہے۔“ اماں نے آبا سے کہا۔ ”اب پڑھانے کے بجائے اس کو بیاہنے کی فکر کرو۔“

آبا اماں کی عقل باتوں کو مسکرا کر نظر انداز کرتے ہوئے بھلے ”بیاہ بھی کر لیں گے۔ پہلے ایم!ے تو کر لے۔“

”ایم!ے کر کے کیا کر لے گی۔ دو سال جوانی کے اور گنوا دے گی نا۔ دماغ اور اونچا ہو جائے گا۔“

”اچھے بھلے رشتوں میں بھی کیڑے نکالے گی۔ بیہی ہو گا نا۔“

آبا کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پھر بولے ”اچھے بھلے رشتے آئے نا تو کیڑے نکالنے نہیں دوں گا میں۔ ابھی تک کام کا رشتہ بھی نہیں آیا۔“

”کیوں نہیں آیا جس حیثیت کے ہم لوگ ہیں رشتے بھی تو اسی حیثیت کے آئیں گے۔“

”ہم کوئی گرسے پڑے نہیں بیگم عصمت صاحبہ۔ مانا کہ متوسط طبقے کے لوگ ہیں۔ زر زمین اتنا

زیادہ پاس نہیں۔ پھر بھی تراثت و نجابت خاندانی ہے۔ لڑکی خوبصورت ہے، لائق فائق ہے وہ داغ کردار کی ہے۔“

گھر بیٹو ذتے داریاں اٹھا سکتی تھی  
آبانے تو یہی سوچا تھا۔

عرشہ بھی ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے اصرار کر رہی تھی۔

اماں کی ایک نہ چلی۔ اور سرشہ نے ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا۔

عرشہ بہت خوش تھی۔ یونیورسٹی کی فضا کالج کی فضا سے یکسر مختلف تھی۔ یہاں زندگی عذر و نہیوں  
تھی۔ حیات کا کیونوس بڑا وسیع تھا۔ غلو ط تعلیم عرشہ کا نیا تجربہ تھا۔ اس نے جلد ہی محسوس کر لیا  
کہ یہاں جھجکنے سہنے سے کام نہیں چلے گا۔ جسارت، ہمت اور عالی حوصلگی کام دے گی۔ بہت سے لڑکے  
اس کے گرد منڈلانے لگے۔ فوجوان استادوں نے بھی اس میں دلچسپی ظاہر کی۔ پروفیسر ندیم عثمانی نے  
تو اس کا آتا پتا معلوم کر کے پروفوزل دینے کا بھی سوچ لیا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ عرشہ کو زندگی کی  
بہت سی خوب صورتیوں کا احساس تو اب ہوا تھا۔ اور خوب صورتیوں کو اور خوب صورت کیسے بنایا جا  
سکتا ہے۔ اسے یہ سلیقہ بھی آ گیا تھا۔ جو لڑکے لڑکیاں اسے اچھے لگے۔ ان سے اس نے دوستی کر لی۔  
کتنے ماں بھرے شنب درونہ سے وہ کتنا اعتماد آ گیا تھا اس میں۔ چھوٹی موٹی سی لڑکی اب یونیورسٹی  
کی جانی بچانی پڑا اعتماد اور پسندیدہ شخصیت تھی۔ اسے اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ وہ بہت سے  
لوگوں کو بہت ہی پسند ہے ندیم عثمانی کے متعلق بھی وہ جانتی تھی۔ وہ جب بھی اس کی نگاہوں کی زد  
میں آتی۔ اس کے ہونٹوں پر نکھری نکھری مسکراہٹ آپ بکھر جاتی۔

ندیم عثمانی ایک بہت بڑے خاندان کا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تھا۔ تعلیمی سلسلے میں کچھ عرصہ  
بیرون ملک گزار کر تھوڑا عرصہ ہی پہلے یہاں آیا تھا۔ اس کے نظریات یہاں کے نوجوانوں کے کافی مختلف  
تھے۔ دولت کی اسے بالکل طمع نہ تھی۔ جہیز کی لعنت کے وہ بہت خلاف تھا۔ سلجھی ہوئی خوش شکل  
لڑکی کو رفیق حیات بنانا چاہتا تھا جو خوبیاں وہ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بڑی حد  
تک اسے عرشہ میں نظر آتی تھیں اس لیے وہ عرشہ سے جو اس کی اسٹوڈنٹ تھی، دوستانہ خلوص  
سے پیش آتا تھا۔ باتوں باتوں میں کچھ کچھ بے تکلفی بھی برتنے لگا تھا۔ قربتوں کے لیے فاصلوں کو

دوسری بیٹی کی ذتے داری تو حسنت میاں کی ہوگی۔

”بڑی خوش فہمیاں ہیں۔“

”جو پوری ہوں گی۔ دیکھ لینا۔ حسنت میرا بچہ ہے۔ بہت حساس فرما بن رہا اور ذتے دار۔“

”میں برشر کے بے فکر مند نہیں ہوں، وہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ میں بات عرشہ کی کر رہی ہوں۔“

میری ماں لیں۔ اس کو ایم۔ اے کرانے کے بجائے اس کے لیے رشتہ تلاش کریں۔“

”رشتے تلاش نہیں کیے جاتے۔“

”تو پھر کیسے طے ہوتے ہیں؟“

”انڈ میاں نے بندھن باندھ دیے ہوتے ہیں جس سے بندھن بندھا ہوتا ہے۔ وہ آپوں

آپ کہیں نہ کہیں سے آجاتا ہے۔“

”آئیں جاتا۔ تلاش کیا جاتا ہے۔“

”میرا تو یہ ایمان نہیں؟“

”ججھے تو آپ کی باتوں کی بالکل ہی سمجھ نہیں آتی بعض اوقات۔“

”اکیس برسوں میں بھی مجھے سمجھ نہیں پائیں۔ تعجب کی بات ہے۔“

اماں کے سمجھانے بچانے کے باوجود ابائیں مانے ایسی باتیں ایسی بچنیں روز ہی ہوتی رہیں۔

اماں نے سفید پوشی کا واسطہ دیا۔ اپنی طبیعت کی نرمی گرمی کے متعلق بتایا۔ لیکن اباکو تو اسے ....

ایم۔ اے کرانے کی دھن تھی۔ اپنی جگہ اماں بھی سچی تھیں۔ کہ جس ماحول اور معاشرے میں رہ رہی تھیں

اس کا تعنا سہی تھا کہ بچی کے ہاتھ پیلے کر دیں۔ اور اپنی جگہ ابابھی ٹھیک کہتے تھے۔ ”دنیا دیکھی تھی۔

بہت سے ممالک گھوم پھر کر لوگوں کو دیکھ چکے تھے۔ ترقی یافتہ ممالک کی عورتیں ذیو تعلیم سے آراستہ

ہو کر ملک کی خدمت کر رہی تھیں۔ اپنا آپ سنبھال رہی تھیں۔ خاندان کی دیکھ بھال کر رہی تھیں

عرشہ بھی ایم۔ اے کے زیادہ باشعور ہو سکتی تھی روشن خیال بن سکتی تھی۔ ضرورت پڑنے پر

لوکری کر سکتی تھی۔ شادی کے بعد بر طریق احسن گھر کی دیکھ بھال کر سکتی تھی۔ شوہر کے شانہ بشانہ کام

سیٹھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

عرشہ خاصی ذمیں لڑکی تھی، نظروں کے خاموش بیغام سمجھتی تھی۔ نوجوانی کا زمانہ ہی تو وہ دور ہوتا ہے جب اندر کی انگلیں، خواہشیں اور تقاضے چلنے ہیں۔ اور باہر کی دلاویزیاں چپکے چپکے اندر اترنے لگتی ہیں۔ اور جب اندر باہر کا میل ہوتا ہے۔ تو پسند کی چھاپ اپوں آپ لگ جاتی ہے۔ ندیم عثمانی بھی عرشہ کی شخصیت پر چھا گیا۔ دونوں میں اب صرف میل اور ریس سروالی بات نہ رہی تھی۔ جب بھی وقت اور موقع ملتا دونوں باتیں کرنے لگتے اور اکثر بھول جاتے کہ ان کے گرد و پیش بھی اک دنیا ہے گو باتیں عام سی ہوتیں لیکن انہماک کے بندھن بڑے مضبوط ہوتے۔

”عرشہ“

”جی۔“

”بڑھائی کیسی جا رہی ہے؟“

”بس ٹھیک ٹھاک ہی ہے سر“

”کوئی پراہلم تو نہیں؟“

”جی کوئی پراہلم ہوتی ہے تو آپ سے کہہ دیتی ہوں“

”ہر پراہلم تو نہیں کہتیں؟“

”اس وقت پڑھائی کی بات ہو رہی ہے سر“ وہ شوفی سے اٹھلا کر کہتی۔ تو ندیم مسکرا کر اسے

گہری گہری پیار بھری نظروں سے دیکھنے لگتا تھا۔

اس دن ندیم عثمانی اپنے کمرے سے باہر نکلے تو عرشہ برآمدے سے گزر رہی تھی۔ اس کی سہیلی

عاصمہ اس کے پیچھے پیچھے تیز تیز قدم اٹھائے جا رہی تھی۔

”عرشہ ذرا ٹھہرو پلیز“ اس نے کہا تو عرشہ نے مڑ کر دیکھا۔ عاصمہ کے سنگ سنگ عثمانی

بھی چلے آ رہے تھے۔

عاصمہ تو اپنی بات کہہ کر واپس مڑ گئی۔ ندیم عثمانی اور عرشہ وہیں ٹوک گئے جب کچھ بات کرنے

کا مودہ ہوتا تو قدموں کو زمین آپوں آپ ہی جکڑ لیا کرتی تھی

”کہاں بھاگی جا رہی تھیں؟“

”لا تیری میں سر“

”کیوں؟“

”ایک کتاب سے کچھ ٹوٹے تھے“

”عاصمہ تو تمہیں ایسے پکارتی پلٹی آرہی تھی۔ جیسے تم...“

”وہ تو ایسے ہی ہے سر۔ چھج چھج کر آوازیں دینا اس کی ہول ہے شاید۔ عرشہ عرشہ کا شور

پھا رکھا تھا“

”ویسے تمہارا نام“

”عام سانہیں نا...“ وہ اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ ”اس لیے جب اس نام

کی دہائی دی جائے تو عجیب لگتا ہے“

”شاید، ویسے تمہارا نام ہے منفرد سا۔ کس نے رکھا تھا یہ نام؟“

”میرے ابو نے“

”اچھا“

”سر، میری بہن کا نام جانتے ہیں کیا ہے“

”کیا ہے؟“

”برشہ“

”خوب! اس سے چھوٹی کا نام فرشہ ہوگا اور اس سے چھوٹی کا فرشہ“

وہ ندیم کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ہنستے ہوئے سرنغی میں ہلاتی گئی اور بولی۔ ”نہیں سر،

ہم صرف دو ہی بہنیں ہیں۔ تیسری اور چوتھی ہوتی تو شاید یہی نام ہوتے ان کے“

”آپ کے ابو سے ملنے کا کبھی اتفاق ہوا تو میں ان ناموں کی وجہ تسمیہ مزور پوچھوں گا۔ اب تک

بڑی بے تکلفی سے اُتر آئے۔ عرشہ ان کی شبیہ آنکھوں میں قید کر لیتی۔ انہیں اچھی طرح دیکھنی، انہیں محسوس کرنی، ان سے باتیں کرنی۔ شونیاں ہوتیں۔ چھڑ چھاڑ ہوتی، ہنسی مذاق ہوتا۔ سنجیدہ باتیں ہوتیں اور یہ سب کچھ کرتے کرتے نیتنداس پر غلبہ پالیتی۔ ان دنوں اس کے خواب بھی بڑے خوبصورت ہو گئے تھے۔

یہ سلسلہ کچھ عرصہ چلا۔

دونوں نے خاموش چاہتوں کو خاموشی ہی سے قبول کر لیا تھا۔

ندیم عثمانی ان خاموش چاہتوں کو اب عنوان دینا چاہتے تھے۔ اپنی ماں اور بہنوں سے وہ اس سلسلے میں بات کرنے سے پہلے عرشہ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ اس دن وہ پکاراواہ کر کے آئے لیکن عرشہ اس دن نہ ملی۔ شاید چلوڑی گھر چلی گئی تھی۔ دوسرے دن بھی وہ نہیں ملی۔ پتا چلا کہ اس کی اتنی بیمار ہیں اور اس نے چھٹی لے رکھی ہے۔ وہ پریشان ہوئے۔ لیکن اس کے گھر جانے کا سوچ کر بھی نہ جاسکے۔ یوں چلے جانا کچھ مناسب نہیں لگا۔ وہ عرشہ کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔ ایک ہفتے کے بعد وہ انہیں یونیورسٹی میں نظر آئی۔

”کیا بات ہے عرشہ؟ اتنے دن کہاں رہیں۔ منسا ہے تمہاری اتنی بیمار تھی؟“ انہوں نے اس سے ملنے ہی کہا۔

”ہاں سر، اتنی بیمار پڑ گئی تھیں۔ بہت سے روگ پال رکھے ہیں امی نے۔ کبھی کبھی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں۔ دودھ عام طور پر تو وہ اپنی بیماریوں سے بڑی ہمت سے مقابلہ کرنے والی عورت ہیں“ عرشہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اب تو ٹھیک ہیں نا؟“

”ٹھیک نہ ہوں تو میں آتی کیسے؟“

”خدا انہیں ہمیشہ ٹھیک ہی رکھے“

”اوں ہوں“

میرے سننے میں یہ نام نہیں آئے۔ ہو سکتا ہے کسی اور ملک اور زبان کے ہوں۔  
”ادھر سر...“ وہ پھول کی طرح کھلتے ہوئے بولی۔ ”پوچھنے کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ ویسے ابو نوکری کے سلسلے میں کئی ملک میں گئے ہیں۔ لیکن یہ نام۔ میرا تو خیال ہے، ان کا تعلق کسی ملک اور زبان سے نہیں۔“

”تو اور کس سے ہے؟“

”اس سے کہ ہو سکتا ہے جب میں پیدا ہوئی ہوں تو ابو کسی بحری جہاز کے عرشے پر ہوں۔“

اسی مناسبت سے نام عرشہ رکھ دیا ہو۔

ندیم عثمانی ہنس دیے۔

”اور عرشہ“ انہوں نے چند لمحوں بعد پوچھا۔

”برشہ پیدا ہوئی ہو تو شاید وہ کسی ایسے خطے میں ہوں جہاں بارشیں رکنے کا نام نہ لیتی ہوں۔ اس لیے ذہن میں برشہ کا لفظ آگیا ہو۔ ہوا نہیں خوب صورت لگا ہو؟“

”ندیم عثمانی ہنسنے ہوئے ہوئے“ آپ کے ابو کے خوبصورت ذہن کی داد دینا پڑے گی۔  
”بالکل بالکل۔ بہت ہی اچھے اور بہت ہی خوبصورت سوچوں کے مالک ہیں میرے ابو!“  
”واقعی!“

”بچی سر“

”مانتا ہوں سچی۔ ان کی ایک خوبصورت سوز تو تم ہی ہو۔“

”ہائے ہئے۔“ وہ کانوں کی ٹونوں تک سرخ ہو گئی۔ ندیم تیزی سے قدم بڑھاتے آگے

چلے گئے۔

پیار کی نرم نرم پھوار دونوں کے من جگمگاتے چلی جا رہی تھی۔ عرشہ کچھ بے پروا قسم کی رٹکی تھی۔ سنجیدگی سے سوچنے کی عادی نہ تھی۔ لیکن اب۔ وہ بھی ندیم عثمانی کے متعلق سوچنے لگی تھی۔ رات کو جب بستر پر لیٹی آنکھیں سونے کے لیے بند کرتی۔ تو ان بند آنکھوں میں ندیم عثمانی

کے خلاف داخلہ دلا دیا۔“

”بہت احسان کیا انھوں نے مجھ پر“ وہ ہنس کر بولے۔

عرشہ نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا اور بولی: ”آپ پر...؟“

”اور نہیں تو کیا۔ تم داخلہ نہ لیتیں۔ تو مجھے کیسے ملنیں۔“

وہ ہولے سے بولے۔

عرشہ نے سر جھٹک لیا۔ اس کے اندر غصہ کی طرح خوشیوں کی ہوا بھر رہی تھی۔

پچھلے دن اور گزر گئے۔ ندیم عثمانی کو عرشہ سے براہ راست رشتے کی بات کرنے کا موقع نہ ملا۔

لیکن اس روز جب عرشہ گیٹ سے باہر نکل کر ٹرک پر آکر ہی تھی۔ عثمانی کی گاڑی بھی دوسرے

گیٹ سے نکلی۔ انہوں نے عرشہ کو دیکھا اور ادھر ہی آگئے۔

”رکھنے کے انتظار میں کھڑی ہو... انھوں نے اس کے قریب گاڑی روک لی۔“

”جی سر۔“

”آؤ میرے ساتھ۔“

”کہاں؟“

”ڈراپ کر دوں گا تمہیں۔“

”نہیں سر، رکشا آنے والا ہی ہے۔“

”رکھنے پر اکیلی جاتی ہو؟“

”نہیں شمسہ عذرا اور میں۔“

”شمسہ عذرا سے کہہ دو کہ تم آج میرے ساتھ جا رہی ہو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں سر، آپ جائیں، میں رکھنے پر ہی جاؤں گی۔“

پھر وہ آہستگی سے بولی: ”پہلے ہی بہت باتیں بن رہی ہیں سر۔ ساری یونیورسٹی میں بات

پھیل گئی ہے کہ آپ...“

”کیوں؟“

”سرمہاری آئی ہوئیں نا۔ چارچہ پیچھے بعد مزدور بیماری کے سامنے ہتھیار ڈال دیتی ہیں۔“

”کوئی جان بوجھ کر ایسا نہیں کرتا۔“

”ہماری آئی کرتی ہیں سر۔ شاید وہ ہماری محبتوں کو آزماتی ہیں۔ بہت اذیت ہوتی ہے ہمیں ان

کے بستر پر پڑنے سے۔ میری اور ابو کی جان ہی ہل جاتی ہے۔“

”تمہاری اور ابو ہی کی کیوں دوسرے بن بھائیوں۔“

”سرخسات اور برش بہت چھوٹے ہیں، انھیں دکھ تکلیف کا ابھی پوری طرح سے احساس

نہیں نا۔ نہ ہی ماں کے ہونے کی اہمیت اور نہ ہی ہونے کی اذیت سے پوری طرح واقف ہیں۔ میں

اور ابو تو۔“

”بہت پیار ہے تم دونوں کو ان سے۔“

”ہاں کل حقیقت کو تسلیم کرنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی۔ ماں کتنی اہم ہوتی ہے کون نہیں جانتا؟“

دونوں تھوڑی دیر سی باتیں کرتے رہے۔

عرشہ اپنی آئی کی ذہنی اور جسمانی بیماریوں کا ذکر کرتے ہوئے بولی: ”آئی بہت حساس ہیں، فوراً

ہی پریشان ہو جاتی ہیں۔ زندگی پر بھروسہ نہیں کرتی، وہم سا ہو گیا ہے انھیں۔ کہ۔“

”کہ؟“

”کہ میرے ہاتھ پیچھے کرنے کی خواہش دل ہی میں لے جائیں گی۔“ عرشہ سنجیدگی سے کہہ گئی۔

ندیم کا جی چاہا۔ جھٹ سے کہہ دیں: ”ایس بات نہ کہو، میں بہت جلد اس سلسلے میں قدم

اٹھانے والا ہوں، ان کی یہ آرزو جلد ہی پوری ہو جائے گی۔“

”وہ تو یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ میں ایم۔ اے میں داخلہ لوں۔ بی۔ اے کے بعد ہی...“

”تم سے گلو خلاصی چاہتی تھیں۔“ عرشہ کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے ندیم مسکرا کر بولے۔

عرشہ نے سر اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا: ”وہ تو ابو رضامند نہیں ہوئے۔ مجھے آئی کی مرضی



نرکیوں کی یہ جسارت برداشت نہیں کی جاتی تھی۔ اسے اپنے ابو کا بھی خیال آ رہا تھا۔ جنہیں اس پر بے حد اعتماد اور محروم سا تھا۔

”سر“ اس نے گھبراہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

”ہوں“

”آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں؟“

”چائے کیلئے۔“

”چائے ضروری تو نہیں تھی۔“

”ہاں، ضروری تو نہیں تھی لیکن تقریب بہر ملاقات والی بات ہے۔“

”سر... میرے گھر دلے۔“

”عرشہ، ان گھر والوں ہی کی وجہ سے تو تمہیں یہاں لایا ہوں۔“

”جی...“

چند لمحوں کے بعد دونوں چپ رہے۔ پھر عثمانی پڑ سکون لہجے میں بولے: ”عرشہ میں نے اپنی زندگی کا

اہم ترین فیصلہ کر لیا ہے، اس سلسلے میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔“

عرشہ نے ایک بار نگاہیں اٹھا کر انہیں دیکھا، پھر نگاہیں جھک گئیں۔ جیسا کہ بار بار اتنا تھا کہ وہ

ان سے نظریں نہ ملا سکی۔ وہ جان گئی تھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہتے ہیں۔

عثمانی نے تھوڑی تمہید باندھی، اپنے اور اپنے خاندان کے متعلق اسے بتایا۔ اپنی دونوں بہنوں

کا ذکر کیا، ماں کی باتیں کیں، پھر بولے: ”تمہیں اعراض نہ ہو تو میں اپنی بہنوں اور امی کو تمہارے ہاں

بھیجوں۔“

عرشہ کچھ کہہ نہ سکی، دل تو اتنی زور سے دھڑک رہا تھا، گویا پھر پھڑکنے کا گمان ہو رہا تھا۔

”یو لو نا؟“

وہ کچھ نہیں بولی، سر جھکائے سامنے رکھی جائے کی پیالی کو تکی رہی۔

ندیم پورے غلوں اور اعتماد سے مسکرتے ہوئے بولے: ”باتوں کی پرواہ کرنے لگی ہو۔“

”کرنا ہی چاہیے۔“

”پائیں بڑھ بھی سکتی ہیں۔“

وہ گھبرا کر انہیں دیکھنے لگی، وہ جلدی سے بولے: ”اسی لیے، سوچ رہا ہوں۔ لوگوں کے

منہ بند کرنا ہی چاہئیں۔“

”جی؟... سر؟... اس نے فرط حیرت سے آنکھیں پھیل کر کہا۔

”اسی لیے تو کہہ رہا ہوں، آؤ میرے ساتھ، میں ڈراپ کروں گا تمہیں، راستے میں کچھ بانیں،

کچھ فیصلے بھی ہو جائیں گے۔“

عرشہ تذبذب میں پڑ گئی، نرکیاں ٹوٹنے لگیں، نرکیوں کے گیت سے نکل نکل کر شرک پر پھیل رہے تھے۔

کچھ گاڑیوں کی طرف بڑھ رہے تھے، کچھ اسکوٹروں، سائیکلوں کی طرف، اچھی خاصی تعداد پیدل جا رہی

تھی۔ کچھ دور ہی پس اسٹاپ تھا، زیادہ تر کاروخ ادھر ہی تھا، عرشہ کو ندیم عثمانی کی گاڑی کے قریب

کھڑے دیکھ کر کئی نگاہیں معنی خیز سے اشارے کر رہی تھیں، دو چار دھیمی آوازوں میں آواز سے

بھی کسے گئے تھے۔

”عرشہ آؤ...“ ندیم نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا، اور اتنے اعتماد سے اسے بلانے کے لیے کہا کہ

انکار کی گنجائش ہی نہ رہی، بعض اوقات جذبے سوچ کے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں، طوفان پہاڑی

پہاڑی ندی کی طرح اپنا رخ آپ متعین کر لیتے ہیں، بنے بنائے راستوں پر بہنا ضروری نہیں سمجھتے۔

ندیم اسے ساتھ لے گئے، سیدھے گھر جانے کے بجائے ایک ریسٹورنٹ میں چائے کیلئے رُکے

عرشہ نے انکار بھی کیا، لیکن اصرار کی بھی تو کوئی قوت تھی۔

میز کے کنارے پر عرشہ نے اپنی فائل اودگتائیں رکھ دیں، دونوں آہٹے سامنے بیٹھے تھے، ویٹر

کو عثمانی نے چائے اور چند لوازمات کا آرڈر دے دیا تھا، عرشہ کچھ خوف زدہ سی تھی، ایک نوجوان

کے ساتھ اکیلے آنے کا پہلا اتفاق تھا، اس کا تعلق بھی متوسط طبقے کے ایسے گھرانے سے تھا، جس میں

”تو اجازت ہے، بھیجوں اپنے گھر والوں کو تمہارے ہاں؟“

عرشہ نے ہولے سے مراعات میں ہلا دیا۔

”شکریہ عرشہ!“ ندیم نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، عرشہ کو اس ہاتھ کی مضبوطی سے

ندیم کے مضبوط اور یلرز مٹرنزل برادے سے آگاہی ہو گئی۔

ندیم نے عرشہ کو بازار کے سرے پر ڈراپ کیا، خدا حافظ کہنے سے پہلے انہوں نے عرشہ سے

کہا۔ ”چند دنوں تک میں اپنے گھر والوں کو تمہارے گھر بھیجوں گا، صرف رسم نبھانے کے لیے ورنہ

معاشرہ تباہ ہو ہی چکا ہے۔ اب اپنی ہاں کو نبھانا ہے تمہیں، سمجھیں۔“

وہ مراعاتی انداز میں ہلاتے ہوئے مسکرا دی۔

بازار سے گلی اور گلی سے گھر تک آتے عرشہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے قدموں پر چل کر نہیں

سبک سبک ہر دوں سے پرواز کرستے پہنچی ہے، وہ کتنی خوش نصیب شاید اندازہ کرنا مشکل تھا، آنکھوں

میں قوس قزح کے رنگ گھل رہے تھے، من میں پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں، رگوں میں تنکٹی جھکتی خوشیاں

بہہ رہی تھیں، انسان کے اندر خوشیوں اور غموں کو برداشت کرنے کا مادہ ہوتا ہے، لیکن جب خوشی

یا غم حد سے بڑھ جائیں، تو برداشت بھی جواب دے جاتی ہے، عرشہ کی خوشیاں بھی اس وقت

برداشت کی حدیں توڑ رہی تھیں، وہ ہسٹا کراحتی کے پاس پہنچنا چاہتی تھی، اور ان کے گلے میں

بانہیں ڈال کر، ان سے لپٹ کر، ان کو بازوؤں سے پکڑ کے چمکے دے دے کر اپنی خوشی کا اظہار

کرتے ہوئے اتنی بڑی بات ان کے گوش گزار کر دینا چاہتی تھی، اکیلے تو اس سے یہ خوشیاں نبھانے

نہ سنبھل رہی تھیں، انہیں بانٹنا ضروری تھا، اور بانٹنے کے لیے ماں سے زیادہ قریب اور بے تکلف

کون تھا۔“

وہ سریلے نغے کی طرح گنگنائی لہرائی بیگ جھلاتی ڈیوڑھی سے صحن میں آئی۔

بیگ کو نے والے تخت پر اچھالا ہی تھا کہ امی گھرائی گھرائی باورچی خانے سے پانی کا گلاس یہ دوڑتی

ہوئی، بوتل کے کمرے کی طرف گئیں، عرشہ کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا، عرشہ کے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی کمرے

عثمانی نے پھر اصرار کیا، ”جواب دونا عرشہ، تمہاری اس خاموشی سے کیا سمجھوں؟“

کافی لمبی سی خاموشی کے بعد عرشہ نے سر اٹھایا اور بہت کر کے بولی، ”سر، آپ جو کچھ کہہ

رہے ہیں، سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں۔“

”زندگی کا اتنا اہم فیصلہ سنجیدگی ہی سے کیا جاتا ہے عرشہ۔“

”وہ چند لمبے چپ رہی، پھر بولی، ”سر، آپ ایک اونچے خاندان کے فرد ہیں۔“

”میں خاندانوں کی اونچائی رنجائی کا قائل نہیں ہوں، میرے ہاں ماپنے کے پیمانے مختلف ہیں۔“

شرافت سے میں کسی خاندان کو اونچا نیچا لگتا ہوں اور تمہارے خاندان کی شرافت کا یقین مجھے بہت

سے لوگوں نے دلایا ہے۔“

عرشہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی، وہ ہولے سے بولی ”تو آپ چھان بین بھی کر

چکے ہیں۔“

ندیم عثمانی بھی مسکرا دیے، ”چھان بین کا لفظ یہاں فٹ نہیں ہوتا، ویسے مجھے جس نے

بتایا یہی بتایا کہ تمہارے خاندان کی شرافت مسلم ہے اور بس یہی میرے ماپ کا پیمانہ ہے، اب کہو“

وہ چپ ہو گئی۔

”بولو نا، کیا جواب ہے تمہارا؟“

”سر، شرافت اپنی جگہ، لیکن ہم لوگ سفید پوشی کا بھرم بھی مشکل رکھے ہوئے ہیں میرے

ماں باپ کے پاس مجھے دینے کو تعلیم اور اچھی تربیت کے سوا شاید کچھ۔“

”جانے دو عرشہ، مجھے تمہارے سوا کچھ نہیں چاہیے۔“

عرشہ نے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی، پھر بولی ”آپ بہت عظیم ہیں سر، لیکن میں۔ میں کیا کہہ

سکتی ہوں؟“

”ہاں کہہ سکتی ہو، ناکہ کہہ سکتی ہو۔“

وہ بڑے خوب صورت انداز میں مسکرا دی۔

معمولی درد کی شکایت کی تھی۔ اور معمول کی طرح تیار ہو کر دفتر چلے گئے تھے۔ لیکن دفتر سے گھنٹہ بھر پہلے لوٹ آئے تھے کہ سر میں درد زیادہ تھا۔ اسپرے بھی آرام نہ آیا تھا۔ اور کچھ کچھ غنودگی محسوس ہونے لگی تھی۔

گسٹے سے چوٹ سر میں بظاہر معمولی آئی تھی لیکن اندر ہمرج ہو گیا تھا۔ اور پیٹھی ہوئی بائیک نسلوں سے فوٹن ریس بس کر دماغ کے جس حصے میں جمع ہونے لگا تھا۔ اس سے بے ہوشی طاری ہو گئی تھی آپریشن کر کے جمع ہوا خون نکالنا ضروری تھا۔

آپریشن ہوا، چند ساعت کے لیے ابوش میں آئے پھر وہی غنودگی۔

یہ سلسلہ تین چار روز چلتا رہا عرشہ اور امی کی پریشانی دیدنی تھی۔ اس وقت تو انھیں مرنے کی جان کی ٹکڑی تھی۔ دوائیوں، فیسوں ٹیسٹوں پر جو پیسے خرچ ہو رہے تھے۔ ان سے نہیں مانگے جا رہے تھے۔ ماموں، چچا، خالو سبھی موجود تھے۔ اپنی جیب سے خرچ کر رہے تھے۔ ناگامی آذیت آن پڑی تھی۔ ہاتھ بٹانا ضروری تھا۔

ابو کا آپریشن تیسری بار ہوا۔ اور یہ آخری ثابت ہوا۔ ابو ڈاکٹروں کی پوری پوری کوششوں کے باوجود بچ نہ سکے۔ ساری باتیں ڈاکٹروں کے ہاتھ ہی میں ہوتیں تو زندگی موت کا نام مٹا چکی ہوتی۔ ابو مر گئے۔ جی مرنے والے دنوں سے رہے تھے۔ جب لمحوں کے لیے جی اٹھتے تو ذمے داریوں کا بوجھ مار ڈالتا، کبھی عرشہ کو سینے سے لگا لیتے۔ کبھی اس کی امی کا ہاتھ پکڑا آٹسو بھری آنکھوں سے دیکھتے، سر اصرار دھراتے ہوئے مایوسی سے سر ہلانے، کبھی ٹوٹے چھوٹے الفاظ میں حسرت اور برسر کے ہاتھ پکڑ کر عرشہ کے ہاتھوں میں دیتے۔ مرنے سے پہلے انہوں نے ٹوٹے چھوٹے بچے میں عرشہ سے جیسے منت کی۔ اور ان بچوں کی ذمے داری اس پر ڈالی جو ابھی کمسن تھے۔ وہ ان کے لیے کوئی اثاثہ بھی نہیں چھوڑ رہے تھے۔ البتہ ان ہی تھیں۔ جوان کی کبھی آنکھوں میں جل جل اُٹھتی تھیں۔ عرشہ نے ابو کے ہاتھ چوم کر آنکھوں سے لگا کر دوتے ہوئے کہا تھا۔ ابو آپ کا سایہ ہمارے سر دلبر ہمیشہ رہے گا۔ حسرت اور برسر کی ذمے داری میں اس سائے کی ٹھنڈک میں بجاؤں گی۔ آپ زندہ ہیں

سے حسرت اور برسر بھاگے آئے اور اس کی ٹانگوں سے پھٹ گئے۔

”با جی! ابو کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟“ گیارہ سالہ حسرت رو ہانسی آواز میں کہہ رہا تھا اور برسر روئے جاری تھی۔

انھیں پرے دھکیلتے ہوئے عرشہ تیزی سے ابو کے کمرے کی طرف بھاگی۔ ساری خوشیاں پھلاوے کی طرح غائب ہو گئی تھیں۔ ٹھکر اور پریشانی نے بدحواس سا کر دیا تھا۔ یہ شکوہ دکھ بھی عجیب ہی شے ہیں۔ دھوپ چھاؤں کی طرح ایک دوسرے کے نقاب میں بھاگتے رہتے ہیں۔ کبھی سنہری دھوپ نکل آتی ہے اور کبھی چھاؤں اسے نگل جاتی ہے۔

ٹھنڈی، برقیلی اور اندھی اندھیری چھاؤں نے ایک ایک کی عرشہ کے من میں چھکنے دکنے والی سنہری پیلی اور جانفزا دھوپ کو ڈھانپ دیا تھا۔ سوزج بغیر روشنی کے رہ گیا تھا۔

عرشہ بھاگ کر کمرے میں آئی۔

”کیا ہوا امی؟“ اس نے گہم کر پینگ پر بے حس پڑے ابو کو دیکھتے ہوئے رنڈے کا پتہ پانچھوں سے پانی آٹو کے ہونٹوں سے لگانے والی امی سے پوچھا۔

امی نے جواب دیا نہیں یا عرشہ نے سنا نہیں، وہ ابو پر جھک گئی۔ اور ان کے کندھے جعبہ بوندے ابو پر بے ہوشی طاری تھی۔ یہ بے ہوشی ہولے ہولے گہمیر ہوتی جا رہی تھی۔

جانے کیسے عرشہ نے سعید چچا کو بلایا۔ رضوان، اصغر، حمید اور چھوٹے ماموں کو اکٹھا کیا۔ ڈاکٹر آیا اور ابو کو فوری طور پر اسپتال منتقل کرنے کے لیے کہا۔

بھاگ بھاگ سب کچھ ہوا، میکسی آئی۔ محلے دار اکٹھے ہو گئے۔ رشتے دار دوڑے بھاگے اور عرشہ ابو کو لے کر اسپتال پہنچ گئی۔ ڈاکٹر آگئے۔ کیس ان کے حوالے ہو گیا۔

برین ہمرج ہوا تھا۔ جیرانی کی بات کہ ابو کو کبھی ہائی بلڈ پریشر نہیں ہوا تھا۔ اس کی مریضہ تو امی تھیں۔ سب کے ساتھ عرشہ بھی جیران دپریشان تھی۔ لیکن جب ڈاکٹروں کے استفسار پر سر کی چوٹ کا پوچھا گیا۔ تو امی نے بنایا کہ وہ غسل خانے میں صبح پاؤں پھسلنے سے گر گئے تھے۔ سر پر چوکا مارا لگا تھا۔

نہیں ہوتی۔ کوئی کانا نہیں الجھتا، کوئی پھانس نہیں اٹکتی، اس ہمارا کوئی وقت متعین نہیں ہوتا۔ کوئی عمر مقرر نہیں ہوتی۔ چاہے نو برسوں پر چلتی رہے، محیط رہے پھیلی رہے، اور خزاں کی آنکھوں میں دھول جھونکتی چلی جائے، لیکن خزاں بھی برابر نقاب میں لگی رہتی ہے۔ کبھی آٹا فانا کبھی رفتہ رفتہ اور کبھی خاصے عرصے کے بعد مدبھیڑ ہو ہی جاتی ہے۔ ہمارے۔ اجازت دالتی ہے۔ ہنستی مسکراتی پھولوں کی تانگی خوشبو اور چار سو پھیل مسک کو۔ دیران کر ڈالتی ہے زندگی کی آنکھیں۔ دھول اڑاتی ہے۔ سائیں سائیں کرتی خوشنوار سواہیں چلنے لگتی ہیں۔ ہنسی کی پھول سے بھیگے بدن سوکھ کر ٹھہر جھری مٹی کے ڈھیر بن جاتے ہیں۔ جنہیں آسودگی رگیدتی رہتی ہے۔ ہمارا کی طرح خزاں کی بھی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ کوئی وقت متعین نہیں ہوتا۔ آئے۔ نہ ہی جانے کا دونوں میں فرق یہ ہوتا ہے کہ زندگی ہماروں میں جھومتی، اٹھاتی، سب خزاں سے گزرتی چلی جاتی ہے۔ گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کہ من مہمن اور شاداں ہوتا ہے۔ لیکن خزاں جب زندگی کو روندتی ہے۔ تو اس کے بال و پیر توجہ دالتی ہے، بازو توڑ دالتی ہے۔ آنکھوں سے روشنی چھین لیتی ہے۔ حوصلے پست کر دیتی ہے اور ہمتوں کے گلے گھونٹ دیتی ہے۔ مایوسی چار سو پھیل جاتی ہے۔ زیست اپنے آپ سے میلا ہو جاتی ہے۔ کرب زدہ گئے گزارنا مشکل ترین کام ہے۔ سمٹھن اور جھول گھڑیلوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر حال سے مستقبل میں دھکیلنا جان جو کھول کا کام ہوتا ہے۔

عرشہ اور اس کے گھر والوں پر بھی خزاں ایک ایک ٹوٹ پڑتی تھی۔ آٹو کے پچھڑنے کا علم اپنی جگہ لیکن ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ اتنا تھا کہ عرشہ بوکھلا گئی۔ یونیورسٹی جانا تو خبر چھوٹ ہی گیا۔ اس سے متعلقہ یادیں اور جیتی جاگتی کہانیاں بھی اجڑ گئیں۔

گوندیم عثمانی چند دوسرے پیکرز اور اسٹوڈنٹس کے ساتھ تعزیت کے لیے عرشہ کے ہاں آئے تھے۔ اور جاتے جاتے عرشہ سے یہ بھی کہتا تھا۔

”عرشہ گھبرانہ نہیں، اپنے آپ کو تنہا بھی نہیں سمجھنا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں“

عرشہ نے احسان مندی سے سر جھکا لیا تھا، کوئی جواب دینے کے بجائے اس کی آنکھوں سے چند قطرے اُبل پڑے تھے ندیم عثمانی کا خلوص اپنی جگہ۔ لیکن اس خلوص کو کہاں کہاں اور کیسے کیسے بتایا جا

گے۔ آٹو۔ آپ کو کچھ نہیں ہو سکتا۔

لیکن آٹو شاید عرشہ کی یقین دہانی ہی کے منتظر تھے۔ سکون سے آنکھیں موند لیں اور پھر۔

اگلے دن خاموشی ہی سے ہمیشہ کی نیند سو گئے۔

اک قیامت ٹوٹ پڑی۔ حشر برپا ہو گیا۔ ماں پچھاڑیں کھا کھا کر گریں، عرشہ بے ہوش ہو گئی۔ حسانت اور برشتہ سم کر دھاڑیں مار مار کر رونے چچا کے ساتھ پیٹ گئے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو نم نہ تھی۔ مرنے والے سے زیادہ اس کے پس اندگان کو دیکھ کر لوگ آنسو بہا رہے تھے۔ گھر کے سربراہ کی حیثیت مضبوط چھت کی سی ہوتی ہے۔ جس کے تلے تحفظ اور پناہ کا احساس ہوتا ہے۔ چھت گر پڑے تو دیواریں چاہے کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہوں۔ تحفظ نہیں رہتا۔ حالات کی کڑی دھوپ اور طوفان بے روک ٹوک در آتے ہیں۔ اور مکینوں پر کسی نہ کسی طور ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر جس گھر کی دیواریں ہی چھت کی پکڑ سے کھڑی ہوں۔ مضبوط ہوں نہ مستحکم۔ اس چھت کے گرنے سے تو سب کچھ ہی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ چھت گرتی ہے، نو دیواریں اکڑیں آپ لرز لرز کر ڈھیر کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ انہیں پھر سے اٹھانا، بنانا آسان نہیں ہوتا۔ بڑی ہمت اور دل گردے کا کام ہوتا ہے۔

آٹو کی ساری ذمہ داریاں عرشہ کے کندھوں پر آن پڑیں۔ آٹو کی لاش اسپتال سے گھرائی نوایک بہت بڑا بل بھی عرشہ کے ہاتھوں میں تھا دیا گیا، چھوٹے موٹے خرچے تو ازراہ پھر دی عزیزوں نے کر دیے تھے۔ یہ بل نواب انھوں نے دینا تھا۔ ایک تو علم اور صدمے سے نڈھال اس پر انہی بڑی رقم کی ادائیگی۔ وقتی طور پر تو یہ ذمہ داری اتنی نے بھائی کے سر پر ڈالی، لیکن بعد میں جس طرح یہ رقم انھوں نے اکٹھی کر کے واپس کی، وہی جانتی تھیں۔

پتا نہیں، زندگی کی ہمارا خزاں کا موسم وقت اصول اور قاعدے کا پابند کیوں نہیں ہوتا جب چاہے ہنستی مسکراتی ہمارا نال ہو جاتی ہے۔ زندگی خوشنوبن جاتی ہے۔ مسک چار سو پھیل جاتی ہے۔ ہر طرف دل ابھانے والی ہریالی اور رنگارنگ چمکتے پھول آگ آتے ہیں۔ ہنسی کی پھوار بدن بھگوئے رکھتی ہے۔ ایسی بھی ہمارا وار دہوتی ہے کہ پھولوں کے ساتھ کانٹے نہیں ہوتے۔ کوئی جھین

سکتا تھا۔ شاید وہ جانتی تھی۔

رونے دھونے کے لیے تو وقت اور جگہ کی کوئی قید نہ تھی۔ ہاں نگرہ دوزگار کا مسئلہ ایسا تھا جسے حل کرنا تھا۔ یہ مسئلہ ایسا تھا جسے التوا میں ڈالنا نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ جمع پونجی اور اتو کے ادھورے فنڈ بیماری، موت اور اس کے بعد کے چھ سات ماہ... دھکیلنے کی نذر ہو چکے تھے۔ حتیٰ کہ چھوٹا مٹا زیور جو اتنی نے عرشہ کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ خزاں کی دہتر دسے بچ نہ سکا۔ جب یہ آٹا نہ بھی ختم ہوا تو امان بہت روئیں۔ عرشہ نے حالات سے سمجھوتہ کرنے کے لیے اب اپنے آپ کو تیار کر لیا تھا۔ امان کو رونے سے تونہ روک سکتی تھی۔ ہاں تسلی دلا سے ضرور دینی تھی۔

”اُمّی، خلا کی مرضی یہی تھی۔ وہی اب بہتری کی صورت نکالے گا چچا سعید میرے لیے نوکری کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ بینک کے اتنے بڑے آفیسر ہیں۔ ضرور نوکری دلا دیں گے۔“  
عرشہ نوکری کا نام لیتی تو امان کے کلیجے میں تیرا نر جانا۔ کیسے افتاد آن پڑی تھی۔ یہی تو اس کے ہاتھ پہلے کرنے کے دن تھے۔ اور گھر کا خوشیاں لوٹنے کا وقت تھا۔ وہ نوکری کی نگرہ بن گئی تھی۔ نوکری کر کے اس نے ماں اور بہن بھائی کو پالنا تھا، پڑھانا تھا، بڑا کرنا تھا۔  
”کاش تیرے ابو کی جگہ مجھے موت آجاتی!“ وہ دکھ باری جلے دل سے یہی کہتیں۔

”اُمّی، پھر کیا ہوتا۔ مصیبت تو پڑنا ہی تھی۔“  
”کمانی کرنے والا تو زندہ رہتا۔ تجھے نوکری تو نہ کرنی پڑتی۔“  
”چھوڑو اماں۔ نوکری کرنا کوئی بُری بات نہیں۔ اب ابو کی جگہ میں نوکری کر دوں گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کب تک چلے گا اس طرح؟“  
”جب تک حسنا اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو جاتا اور برشتہ جوان ہو کر ڈولی میں بیٹھ کر سسرال نہیں چلی جاتی۔“

”میری بچی۔ امان کی آنکھوں سے برسات کی جھڑی لگ جاتی۔

عرشہ دل کڑا کر کہہ سکتی۔ ”اماں، بس اب انہی خطوط پر سوچنا ہے مجھے۔ میں حسنا اور برشتہ کو کسی کم کا احساس نہ ہونے دوں گی۔ ابو کی روح کو صرف اسی طرح تسکین ملے گی اُمّی مجھے ان کی بھتی آنکھوں کا کرب کبھی نہیں بھولے گا۔ یہ کرب حسنا اور برشتہ ہی کی ذمہ داری تھا اُمّی۔“  
عرشہ نے مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اپنے جوان دل پر جس کی سل رکھ رکھتی تھی۔ اسے تو لگ رہا تھا جیسے وہ اسی عمر میں ابو یعنی ہو گئی ہے۔ ماہ و سال پھلا لگ کر سنجیدگی کے خول میں داخل ہو گئی ہے۔  
ندیم عثمانی اس سارے عرصے میں اسے صرف ایک بار مل سکے۔ عرشہ کی بہت بندھائی اور اپنی پیش کش کا بھی دہے لفظوں میں ذکر کیا۔ ابو کی موت عرشہ کی زندگی کی خوشیوں کی شکست نہیں بننا چاہیے تھی۔  
لیکن۔

عرشہ اب اپنے حالات سے پُر اعتماد سمجھوتہ کر چکی تھی۔ ندیم عثمانی سے اس دن اپنی چاہنوں کا اقرار کر کے گھڑائی تھی۔ تو پچھلوں بھری ٹھنی کی طرح تھی۔ یہ ٹھنی ابابو بستر پر بے حس و حرکت پڑے دیکھ کر آپوں آپ پچھلوں سے خالی ہو گئی تھی۔ اور اب تو۔ اب تو عرشہ کا من اس عورت کی طرح خالی اور رکھی ہو گیا تھا۔ جس نے مردہ پٹے کو جنم دیا ہو۔

اس نے ندیم سے کہا۔ ”سر۔ قدرت کو منظور تھا وہ ہو گیا۔“  
”موت زندگی ساتھ ساتھ چلتے ہیں عرشہ۔ ابھی تمہارے ذہن پر ابو کے پچھڑنے کا دکھ حاوی ہے۔ میں انتظار کر سکتا ہوں۔ جب تم نارمل ہو جاؤ۔ تو۔“

وہ تلخ سی مسکراہٹ لیے بولی۔ ”سر، میرے گھر کے حالات سے آپ بے خبر ہیں۔ میرے بہن بھائی ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ میری ماں زیادہ پڑھی لکھی نہیں۔ کہیں نوکری کر سکے۔ ہمارے پاس کوئی آٹا نہیں ہے۔ یہ جو میرا گھر آپ نے دیکھا تھا۔ وہ بھی میرے دادا کا ہے۔ جس میں دو چچا اور تین چھوہریاں جھٹے دار ہیں۔ یہ تقسیم ہو جائے تو شاید دو کمرے بھی ہمارے جھٹے میں نہیں آئیں۔“  
”دو کمرے ہوں یا دو کوٹھیاں۔ مجھے تم۔“

”سر۔ آپ اپنی خواہش کا بار بار ذکر نہ کریں۔ میں متزلزل ہو گئی۔ تو میری ماں کو شاید بڑے

گھروں میں برتن بچنے کی نوکری اور میرے بھائی بن کو لوگوں کے سودے سلف ڈھونڈنے کا کام کرنا پڑے۔  
 ”عرشہ تمہاری سوچ نے مجھے دکھی کیا ہے۔“

”کیوں سر۔ یہ حقیقت ہے۔“

”عرشہ میں نہیں پہلے بھی کچھ کا ہوں۔ کر اپنے کو تہما نہ سمجھو، میں تمہارے ساتھ ہوں، ساتھ دوں گا تمہارا۔ تمہاری ذمے داریوں کو اپنی ذمے داریاں سمجھوں گا۔“  
 ”سر۔“ وہ ڈیڈ بائی آنکھوں سے صرف اتنے تکتی رہ گئی۔

”بچہ پر اغما دکر سکتی ہو عرشہ۔“

وہ چپ رہی۔

ندیم بولا، ”سوچ لو، چند دن بعد جواب دے دینا۔ میں تمہارا ہاتھ تھامنے کے لیے بے قرار ہوں۔“

عرشہ کئی دن سوچتی رہی۔

راتوں کی نیند اڑ گئی۔

دن کا چین اس کی نذر ہو گیا۔

جوان امیگوں من کی مزدوروں اور عمر کے تقاضوں نے بڑا بھلا بپھلایا۔ ندیم عثمانی کی ذات پر بھروسہ اور اعتماد بھی مستحکم تھا۔ یہ شادی یقیناً اس کے مسائل حل کر سکتی تھی۔

لیکن

”کیا یہ مناسب بھی تھا؟“

کیا امی داماد کے ہیکڑوں پر پلنے اور اپنے دونوں بچوں کا بوجھ ڈالنے پر رضامند ہو جائیں گی۔

زمانہ انہیں بخشے گا؟

ندیم عثمانی ایک اونچے خاندان کے فرد تھے۔ کیا ان کے خاندان کی اونچائی تک ایک بے نام خاندان کی رسائی ہو سکے گی؟

جیمز کے بچائے ماں اور بہن بھائی کا بوجھ لے کر وہ اس گھر میں جائے گی۔ جسے سسرال

کہا جاتا ہے۔ تو کیا وہ لوگ اتنے وسیع القلوب ہوں گے کہ اس بار کے ساتھ اس کو قبول کر لیں؟  
 ندیم عثمانی کا بڑا بھائی ایک بہت بڑے خاندان میں بیٹا ہوا تھا۔ اس کی بیوی لمبے چوڑے جیمز اور اک مشہور جانے پہچانے خاندان کے نام کا لیبل لے کر اس گھر میں آچکی تھی۔ اس کے سامنے عرشہ اپنے آپ کو کھڑا کرنے کے لیے کون سا سہارا لے گی؟  
 ہر بات کا جواب نفی میں تھا۔

اور

اس نفی کا اظہار اس نے ندیم عثمانی سے بڑے سختہ استحکام سے کرتے ہوئے کہا۔ ”سر مجھے نوکری مل گئی ہے بینک میں۔ یہ میرے کہنے کی کفالت کے لیے کافی نہ سہی، کافی بھی نہیں۔ اب مجھے خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے سوچنا اور کام کرنا ہے۔ میری بد نصیبی ہے کہ میں آپ کے پریوزل ہو کر کوئی قدم نہیں اٹھا سکی۔ میری مجبوری، میری ذمے داری مانع ہے سر۔“

”عرشہ۔“

اس نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا، ”معاف کر دیجیے گا سر۔“

”معاف تو نہیں کروں گا۔“ ندیم بڑے دکھ سے مسکرائے، ”ہاں انتظار کر سکتا ہوں۔“  
 عرشہ نے بیچارگی سے انہیں دیکھا۔ لیکن پاؤں ذمے داری کی زنجیروں میں اسی مضبوطی سے جکڑے رہے۔ وہ بڑبڑائی، ”... انتظار؟“

”ہاں۔“ لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

عرشہ نے سراٹھایا اور ندیم پر اک بھر پور نگاہ ڈالی پھر بولی، ”سر، میرا بھائی ابھی صرف گیارہ سال کا ہے۔ برشہ نو سال کی ہے۔ میری منزل اتنی قریب نہیں کہ عدسے کا چکر دے دوں۔  
 بارہ تیرہ سال کا تو طویل عرصہ ہوتا ہے۔ میری ذمے داریاں کم از کم بارہ تیرہ برس کے طویل عرصے

تک ہیں سر۔“

”میں تمہاری ذمے داریاں بانٹنا چاہتا ہوں۔“

اس کی بہتوں اور حوصلوں نے حسنت کو کامیابی سے ہنگامہ کر دیا۔ وہ سی ایس ایس کر چکا تھا۔ برٹش نے بھی بی۔ اے کر لیا تھا۔ اپنی ناکامی کی بنیاد پر اس نے دونوں کی کامیابی کی بنیادیں اٹھائی تھیں۔ اپنے آپ کو روند ڈالا تھا۔ بارہ برسوں کا بار اٹھائے اس کا اپنا آپ سب سے ہو چکا تھا وہ پچھلے شوخ العطر اور بے پروا اسمارٹ سی لڑکی اب رکھی سوکھی دیران سی کھیتی کی طرح تھی۔ ہنگامہ ہائے حیات سے اکیلے پھٹا آسان بھی تو نہیں تھا۔ خصوصاً اس حالت میں کہ ذات کے دکھ اور تقاضے بھی پیچھا نہ چھوڑیں۔ اس کے دماغ نے جو فیصلہ کیا تھا۔ انہی غلطو پر اس نے بارہ سال بتا دیے تھے۔ لیکن اس کے دل نے اسے معاف نہیں کیا تھا۔ دل ندیم عثمانی کو کھونے کی خطا پر اسے معاف نہیں کرتا تھا۔

حسنت کو ملازمت مل گئی۔ سیکشن آفیسر بن گیا۔ عرشہ نے جو قربانیاں بہن بھائی کے لیے دی تھیں جو مصائب جھیلے تھے۔ جن مرحلوں سے گزری تھی۔ اس کا برٹش اور خاص کر حسنت کو پورا پورا احساس تھا۔ اسے پہلی تنخواہ ملی تو وہ اس نے عرشہ کی بھولی میں ڈال دی۔

”یہ کیا ہے؟“ عرشہ نے لفاظی مانتھ میں پلٹے ہوئے اپنے سعادت مند اور خوبصورت بھائی کو دیکھا۔

”میری پہلی تنخواہ“ وہ دوزانو ہو کر اس کا گھٹنا پکڑ کر بیٹھنے ہوئے بولا۔

عرشہ نے لفاظی چوم کر حسنت کی پیشانی پر بھی بوسہ دیا۔ ”مبارک ہو“

”آپ کو مبارک ہو عرشہ باجی“ حسنت نے گھٹی آواز میں کہا۔ ”یہ سب آپ کی قربانی اور محنت کا نتیجہ ہے“

”قربانی کیسی۔ پگلے، یہ تو میرا فرض تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں کامیاب رہی“

”آپ نے اپنا آپ قربان کر کے ہماری زندگی کامیاب بنائی ہے عرشہ باجی۔ آپ کی اس طرح گزری زندگی کا لمحہ لمحہ مجھ پر بار ہے۔“

”اچھا۔“ عرشہ نے اس کی سنجیدگی پر منہ نہ کر کہا۔ ”اتنے بڑے ہو گئے ہو ایسی باتیں سوچنے کے لیے“

”لیکن میں نہیں چاہتی۔ ایسا ہونا ممکن نہیں سر۔ بات دہی اچھی لگتی ہے، جو ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ اپنے بوجھ تلے آپ کو دبا دوں۔ پھر اپنے آپ کو ختم کر دوں میرے دل میں آپ کے لیے جو جذبات ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ کسی طور پر مجروح ہوں یا گزند پائیں۔“

عثمانی چند لمحے چپ رہے۔ عرشہ نے اتنے دلائل دیے کہ انہیں چپ ہونا پڑا۔

عرشہ انہیں اداس اور دھندلائی آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر جانے لگی۔ تو ندیم عثمانی مکرانے: ”تو بارہ تیرہ سال کا بن باس کا ٹٹا پڑے گا“

”نہیں سر۔ یہ تو میرے بن باس کا عرصہ ہے۔ آپ اس زمرے میں نہیں آتے، خدا کرے“

آپ کو اچھا بیٹوں ساتھ مل جائے۔“

جانے کس دل سے عرشہ نے یہ کہا اور عثمانی کا کوئی جواب سننے سے پہلے آنکھیں پونچھتی چمکا پور دل کو سمیٹتی تیز قدموں سے وہاں سے چلی گئی۔

جو اپنے لیے بیٹھے ہیں وہ مر جاتے ہیں۔ جو دوسروں کے لیے مرتے ہیں ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔

آج عرشہ کے اندر کی جوان لڑکی بھی مر گئی۔ عرشہ کو دوسرے لوگوں کو زندہ رکھنے کے لیے مرجانا پڑا۔

زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور اہم ترین ضرورت کے کھونے کا دکھ سمیٹ کر عرشہ اپنی راہ پر گامزن ہو گئی۔ وہ پھر ندیم سے کبھی نہیں ملی۔ ہاں اسے پتہ چلا کہ وہ نوکری چھوڑ گئے ہیں شاید وہ پھر باہر چلے گئے تھے۔

وقت گزرتا گیا۔ عرشہ بینک کی ملازمت کرتی رہی۔ ترقی بھی ہوئی وقت بھی گزرا۔ اماں راستے ہی میں ساتھ چھوڑ گئیں۔ ابو کے پورے پانچ سال بعد وہ بھی ان سے جا ملیں۔ اب عرشہ پر حسنت اور برٹش کی ساری کی ساری ذمے داریاں تھیں۔ وہ اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے ان ذمے داریوں کو نبھا رہے چلی گئی۔

kutubistan.blogspot.com

اور یوں پورے بارہ برس بیت گئے۔

”بڑا تو میں تب ہی ہو گیا تھا باجی۔ جب آپ نے ہماری خاطر تعلیم ادھوری چھوڑ کر نوکری کی تھی اور اپنا گھر سامنے کے بجائے ہمارے مستقبل سنوارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔“

”بڑے ہوشیار ہو۔ اتنی باتیں جان گئے تھے۔“

”ہاں۔ باجی۔ میں اب وہ لمحے لوٹا تو نہیں سکتا۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ اب میں نوکر ہو

گیا ہوں۔ اب اپنی ذمہ داریاں میرے کندھوں پر ڈال دیں۔“

عرشہ نے مسکراتے ہوئے اس کے گال کو تھپتھپایا۔

”باجی۔“

”ہوں۔“

”اب آپ نوکری چھوڑ دیں۔“

”کیا؟“

”ہاں باجی۔ اب میں جو ملازم ہو گیا ہوں۔ میری تنخواہ سے گھر کے خرچے پورے

ہو جائیں گے۔“

”حسنات، ابھی بڑی ذمہ داریاں ہیں۔“

”کیا؟“

”برشہ جوان ہو گئی ہے۔ بی۔ اے کر چکی ہے۔ اس کی شادی کرنا ہے۔ اس کی شادی

کے بعد تمہارا گھر سامنے ہے۔ اس لیے ابھی نوکری چھوڑنے کا خیال بھی نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی اب

نورین شرمہ کو کئی نوکری سے الگ ہوؤں گی۔ پیسہ بھی ملتا ہے اور وقت بھی گزر رہا ہے۔“

”باجی۔“

”ہوں۔“

حسنات نے سر اٹھا کر بسن کی طرف دیکھا۔ پھر سر جھکا لیا۔ وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

”کسو۔ کیا کتنا چاہ رہے ہو؟“

”میں۔ میں۔“

”ہوں۔“

”باجی۔“

”بھئی کہہ بھی چکو۔ کوئی خاص بات ہے جو کہتے ہوئے ہچکچا رہا ہو رہی ہے؟“

اس نے سر اٹھاتے میں ہلایا۔

عرشہ ہنس پڑی۔ پھر بولی: ”تم تو میرے بھائی ہی نہیں بے تکلف دوست بھی ہو۔“

پھر یہ ہچکچا رہا کیسی؟

وہ چند لمحے چپ رہا۔

پھر اتنی پالتی مار کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ جھجکا پھر سوسے سے بولا: ”کچھ کہوں تو

خفا تو نہ ہوں گی؟“

عرشہ مسکراتے ہوئے بولی ”کیوں۔ کوئی ٹنگی تلاش کرنی ہے اپنے لیے آپول آپ۔“

”اوہ نہیں عرشہ باجی۔ میں نے تو اپنے متعلق ابھی کچھ سوچا ہی نہیں۔“

”تو برشہ کے لیے کوئی پروپوزل ہے تمہارے پاس۔ کسی دوست کا؟“

اس نے پھر عرشہ کی طرف دیکھا۔

”ہاں، ہاں کہو نا۔“

”باجی۔ برشہ سے پہلے میں چاہتا ہوں۔ آپ کی شادی ہو جائے۔“

”میری۔! حیرت و استعجاب سے عرشہ نے اسے دیکھا۔“

اس نے آنکھیں جھکائے جھکائے سر ہلا دیا۔

”یہ خیال تمہارے ذہن میں کہاں سے آگیا؟“ عرشہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”باجی میں سنجیدہ ہوں۔ برشہ یا میری شادی تب تک نہیں ہوگی جب تک۔“

”میری شادی نہ ہو جائے؟“



”تنہائی کی کاٹ سہنا آسان نہ تھا۔ برشتہ اور حسنت کی شادیوں کے بعد اس کے فرائض ختم ہو جاتے تھے۔“

اس کے بعد؟

اس کے بعد؟

کیا صرف کمائی کی مشین بنے رہنے سے وقت کٹتا چلا جائے گا۔ بے مقصد اور بے مصروف؟  
تنہائی۔ اور اکیلے پن سے۔

”نہیں“ اس کے من کے اندر سے آواز اٹھی۔ ”تنہائی کا ایک ایک لمحہ کرب و اذیت لے کر آئے گا۔“

وہ اس آواز سے خود ہی گھبرا گئی۔ خود ہی جوا بڑ بڑائی۔ ”میں اپنی ذات کے اندر اب بھی لمحوں کا کرب و اذیت سمہ رہی ہوں۔“

”لیکن تمہارے سامنے اک مقصد بھی تھا۔ بہن اور بھائی کی ذمہ داری کے احساس سے یہ کرب دب جاتا تھا، سٹ جاتا تھا لیکن جب تم ان دونوں کو منزل مقصود پہنچا کر اکیلی رہ جاؤ گی۔ تو۔ تو کیا کرو گی؟“

”لیکن۔ میں کیا کروں؟“ وہ زیر لب بولی۔

”حسنت کی بات کو مان لو۔“ اندر سے آواز آئی۔

”یعنی اپنی شادی بچالوں۔ اس حال میں اس عمر؟“ وہ آہستہ میں اپنا آپ تکتے ہوئے ہنس پڑی۔ پھر اس کی آنکھوں میں بارہ سال پہلے کی اپنی شبیہ گھوم گئی۔ اس گھماؤ میں اسے ندیم عثمانی کا چہرہ نظر آیا جو اب ایک بھولی بھری بے ضروری یاد کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔ اس کے چہرے پر جو دکھ و اذیت کی لہریں لہرائیں وہ صرف آئینہ ہی دیکھ سکا۔ کئی دن گزر گئے۔

وہ اپنے آپ میں بٹ سی گئی۔ حسنت نے پھر اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی۔ لیکن عرشہ کا طعنہ بار چاہا کہ وہ اس بات کو چھوڑے اور پیار بھرے اصرار سے عرشہ کے منہ سے اس بات کے

”ہاں۔“

”بے وقوف۔“

”کیوں؟“

”میری عمر۔“

”با جی۔“

”ہر بات اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے حسنت۔ اب برشتہ کی عمر ہے، تمہارا وقت ہے۔“  
”آپ کا کیوں نہیں۔ آپ نے ہمارے لیے اتنی قربانی دی۔ اتنا کچھ کیا۔ کیا ہم آپ کے مستقبل کے لیے کچھ سوچنے کے حق دار نہیں ہیں۔ برشتہ اپنے گھر چلی جائے۔ میں گھر بسالوں۔ تو با جی آپ۔ آپ اندر باہر سے اکیلی نہ ہو جائیں گی۔ اس اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے شادی۔“  
”اسے چپ رہ۔ بڑا آیا معتبر بن کر۔ اپنے چھوٹے سے ذہن پر انسی بڑی بڑی باتوں کا بوجھ مت ڈال۔“ عرشہ نے پیار سے بھائی کے سر پر ہوسلے سے چدیت لگائی۔

حسنت اس کے گھٹنے پر سر رکھ کر پیار سے بولا۔ ”میری با جی۔ میرا ذہن چھوٹا نہیں ہے اب میں پتھر بھی نہیں ہوں۔ فرسٹ کلاس آفیسر ہوں۔“

”خدا تمہیں اور بھی کامیابیاں عطا کرے۔“ عرشہ نے سر جھکا کر اس کے بالوں پر بوسہ دیا۔ اس دن بات ختم ہو گئی۔ حسنت اٹھ کر چلا گیا۔

لیکن۔

عرشہ کے من کے کئی سوئے ساحل جاگ اٹھے۔ وہ اٹھ کر ڈورینگ ٹیبل کے سامنے آن کھڑی ہوئی اور اپنے سر پر گہری گہری تنقیدی نگاہیں ڈالتے ہوئے سوکھے بے رنگ سے بالوں میں برش پھیرنے لگی۔

وہ بے شک وہ نہ رہی تھی جو وہ تھی۔

لیکن حسنت کی سوچ بھی غلط نہیں تھی۔ اس کے مستقبل کا خیال اسے صحیح آیا تھا۔

”پہلے آپ کی باری ہے۔“

”ہٹ پگلی“

”کیوں؟“

”تو بھی حسنا کی طرح سوچنے لگی ہے۔“

”سوچنا بھی چاہیئے۔ آپ نے ہم دونوں کے لیے اتنا کچھ سوچا ہے۔ ہم دونوں آپ کے لیے

اتنا سا بھی نہیں سوچ سکتے۔“

”تم دونوں ہمکس گئے ہو۔“

”جی نہیں۔“

”میں اس عمر میں شادی رچاؤں گی؟“

”کیوں کون سی آپ بوڑھی ہو چکی ہیں۔“

”شادی کی بھی الگ عمر ہوتی ہے برشرہ۔ جیسے تمہاری سہ۔ میں نے کئی جگہ تمہارے لیے رشتے

کا کہ رکھا ہے۔ میرے کو لیگ ہیں صلا سلم۔ وہ اپنے بھتیجے کے لیے خواہش مند بھی ہیں۔ ہو سکتا

ہے اچند دنوں کے اندر وہ لوگ تمہیں دیکھنے آئیں۔“

”اس سے پہلے آپ کو دیکھنے آئیں گے کچھ لوگ۔“

برشرہ مسکراتے آنکھیں نچاتے شوخی سے کہہ رہی تھی۔ برشرہ نے حیرانی سے اسے دیکھا اور

بولی۔ ”مجھے دیکھنے آئیں گے۔ کیوں؟ کہاں سے۔؟“

”حسنا بھائی نے آپ کو نہیں بتایا؟“

”نہیں۔“

”شاید وہ آپ کو سر پرانہ دینا چاہتے ہیں۔“

”کیا باک رہی ہو۔ سیدھی سیدھی بات کرو۔“

برشرہ نے پہلے تو شوخی سے ابرو اچکائے۔ ہنسی۔ مسکراتی آنکھوں آنکھوں میں لطیف

حق میں فیصلہ اگلوئے۔ شادی اب اس کے لیے برشرہ کی طرح جذباتی اور رومانی شے نہیں تھی بلکہ  
”نہایت اور امان کا احساس تھی۔“ نہایت اور اکیلے پن کی اذیت سے بچاؤ کا سہارا تھی۔ اس کی عمر ابھی اتنی  
زیادہ بھی نہیں ہو گئی تھی۔ کہ شادی کا تصور بھی اس کے اندر مر جاتا۔

وہ اکثر یہ سوچتی کہ اب اس کے لیے کوئی رشتہ آئے گا بھی تو کوئی ندیم عثمانی جیسا نہیں ہو  
گا۔ بچوں والا رنڈو یا بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کا خواہش مند ہی اس کی طرف ہاتھ بڑھائے  
گا کیا وہ کسی ایسے آدمی کے ساتھ نباہ کر سکے گی۔ عمر بھر کی دفا داری کے بندھن باندھ کے گی۔ ایسے  
بچوں کو سہارا دے سکے گی۔ جو کسی مرنے والی یا مطلقہ کی کوکھ سے جنم گئے ہوں۔ وہ ان پر مٹا بچاؤ  
کر سکے گی۔ جن کے لیے اس نے نہ تو پل پل انتظار میں کاٹا ہونہ ہی تخلیق کا دکھ سہا ہو۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

برشرہ بی۔ اے کر کے گھر بیٹھ گئی۔ برشرہ نے چاہا بھی کہ وہ بھی ایم۔ اے میں داخلہ لے لے۔

لیکن برشرہ کو پڑھنے میں داہمی ہی سی دلچسپی تھی۔

وہ عرشہ سے کہتی۔ ”میں اتنا ہی کافی سہ باجی۔ مجھے بھی کہیں نوکری واادیں۔ اپنے بینک ہی  
میں کوشش کریں نا۔“

”نہیں برشرہ۔“ عرشہ جواب دیتی۔ ”مجھے نوکری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ پیسے میں کیلی

تھی۔ اب تو خیر سے حسنا بھی کمانے لگ گیا ہے۔ مالی طور پر اب ہم محفوظ ہیں۔“

”لیکن گھر بیٹھے بوڑھوتی رہتی ہوں نا۔“

”سلانی کڑھائی کیا کر۔“

”بوٹیک کھول لوں۔“

”نہیں۔ اپنے جہیز کی چیزیں بنایا کر۔ سوچ رہی ہوں، جلد ہی تیرے ہاتھ پیلے کر دوں۔“

”ہائے باجی۔ یہ نہیں ہوگا۔“

”کیوں نہیں ہوگا؟“

”عرشہ باجی - بات یہ ہے کہ سیمہ کا ایک بڑا بھائی اور بھی ہے“  
”تو عرشہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔“

”اس کے دو بچے ہیں - بیوی فوت ہو چکی ہے - بہت بڑی پوسٹ پر ہے۔“  
عرشہ نے سر ہلایا۔

برشہ نگاہیں جھکائے عرشہ کی ذہنی کیفیت سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ ”انہیں اس بھائی کی  
بھی شادی کرنا ہے - اور - سیمانے مجھے بتایا ہے - کہ وہ - باجی - آپ - آپ سمجھ جائیں نا؟“  
”یعنی وہ اپنے بڑے بھائی کا رشتہ مجھ سے اور چھوٹے کا تم سے کرنا چاہتی ہیں۔“  
”جی - جی؟“

عرشہ چیپ ہو گئی۔

”حسنت بھائی کہہ رہے تھے کہ وہ سیدہ چچا سے کہیں گے کہ وہ آپ سے اس سلسلے میں بات  
کریں۔ اگر آپ رضامند ہو جائیں تو - تو دونوں۔“  
وہ شرمناک جھجک گئی۔ اور عرشہ سوچوں کے مہنور میں چکرانے لگی تھی۔

اس نے اسی شام حسنت کو اپنے کمرے میں بلایا ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اصل بات  
کی طرف آئی۔ عرفان کو وہ جانتی تھی، خوب صورت شریف اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ حسنت  
کے ساتھ ہی اس نے بھی سی ایس ایس کیا تھا۔ اور اب ملازمت بھی فارن آفیسرز میں مل گئی تھی۔  
عرشہ کے لیے وہ موزوں ترین تھا۔ لیکن ساتھ میں اس کا رشتہ جوڑنے کی کیا تک تھی۔ یہی بات وہ  
حسنت سے پوچھنا چاہتی تھی۔

حسنت نے بھی جھجکتے جھجکتے بات کی۔ ”عرشہ باجی، عرفان کا بڑا بھائی ظفر بہت ہی شریف  
اور صاحب حیثیت آدمی ہے۔ جاب بھی بہت اچھی ہے۔ خاندان انتہائی شریف، باوقار اور  
دولت مند ہے۔ عرفان کی امی کی خواہش ہے کہ دونوں بیٹوں کے رشتے ہمارے ہاں کر لیں۔ آپ  
- آپ اجازت دیں تو وہ لوگ ہمارے ہاں آئیں۔“

سے اشارے کیے۔ جب عرشہ نے پوری سنجیدگی سے ڈانٹا تو وہ بھی سنجیدہ ہو کر بولی ہر شہ باجی  
حسنت بھائی کے دوست ہیں نا۔“

”کون سے دوست - اس کے دو بہن جگر می دوست ہیں۔“  
”وہ - وہ عرشہ.... عرفان۔“

”ہوں - عرفان جس کی بہن تیری کلاس فیلو بھی ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں سیمہ۔“  
”ہاں۔“

”تو۔“

برشہ کچھ جھجک رہی تھی۔ عرشہ تجسس نظروں سے اسے تک رہی تھی۔ برشہ کی شرمیلی حرکات  
سے اسے اندازہ کرنا مشکل تو نہ رہا کہ عرفان اور اس میں پسند کی ڈور بندھ چکی تھی۔ لیکن اس سے عرشہ  
کا تعلق کیا تھا۔

وہ یہ بات جاننا چاہتی تھی۔ اس نے بار بار پوچھا تو برشہ بولی۔ ”باجی، سیمانے مجھے بتایا تھا“  
”کیا؟“

”کہ - کہ میں اس کو اس کی امی اور عرفان کو بہت پسند ہوں۔“ برشہ نے دونوں ہاتھوں  
سے منہ چھپا کر کہا۔ ان کی امی نے حسنت بھائی سے بات کی ہے۔“

”اچھا“ عرشہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ”حسنت نے مجھے یہ بات نہیں بتائی۔“  
”سوچ میں پڑے ہیں اس لیے۔“

”اس میں سوچ میں پڑنے کی کیا بات ہے؟“  
”ہے نا۔“

”وہ کیا؟“

”وہ یہ کہ - عرشہ باجی۔“

”ہاں ہاں کونسا - کیا پسلیاں بھجھو رہی ہو۔“

”آپ سوچ لیں عرشہ باجی۔ آپ کو مجبور تو کوئی نہیں کر سکتا۔ نہ ہی کوئی دباؤ ڈالا جاسکتا ہے ہوسکتا ہے، میرا سوچنے کا انداز غلط ہو“

عرشہ نے اس کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا، ہاں اس کی سوچیں گنجائش نہیں تھیں۔  
حنانت نے سعید چچلے سے بھی بات کی۔ جو باتیں وہ کھل کر خود عرشہ سے نہیں کر سکتا تھا۔ وہ سعید چچا کو سکتے تھے۔ اتنے اچھے اور موزوں رشتے قسمت ہمارے مل رہے تھے۔ سعید چچا کے بھی دل کو لگے تھے۔ عرشہ کو قافی کرنا ان کے لیے کوئی بڑی بات نہ تھی۔

سعید چچا کئی دن عرشہ کو سمجھانے رہے۔ نظریہ طرح سے عرشہ کے لیے موزوں تھا۔ عمر میں بھی کوئی تین سال ہی بڑا تھا۔ خوب دلالتی اور ایک کلیدی حیثیت کی جاب پر فائز تھا۔ مٹھافٹ مسلم تھی۔ بچے بھی کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھے۔ دونوں ماں کے مرنے کے بعد دادا، دادی کے پاس تھے۔ اور جب تک ان میں ہمت تھی۔ بچوں کی ذمے داری کا بیڑا وہی اٹھانے کو تیار تھے۔  
عرشہ انکار کرتی تو کس بنا پر کہتی؟ اس عمر میں ایسا رشتہ ملنا بھی بہت بڑی بات تھی۔ وہ کئی دن سوچتی رہی۔

اس نے یہ بھی دیکھا کہ برشہ اس کی سوچوں کی طوالت سے پشیمردہ سی رہنے لگی ہے۔ شاید اسے دھڑکا لگا تھا کہ عرشہ نے انکار کر دیا تو وہ بھی عرفان کو نہ پاسکے گی۔  
عرشہ نے بہت سوچا۔ بڑا الجھی۔ کئی دفعہ ندیم عثمانی کا خیال آیا۔  
لیکن آخر اسے فیصلہ کرنا ہی پڑا۔ جب ندیم عثمانی نہیں۔ تو کوئی بھی سہی، نظریہ ہو یا کوئی اور۔ یہ فریضہ ادا کرنا ہی ہے تو کر ہی دیا جائے۔

اس نے چچا کے سامنے سر جھکا کر خاموشی سے اپنے فیصلے سے انہیں آگاہ کر دیا۔ برشہ کی فوشیوں کا تحفظ صرف اسی طور پر ہوسکتا تھا۔

گھر میں خوشی کی ہر درواز گئی۔ برشہ کے چہرے پر تو چاندنی بکھر بکھر گئی۔ شگوفوں کی ہلک ہلکی سی خوشی۔ اسے خوش دیکھ کر عرشہ کو وہ وقت یاد آیا۔ جب وہ ندیم عثمانی سے ازدواجی بندھن

عرشہ چپ رہی۔

”باجی۔ برشہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ شاید ہی ملے۔ عرفان کی بھی خواہش ہے اور اس کے گھر والوں کی بھی۔ برشہ بھی بہت خوش ہے۔ عرفان اور برشہ کی جوڑی بہت اچھی رہے گی۔ باجی، برشہ ان سب کو پسند ہے۔ انہیں جہیز کا بھی کوئی لالچ نہیں۔ کسی قسم کا بار نہیں ڈالیں گے ہم پر۔“  
”تو خوشی سے آئیں۔ ہم برشہ کا رشتہ کر دیں گے۔“

”خالی برشہ کا نہیں نا۔“

”تو ضروری ہے کہ میں بھی۔“

”ہاں باجی۔ وہ دونوں رشتے کرنا چاہتے ہیں۔“

”دونوں کے لیے مجبور نہ تو نہیں کر سکتے۔ برشہ انہیں پسند ہے، ٹھیک ہے۔“

حنانت تذبذب میں پڑ گیا۔ چند لمحوں میں مرجھائے ہاتھ ملتا رہا۔ چہرہ بچا رنگ سے بولا۔ ”عرشہ باجی! انہیں نظریہ کا رشتہ بھی کرنا ہے اور وہ چاہتے ہیں دونوں بہنیں۔“

”حنانت۔ تم مجھے مجبور نہیں کر دو۔“

”باجی۔ برشہ کے لیے۔ یہ بات میں بڑے دکھ سے کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ نے انکار کر دیا

تو شاید برشہ کا رشتہ بھی نہ ہوسکے۔“

”کیوں؟“

”ان کی امی۔ یا تو دونوں رشتے لیں گی۔ یا ایک بھی نہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”بس ان کی اپنی سوچ ہے۔ اسی میں مصلحت سمجھتی ہوں گی۔ کہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر سے

آجائیں۔ تو نظریہ کے بچوں کا مستقبل سنو جائے گا۔ شاید ان کے ذہن میں یہ خیال بھی ہو۔ کہ آپ نے

جیسے ہمیں پالا پوسا ہے۔ ان بچوں کو بھی۔ آپ اسی طرح پالیں پوسیں گی۔“

عرشہ چپ ہو گئی۔

باندھنے کا وعدہ لے کر گھرائی تھی۔

ندیم عثمانی جو اب اک بھولی بسری بے مزرسی یاد کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس یاد میں اب بھی تنہی اور تیزی ہوتی تو شاید عرشہ اتنا بڑا اور اہم فیصلہ کبھی نہ کر پاتی۔

کچھ دن تیاریوں کی نذر ہوئے۔

پھر عرشہ کی شادی ظفر سے ہو گئی۔

اور ایک ماہ بعد برشہ و ملن بن کر خواہوں کی جنت میں اتر آئی۔

حسنت بے حد خوش تھا۔ اس کو لگتا تھا جیسے اس نے اک ذرے دار باپ کا فرض بخیر و خوبی ادا

کر دیا ہے۔ دونوں بہنیں اپنے اپنے گھر میں آباد ہو گئی تھیں۔ یہ کوئی کم خوشی کی بات نہ تھی۔ زیادہ

خوشی تو اسے عرشہ کو دیکھ کر ہوتی تھی۔ جواب تک بار اٹھائے ہوئے تھی۔ شاید تھک بھی چکی

تھی۔ اب سستانے کا وقت آگیا تھا۔ اس کے سر پر لب چھتھار درخت کلسیہ اور ٹھنڈک تھی۔

عرشہ اپنا گھر لہا سکی تھی۔ برشہ بھی راہ زندگی پر کامیابی سے گامزن تھی۔ دونوں کو اب حسنت

کا گھر بسانے کی آرزو اور فکر تھی۔

وہ کوئی بہت ہی اچھی لڑکی تلاش کر رہی تھیں۔ ایسی لڑکی جو شہن صورت کے ساتھ حسنِ صورت

سے بھی مالا مال ہو۔

اس دن عرشہ اسی سلسلے میں میکے آئی ہوئی تھی۔ دونوں بچے بھی ساتھ آئے تھے۔ تین چار

ماہ ہی میں بچے اس سے بے حد مانوس ہو گئے تھے۔ عرشہ نے فرخ زلی سے ممتا کی چھاؤں انہیں مہیتا

کی تھی۔

اس نے چچی کے ساتھ کہیں لڑکی دیکھنے جانا تھا۔ وہ کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے آئی۔

خوب صورت سا جوڑا استری کر کے بستر پر پھیلا رکھا تھا۔ وہ ابھی ہاتھ روم میں جانے ہی والی

تھی کہ ملازم لڑکا آگیا۔

”بی بی جی!“ وہ دروازے پر ٹک کر لولا۔

”ہوں!“ عرشہ نے مڑ کر دیکھا۔

”کوئی مہمان آئے ہیں“

”کون؟“

”پتا نہیں جی۔ ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔“

”نام نہیں پوچھا“

”نہیں۔“

”باہر ہی کھڑے ہیں۔“

”جی نہیں بیٹھک میں بٹھا دیا ہے۔“

”اچھا۔“ عرشہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑی۔ اس لیے نہیں کر آنے والے کے متعلق کوئی

خیال آیا تھا صرف اس لیے سوچ میں پڑی کہ کپڑے پہلے تبدیل کرے یا آنے والے صاحب سے

مل کر بعد میں بدلے۔

اس نے اسی طرح بیٹھک میں جانے کا ارادہ کیا۔ ہو سکتا ہے کوئی اس کا بینک کا کو لیگ

ہو۔ یا بینک ہی کے سلسلے میں کوئی ملے والا ہو۔ اس نے جلدی سے بالوں میں برش کیا۔ آئینے میں

سراپا دیکھا۔ دوپٹہ کندھوں پر ڈالا اور کمرے سے نکل کر بیٹھک کی طرف چل دی۔

وہ سامنے ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔

عرشہ نے اندرونی دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر آنے کے لیے قدم رکھا تو نظران پر پڑی۔

نظریں ساکت سی ہو گئیں۔

وہ پردے کو ہاتھ میں سختی سے پکڑے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

وہ ندیم عثمانی تھے۔

تیرہ چودہ برسوں میں جسم قدرے بھاری ہو گیا تھا اور آنکھوں پر چھڑا آگیا تھا کنپٹیوں

کے بالوں پر تھوڑی تھوڑی سفیدی اتر آئی تھی۔ بس۔ باقی ویسے کے ویسے ہی تھے۔

”سر۔“

”تم نے کہا تھا کہ تمہاری ذمے داریاں بارہ تیرہ سال کے طویل عرصے پر پھیلی ہیں۔ اور میں نے جواب دیا تھا: تو پھر بارہ تیرہ برس کا بن باس کاٹنا ہوگا۔“

”سر۔ وہ۔“ عرشہ اندر سے کانپ اٹھی۔

اس کی بات سے بغیر وہ اپنی لے میں بولے۔ ”عرشہ میں بارہ تیرہ برس کا بن باس کاٹ کر واپس آگیا ہوں۔ اب تو تمہاری ذمے داریاں نبھ چکی ہوں گی۔ اور۔“

”متی“ دونوں بچے کمرے میں آتے ہی عرشہ کے گلے میں بازو ڈال کر جھپٹ گئے۔ جیسے ہم بھٹا۔

ندیم عثمانی کی بات ادھوری رہ گئی۔ جھپٹی جھپٹی آنکھوں سے وہ عرشہ اور بچوں کو دیکھنے لگے۔ کچھ پوچھنے کی ان میں ہمت نہ رہی۔

عرشہ نے ان پر اک نگاہ ڈالی۔ اس کے اندر ایک چیخ اٹھری اس نے کنا چاہا، سر آپ نے دیر کمر دی۔ لیکن وہ چپ رہی۔ اپنے آپ کو سنبھالا۔ چہرے پر لندہ وئی کمر ب کی ایک جھلک نک نک آنے دی۔ چند لمبے سر جھکاتے سرور بیٹھی رہی۔

پھر۔ ہاں پھر

دونوں بچوں کے ہاتھ کپڑے کر گود میں بٹھانے ہوئے بولی۔ ”سر یہ طہر کے پتے ہیں۔ اور اب میں مسٹر طہر ہوں۔ ذمے داریوں کا بوجھ ایک بار پھر مجھے سونپ دیا گیا ہے۔“

”عرشہ“ عثمانی کے چہرے پر دکھ کے مہیب سائے اُہرانے لگے۔ وہ مضرب کمر سکے۔

عرشہ بچوں کو ہٹا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہاں رکنا محال تھا۔ ندیم عثمانی کے چہرے پر پھیلی مایوسی اور دکھ کے سائے دیکھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔

”سر! میں آپ کے لیے چائے بنواتی ہوں۔“ وہ ان کا جواب سنے بغیر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

ندیم عثمانی نے دونوں ہاتھوں پر سر گرالیا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے تیرہ دنوں

انہوں نے عرشہ کو دیکھتے ہی اٹھ کر بڑی گرم جوشی سے سلام کیا: ”ہیلو۔ کیسی ہو؟“

عرشہ نے سر کو ہلکا سا جھکا دیا۔ آنکھیں بار بار کھولیں بند کیں۔

پھر اپنے آپ کو بمشکل سنبھالتے ہوئے آگے بڑھ کر قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”پہچاننے میں دشواری ہو رہی ہے۔ بھول چکی ہو۔ میں ندیم عثمانی ہوں۔“ ندیم نے عجلت، گھبراہٹ اور مسکراہٹ کے درمیان کہا۔

وہ آگے بڑھ کر عرشہ کے قریب والے صوفے پر بیٹھے۔

”عرشہ۔“ انہوں نے اک مسکراتی نگاہ اس پر ڈالی۔ ”جیران ہو رہی ہو مجھے دیکھ کر پریشان؟“

عرشہ نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ دفعتی پشیمانی اور دباؤ سے اپنے آپ کو نکالتے ہوئے بولی۔ ”سر! آپ نے یوں اچانک اگر حیران ہی کر دیا۔“

عثمانی مسکرا کر گہری سانس چھوڑتے ہوئے ذمہ معنی لہجے میں بولے۔ ”شکر ہے۔ پریشان نہیں کیا۔ کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں؟“

”میں پورے ساڑھے بارہ سال بعد کل ہی یہاں آیا ہوں۔“ وہ عرشہ کو دیکھتے ہوئے بولے۔

”اتنا عرصہ آپ کہاں رہے سر۔“ عرشہ کے اندر زبردست نواز پھوڑ ہو رہی تھی۔ لیکن کمال بہت سے وہ عثمانی کا سامنا کرنے ہوئے ان سے بائیں کر رہی تھی۔

عثمانی نے مختصر اُن سالوں کی روئیداد سے سنائی۔ وہ عرشہ کے یونیورسٹی چھوڑنے کے کچھ ماہ بعد ہی اس سے آخری دفعہ مل کر امریکہ چلے گئے تھے۔ وہیں ملازمت کر لی تھی۔

”عرشہ“ مختصر سی روئیداد چند لمحوں میں اس کے گوش گزار کرنے کے بعد وہ بڑی رسائیت سے بولے۔

”جی۔“ بے جان سی آواز عرشہ کے وجود سے نکلی۔

”یاد ہے جب ہم آخری بار ملے تھے تو تم نے کیا کہا تھا؟“

کانہیں تیرہ مہینوں کا بھی نہیں۔ تیرہ سالوں کا بن ہاس کا ٹاٹھا۔ کیا یہی دن دیکھنے کے لیے؟  
 کاش وہ امریکہ سے واپس ہی نہ آتے۔ امید کتنی حسین اور کتنی جاندار چیز ہے۔ اس کے سارے  
 جہاں اتنے برس کاٹے تھے۔ کیا تھا جو پوری زندگی ہی کٹ جاتی۔  
 عرشہ چائے لے کر آتی تو ندیم عثمانی جا چکے تھے۔

برسوں پہلے

ندیم عثمانی عرشہ سے پھٹے تھے۔

ملنے کے لیے

اور اب

اب پھٹے تھے۔

کبھی نہ ملنے کے لیے۔

میں بچوں کو اسکول ڈراپ کر کے مارکیٹ چلی گئی۔ ضروری سودا سلف لینا تھا۔ اسٹور میں گھومتے  
 پھرتے چیزیں خریدتے اور پیک کر داتے ساڑھے دس بج گئے۔ میں نے ساری چیزیں جلدی جلدی  
 گاڑی میں رکھیں اور گھر کی راہ لی۔ چھ ماہ کی مونا کو سلا کر آئی تھی۔ اس کے درد دھکا وقت ہو چکا تھا۔  
 وہ یقیناً اٹھ چکی ہوگی اور درد دھکا کے لیے رو رہی ہوگی۔  
 سبجے ڈاکٹھانے بھی جانا تھا۔ لیکن مونا کا خیال کر کے سیدھی گھر چلی آئی۔ شانو۔ میں نے پوچھا  
 میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے ملازم لڑکے کو آوازی دی۔ مونا کے رونے کی آواز نہیں آرہی تھی۔ میں  
 نے تسکین کی سانس لی۔

”جی بیگم صاحب! شانو کندھے پر جھاڑن رکھے باہر آگیا۔

”گاڑی سے سودا نکالو۔ اور کپن میں لے چلو۔“

”اچھا بیگم صاحب!“

”شیداں یہیں ہے نا؟“

”جی کپڑے دھو رہی ہے“

”مونا سو رہی ہے“

”جی نہیں.... جاگ رہی ہیں۔ شیداں نے جھولے میں ڈال دیا ہے۔ کھیل رہی ہیں۔“

”اچھا احتیاط سے چیزیں نکالو۔“

”ہست بہتر“

”گاڑی بند کر کے آنا“

”اچھا جی“

میں شانو کے سپرد اس کا کام کر کے اندر آئی۔ ابھی مونا تک بھی نہ جا پائی تھی کہ کال بیل بجی۔  
 ”اوہ۔ کون آگیا؟“ میں نے بیزاری سے کہا۔ اور خود بیل کرنے والے کا انتظار کیے بغیر اپنی بچی  
 کے جھولے کی طرف بڑھ گئی۔ گول مٹولی سی مونا بڑی خوش تھی۔ رنگین جھینسا جو جھولے کے ساتھ ٹلک  
 رہا تھا اسے دیکھ دیکھ کر خوب ہاتھ پاؤں پھلا رہی تھی اور غول غاں کی بے مقصد آوازیں نکال رہی تھی۔  
 ”اوہ میرا گونا مونا۔ بھوک نہیں لگی۔ دودھ پئے گا گیلو۔“ میں بچی کو بازوؤں میں بھر کر پیار کرنے لگی۔  
 ”بیگم صاحب“ شانو نے پکارا۔

”کیا ہے؟“

”اک بیگم صاحب ملنے آیا ہے جی“

”کون بیگم صاحب؟“

”بولتا ہے ہمسایہ ہے۔ آپ سے ملنے آیا ہے“ شانو پٹھان لڑکا تھا۔ برسوں سے ادھر ہی رہ  
 رہا تھا۔ لیکن مونٹ فڈر کی الٹ پھیر ہمیشہ کر دیا کرتا تھا۔

”انہیں بٹھاؤ۔ میں آتی ہوں“

”بٹھا دیا جی ڈرائیونگ روم میں۔ صوفہ سیدھا کر کے رکھ دیا ہے“

”اچھا۔ ہاں سودا نکال لیا“

نکال رہا ہوں جی۔ وہ بیگم صاحب آگیا تھا۔ اب نکالتا ہوں۔“

مجھے اس وقت کسی کا آنا اچھا نہیں لگا۔ سو کام بکھرے پڑے تھے۔ اس گھر میں آئے ہیں جو تھا  
 دن تھا۔ ابھی تک سامان پوری طرح نہیں کھولا تھا۔ بمشکل ایک بیڈ روم سیٹ کر پائی تھی۔ ڈرائیونگ  
 روم میں قالین رول ہوا پڑا تھا۔ صوفے بے ترتیب تھے۔ میز پر بندھی پڑی تھیں۔ تصویریں دیواروں

کے ساتھ الٹا کر رکھی تھیں۔ ڈیکوریشن کی ساری چیزیں پیک تھیں ابھی۔

میں چند لمحے مونا کو پیار کرتی رہی۔ پھر شیدائ سے کہا۔ شیدائ مونا کا دودھ بنالادو۔ دس بجے دینا

تھا گیارہ بجے دلے ہیں۔ بیچاری بچی“

”اچھا بیگم صاحب“

”بوتل فرنچ میں رکھی ہے۔ اچھی طرح دیکھ لینا۔ شانو کبھی کبھی ٹھیک طرح سے صاف نہیں

کرتا۔ جینی ایک صبح ڈلنا“

”مجھے پتہ ہے بیگم صاحب جی“

”تو سنبھالو اسے۔ کوئی ملنے والا آیا ہے“

”اچھا جی۔“ شیدائ نے گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھ کر مونا کو لینا چاہا۔ مونا ہنس کر میرے

ساتھ لیٹ گئی۔ منی سی بچی کو میری خاصی پہچان تھی۔ میں نے زبردستی مونا کو شیدائ کے حوالے

کیا۔ اپنے کمرے میں آئی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ بالوں میں برش پھیرا۔

ہونٹوں پر لپ اسٹک کا کچھ دیا۔ اور دوپٹ درست کرتے ہوئے ڈرائیونگ روم میں آگئی۔

بے ترتیب سی چیزوں کے درمیان ایک صوفے پر وہ بیٹھی تھی۔ میں نے ناگواری کو مسکراہٹ

تھے دبا کر بڑے تپاک سے اسے خوش آمدیدی انداز میں سلام کیا۔ وہ چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میرے

سلام کے ساتھ ہی اس نے بھی سلام کیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر تپاک سے مسکرا دیں۔

وہ پچیس چھیس سالہ بڑی پُرکشش اور اسٹارٹ سی خاتون تھی۔ سیاہی مائل ہلکے زرد رنگ

کا نیلے اور کالے پھولوں والا سوٹ پہن رکھا تھا۔ دوپٹ بھی سوٹ ہی کی طرح کا تھا۔ اس کا رنگ

گورا نہیں تھا۔ لیکن گندمی رنگ میں ہلاکی ملاحظہ تھی۔ ناک نقشہ عام سا تھا۔ البتہ بال سیاہ اور

بلے نہ تھے۔ اس کی ڈھیلی سی چوٹی پشت سے نیچے آ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں لیکن

پتہ نہیں مجھے ان آنکھوں میں زندگی کی بجائے موت کا سا سکوت گھٹا محسوس ہوا۔ پھر بھی اس



اس نے پوچھا: ”آپ لوگ کہیں سے پوسٹ ہو کر آئے ہیں۔ یا یہاں ہی گھر تبدیل کیا ہے“  
میں نے اسے پوسٹنگ کا بتایا۔ میرے میاں سہیل بیٹس کی ایک مشہور فرم میں منجرتھے۔  
کراچی سے تبادلہ لاہور ہو گیا تھا۔ یہاں پروڈکشن مینجر ہو کر آئے تھے۔ کافی سہولتیں تنخواہ  
کے علاوہ بھی ملی تھیں۔ جن میں سب سے بڑی سہولت چار بیڈروم کی یہ خوبصورت کوٹھی بھی تھی  
میں نے مختصر اسمیل کے بارے میں اسے بتایا۔

”آپ کے بچے؟“ اس نے اپنی بے جان آنکھوں سے مجھے دیکھا۔  
”تین ہیں“ میں نے کہا۔ ”دو بیٹے۔ ایک بیٹی۔ بیٹے سات اور پانچ سال کے ہیں۔ بیٹی  
پچھ ماہ کی ہے۔“

”میرا ایک بی بیٹا ہے“ اس نے اسی لہجے میں کہا۔  
میں ہنس پڑی۔ اور بولی ”بھئی یقین مانیں، میں تو پوچھنے ہوئے جھجک رہی تھی کہ آپ کی شادی  
بھی ہوئی ہے یا؟“

میری شادی کو اگلے ماہ پوبے پھر سال ہو جائیں گے۔ وہ بولی۔ ”پانچ سال کا کوکب ہے میرا“  
”آپ کے میاں کیا کرتے ہیں؟“ میرے سوال پر چند لمحے وہ جیسے کسی پریشانی سے دوچار ہوئی  
پھر فوراً ہی سنبھل گئی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”انجینئر ہیں سعودی عرب میں“  
”اوہ۔ اچھا“ میں نے مسکرا کر کہا۔ گویا اس کی لمحائی پریشانی کی وجہ سمجھ میں آگئی تھی۔

”کب سے وہاں ہیں؟“  
”شادی سے ایک سال پہلے گئے تھے۔“  
”آپ بھی گئیں؟“  
”ایک دفعہ گئی تھی، کوکب صاحب تشریف لانے والے تھے۔ اس لیے واپس آگئی۔“  
”پانچ سال سے آپ چھوڑ گئی نہیں۔“  
”نہیں۔“

”تشریف رکھیے“ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔  
”میرا اس وقت آنا ناگوار تو نہیں گزرا؟“ اس نے توشاید یونی کہ دیا تھا مجھے لگا میرے چہرے  
سے اس نے یہ احساس پڑھ لیا ہے۔ اس لیے میں دانت ہنستے ہوئے بولی۔  
”ایسا کیوں سوچا آپ نے مجھے تو یہ خوشی ہوئی ہے۔“  
”میں کل آنا چاہ رہی تھی۔ گیٹ ٹک آئی بھی، لیکن پھر لوٹ گئی۔ آپ کو یہاں آئے تین چار  
دن ہی ہوئے ہیں نا۔“  
”جی آج پانچواں دن ہے۔ دیکھ لیں ابھی تک سامان کھلا ادھ کھلا پڑا ہے۔ سیٹ کرنے  
میں کئی دن لگیں گے۔“

”کہیں تو میں آپ کی مدد کر دوں۔“  
”شکریہ۔ آپ رہتی کہاں ہیں؟“  
”سامنے والی قطار میں دائیں ہاتھ۔ کالے گیٹ والا گھر میرا ہے۔“  
”اچھا۔ اچھا۔ جمال بڑی خوش رنگ بلیں ہیں۔ پوری عمارت پھولدار بیلوں سے گھری ہے۔“  
”جی وہی۔“  
”یقین مانیں۔ مجھے یہ گھر بہت اچھا لگا تھا۔ کس سلیقے سے آپ نے بیس چڑھا رکھی ہیں  
پھولوں سے مجھے بڑا پیار ہے۔ یہ قدرتی ڈیکوریشن۔“  
”جی۔ مجھے بھی عشق ہے پھول پودوں سے۔“  
”پھر تو دوستی خوب نیچے گی ہماری آپ کی۔“ میں نے بے تکلفی سے ہاتھ پھیلایا اس نے  
اپنا سلوانا سا نرم و گداز ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔  
میں معذرت کر کے چند لمحوں کے لیے کچن کی طرف گئی۔ شانو سے چائے بنانے اور بکٹ  
اور مرمرے جو میں ابھی مارکیٹ سے لائی تھی رکھ کر لانے کا کہہ کر پھر اندر آگئی۔  
ہم دونوں باتیں کرنے لگیں۔

میں روزِ گیا کر دوں مدد کے لیے۔“

میں نے اس کی پُر خلوص آفر پُر خلوص طریقہ سے لوٹا دی۔

”آپ اس گھر میں اپنے سسرال والوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ میں نے اپنی بیوی میں شکر گھونٹے ہوئے کہا۔

”نہیں۔ یہ میری امی کا گھر ہے۔“

”آپ اپنی امی کے پاس رہتی ہیں گویا۔“

”پتہ نہیں؟ اس نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔“ امی میرے پاس رہتی

میں یا میں امی کے پاس۔“

میں اس کی بات سے کچھ سمجھ نہیں۔ بات کی گہرائی میں جانے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پہلی ملاقات تھی۔ کیا خبر کیسے لوگ تھے۔ کسی بات کا برا ہی نہ مان جائے اسی لئے میں نے ایک بار پھر موضوعاً دوسری طرف پھیر دیا۔

”بچے کے لوگ کیسے ہیں؟“

”واہیں ہاتھ کون رہتا ہے؟“

”بائیں کون؟“

”سامنے والے گھر میں اکبر اور سعیدہ اکبر رہتے تھے۔ وہ ہم لوگوں سے ملنے کل رات آ

چکے تھے۔“

”اچھے لوگ ہیں۔“ میں نے اکبر اور سعیدہ کے متعلق کہا۔

”ہاں بہت اچھے۔ بڑے دلنار۔ کام آنے والے۔ شریف لوگ ہیں۔“

اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر موت کا سکوت گھل گیا۔ بے جان نظروں سے مجھے دیکھا

اور ڈوبتی آواز میں بولی۔ ”میں تو اسی وقت ملنے آ سکتی ہوں آپ کو۔ میرے میاں تو یہاں نہیں

میں نا۔ اس لیے شام کو آنے کا سوال نہیں۔ شام کو تو آپ کے ہاں کپل ہی آ سکتے ہیں نا۔ سہیل

”وہ جلدی جلدی چمک لگاتے ہوں گے۔“

”کہاں جی۔ سال میں ایک ماہ کی چٹھی ہوتی ہے۔“

”ہائے۔۔۔ میں ہنس کر بولی۔ ”سال کے گیا رہ جیئے۔۔۔۔۔ انتظار ہی میں گزار دینا ہے آپ؟“

اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک بالکل نہیں تھی۔ موت کا کچکا

دپنے والا سکوت تھا۔ وہ بولی۔ ”انتظار ہی زندگی ہے۔“

میں نے دانستہ اس تکلیف دہ موضوع کو بدل دیا۔ اس سے پوچھا۔ ”آپ کا بیٹا کیا نام

بتایا آپ نے؟“

”کوکب۔“

”ہاں کوکب۔ کس کلاس میں ہے؟“

”کلاس ون میں۔“

”میرا نونل بھی کلاس ون میں ہے۔ نیل کلاس ٹو میں۔“

”کس اسکول میں داخل ہوئے ہیں بچے؟“

”سینٹ انجینیئر میں۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”کوکب بھی وہیں پڑھتا ہے۔“

”اچھی بات ہے۔ بچے بہت خوش ہوں گے۔ میرا نونل تو بڑی جلدی دوستی کر لیتا ہے۔“

”کوکب بھی ایسا ہی ہے۔“

شانو چائے لے آیا۔ ٹی کوزی ایک سیٹ کی فیکن دو مرسکے پیٹیں اور کپ

اور۔۔۔۔۔

میں نے معذرتانہ انداز میں کہا۔ ”رنگ برنگے برتنوں میں کھاپی رہے ہیں ہم لوگ

ابھی برتن وغیرہ سب پیک ہیں۔“

”کوئی بات نہیں۔ ہفتہ دو تو ابھی لگیں گے گھر سیٹ کرنے میں۔ آپ کہیں تو میں

بھائی اور آپ سے ملنے :

”کوئی بات نہیں“ میں نے ہنس کر کہا۔ اس کی بات سے جانے کیوں مجھے دلی دکھ ہوا۔ لیکن دکھ کی بات تو نہیں تھی۔ ظاہر ہے اس کامیابیوں میں نہیں۔ اور وہ اکیلی کسی کے ہاں کام کرنے اسی وقت ہی آسکتی ہے۔ ایٹی کیٹ یہی تھے۔ اور وہ اتنی سلجھی ہوئی تھی۔ ایٹی کیٹ کا پاس کرنا ہکا تھا اسے۔

فضا پھر بوجھل سی ہو گئی تھی۔ اس لیے میں نے پھر ٹاپک بدل دیا۔ ہنس کر بولی: ”دیکھو تو۔ اتنی دیر سے ہم بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کا نام تک نہیں پوچھا۔ آپ کا نام؟“

سنبل ہنس سنبل عارف۔ عارف مجھے سنبلی کہتے ہیں۔“

میں مسکرا کر بولی ”صرف عارف کا حق ہے سنبلی کہنے کا۔ یا کوئی دوسرا بھی استعمال کر سکتا ہے؟“

”حق تو ان ہی کا ہے۔ ویسے چاہیں تو آپ بھی سنبلی کہہ لیں۔“ وہ پہلی بار کھل کر مسکرائی: ”اے بھی سنبلی کہتی ہیں۔“

”لگتا ہے آپ اپنی امی کی اکلوتی بیٹی ہیں۔“

”یہ کیسے جانا“

”بس یہی محسوس ہوا باتوں سے“

”میرے دو بھائی ہیں۔ دونوں امریکہ میں سیٹیل ہو گئے ہیں بہن میں ایک ہی ہوں۔ سوانحی کی اس لحاظ سے اگلوٹی اور اس لحاظ سے بھی کہ بھائی برسوں بعد آتے ہیں۔ پھر چلے جانے میں یقین کریں فون بھی سالوں بعد کرتے ہیں۔“

”پھر تو میں نے ٹھیک کہا نا کہ آپ اکلوتی ہیں“

”و بالکل میں اور امی ماں بیٹی بھی ہیں۔ دوست بھی مونس و غمگسار بھی۔“

”آپ کے والد“

”فوت ہو گئے ہیں دو سال ہوئے ہیں۔ اُمّی بس بکھر کر رہ گئی ہیں۔“

”وہ تو ظاہر ہے۔ رفاقت ٹوٹ جائے تو ایسا ہوتا ہی ہے۔“

”نہیں ہونا چاہیئے نا۔“ اس نے اتنے زوردار لہجے میں کہا کہ میں اس کا منہ تکنے لگی۔ اس کے چہرے کی رنگت بدل گئی تھی۔ آنکھوں کی بے جان کیفیت جاندار ہو گئی تھی۔ وہ بحث کرنے کے موڈ میں نظر آنے لگی تھی۔ بولی: ”اب امی یہ سمجھ لیں۔ یہ بات ذہن میں بٹھالیں کہ ابو میرے نہیں زندہ ہیں۔ تو اس میں ہر ج کیل ہے“

وہ اس طرح بے معنی اور لابیعی باتیں کہنے لگی کہ مجھے اس کی دماغی صحت پر ایک لمحہ کو شک سا ہوا۔

میں نے بات ختم کرنے کے لیے ہنس کر کہا: "آپ کی چائے ٹھنڈی ہو گئی، لائیں اور بنا دوں!"  
 "بس ٹھیک ہے شکریہ" اس نے کہا اور پھر اپنا نظریہ بیان کرنے لگی۔ اس نے چند باتیں ہی  
 کہیں کہ میں مسکرا کر بولی: "چھوڑیے سنبل اس بحث کو۔ ہاں تو آپ نے میرا نام تو پوچھا ہی نہیں!"  
 "سوری" اس نے کہا۔ "واقعی۔ ہاں تو آپ کا نام"

”کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے مذاق کیا۔

”وہ برجستہ بولی۔ مسز سہیل“

اس کی حاضر و ماضی پر میں مسکرا اٹھی۔ میرے ذہن میں جو اس کی دماغی صحت کے بارے میں شک گزرا تھا۔ میں اس پر دل ہی دل میں نام نہاد ہوتی۔

”میرا نام رابعہ سہیل ہے۔“ میں نے چائے کی پیالی واپس رکھتے ہوئے کہا۔

”پیارا نام ہے“

”پیارا تو نام ہے۔ تمہاری طرح تمہارا نام بھی پیارا ہے۔“

”میں پیاری ہوں؟“ وہ ہنس پڑی۔

”بہت . بہت زیادہ“

”ایسے ہی راہدہ جی“

تمہارے ہاں تو صبح کے وقت ہی آسکتی ہوں ناہیں نے کچھ کہا نہیں۔ وہ خود ہی مسکرا کر بولی: "چلو معاف کیا؟"

"شکریہ سنبی۔ تم بہت اچھی ہو۔"

"خیر اتنی اچھی بھی نہیں۔ وہ مسکرا رہی تھی اور ہاتھ میں کپڑا کارڈ جھلا رہی تھی۔

"کیوں؟"

"کیوں کہ دیا سوکہ دیا۔"

"پھر بھی کیوں۔ کیوں اتنی اچھی نہیں تم؟"

اس نے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنس کر کہا: "دراصل میں اتنے دن یہاں تھی ہی نہیں"

"ہاں؟"

"اچھا ہی ہوا۔ تمہارے ہاں میں آئی نہیں؟"

"ابجائیں تو گھر میں نوکر اور نوکرانی ہی ملتے؟"

"کہاں گئی ہوئی تھیں؟"

"امی کو لینے۔ پنڈی۔ ماموں کے ہاں گئے انھیں دوپہنے ہو گئے تھے۔"

ہم دونوں ڈرائیونگ روم میں آ بیٹھیں۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ کر کے پر ڈالی۔

"اچھا ذوق ہے تمہارا؟" اس نے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے انجانا سا فخر محسوس کیا۔

"ہو گیا پورا گھر سیٹ؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں کچھ سو ہی گیا ہے۔"

"آپ کے بچے کہاں ہیں۔ آج تو چھٹی ہے گھر پہ ہی ہوں گے۔"

"نہیں بچ کہہ رہی ہوں۔"

میں واقعی بچ کہہ رہی تھی۔ وہ مجھے بہت پیاری لگی تھی۔ اس کی شخصیت اس کا رکھ رکھاؤ اس کا انداز گفتگو سبھی دلنشین تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اپنے ذوق کی خاتون ہمسایہ میں رہتی ہے۔

چائے کے بعد بھی ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ پھولوں کی باتیں زیادہ کیں۔ مجھے جبرانی ہوئی پھولوں کے متعلق اس کا علم اور تجربہ خاصا وسیع تھا۔

آئندہ ملنے کا وعدہ کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رابعہ آپ تکلف کرتی ہیں۔ چاہیں تو میں روز آجایا کروں گھر سیٹ کرنے میں مدد دینے کے لیے۔ فارغ ہی ہوتی ہوں۔"

میں نے ملازمت سے شکریہ ادا کیا۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اسے گیٹ تک چھوڑنے گئی۔

پندرہ دن میں گھر ہی کی نوک پلک سنوارتی رہی۔ شام کو تھوڑا سا وقت نکال کر میں اور سہیل اپنے ہمسایوں سے ملنے چلے جاتے کبھی ڈائیں ہاتھ والے آجاتے کبھی بائیں والے۔ سامنے کے نیتوں چاروں گھروں سے لوگ آپکے تھے۔ ان سے شناسائی ہو گئی تھی۔

لیکن میں سنبی کے ہاں نہ جاسکی۔ اس کا میاں لوہاں نہیں تھا۔ نہ ہی والد جیانت تھے۔ اس لیے سہیل کا ان کے ہاں جانا موزوں نہیں تھا۔ مجھے ہی جانا تھا لیکن فرصت نہ مل سکی۔

بہتے غم سے کے بعد وہ خود ہی آگئی۔ آتے ہی بے تکلفی سے بولی: "راجو آپ نے میرے ہاں آنے کی زحمت نہیں کی تا؟"

"اوہ سوری۔" میں واقعی شرمندہ ہوئی۔ "بچی روز سوچتی تھی۔ تمہارے ہاں آؤں۔ لیکن وقت ہی نہ مل سکا۔"

"حالانکہ محلے کے ہر گھر میں آپ کو جانے کا وقت مل گیا؟" اس نے ہنس کر گولہ کیا اب میں اسے کسی طور نہ کہہ سکی کہ شام کو فرصت ہوتی ہے اور میں سہیل کے ساتھ ان سب گھروں میں گئی ہوں۔

میرے قابو میں ہی نہیں آتے۔ ابوہی سے ڈرنے اور انہی سے پڑھنے ہیں؟  
اس نے میری طرف دیکھی دیکھی حسرت بھری نظروں سے دیکھا اور بولی "خوش بخت تو آپ  
ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ سُنّی کے سامنے اپنے میاں یا بچوں کے باپ کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔  
اس کا میاں چونکہ دور سے سال بھر بعد آتا ہے۔ اس لیے وہ اس کی کمی شدت سے محسوس کرتی ہے  
وہ ہنڈ منٹ رُکی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھو نا کچھ دیر اور۔ آج تو میں فری ہوں۔"

"پھر آؤں گی۔ مجھے دو چار جگہ کارڈ دینے جانا ہے۔"

میں اس کے ساتھ باہر آ گئی۔ شانو مونو کو پیلے کھڑا تھا۔ گول مٹول سی مونو نے پھولا پھولا  
فرک پسنایا تھا۔ سُنّی بڑی محبت سے اس پر چھپٹی۔ "اللہ کتنی پیاری بچی ہے آپ کی۔ اُف، نظر نہ  
لگ جائے اسے۔ مجھے بیٹیاں بہت پسند ہیں۔ کوکب کی دفعہ میری دلی خواہش تھی کہ بیٹی ہو۔"  
"مگر پڑی ہے ابھی؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "بنا ہوا ہے بیٹی بھی آجائے گی؟"

اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔ مونو کو پیار کر کے شانو کے حوالے کیا۔ اور خدا حافظ  
کہتے ہوئے اپنی گاڑی میں جا بیٹھی۔

پھر وہ خدا حافظ کہتے ہوئے اپنی گاڑی گھبٹانے نکال لے گئی۔ اس نے جاتے سے مجھ پر  
نگاہ ڈالی۔

جانے اس نگاہ میں اتنی اذیت اتنا کرب کیوں تھا۔

میرا دل مسلا گیا۔

اس رات میں نے سہیل سے سُنّی کا ذکر کیا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے بے جان سکوت کا  
بلور خاص ذکر کیا۔

پتہ نہیں وہ سکھی ہے کہ کبھی؟ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"مونو گھر پہ ہے نوفل اور نیل آج خالہ کے ہاں گئے ہیں۔"  
"آج آجائیں گے۔"

"شا کو آجائیں گے۔ کیوں؟"

"میرے کوکب کی برتھ ڈے ہے کل۔"

"اوہ۔ اچھا۔ مبارک ہو۔ کتنے سال کا ہوگا؟"

"پانچویں برتھ ڈے ہے۔ میں تمہارے بچوں کو مدعو کرنے آئی تھی۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "صرف بچوں کو۔ مجھے نہیں۔"

"آپ بھی ضرور آئیں۔" وہ بے چین سی ہوئی۔ اس کی حسین آنکھوں میں وہی موت کا  
سکوت گھلا اور رنگت قدرے پھبکی پڑ گئی۔ جلدی سے بولی۔ "عارف ہوتے تو سہیل بھائی  
کو بھی مدعو کرتی۔ میں ان کے نہ ہونے کی وجہ سے صرف بچوں اور ان کی ماؤں ہی کو مدعو کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے؟"

"آپ نے بڑا تو نہیں مانا؟"

"کس بات کا؟"

"آپ کے میاں کو مدعو نہیں کر رہی؟"

"سُنّی۔ ایسی کوئی بات نہیں جو مناسب بات ہے وہی تم کرتی ہو۔ بڑا ماننے کی کیا بات؟"

"شکریہ؟" اس نے کہا اور کارڈ میرے حوالے کر دیا۔

"میں تو ابھی تک تمہارے کوکب سے بھی نہیں ملی۔ ویسے نوفل نے بتایا تھا کہ کوکب اسی

کی کلاس میں پڑھتا ہے۔"

"ایک ہفتہ امی کی وجہ سے اے بھی اسکول سے چھٹی کرنا پڑی۔ ویسے میں اس کو ریگولر لی

پڑھاتی ہوں۔ میرا بچہ خاصا ذہین ہے۔ میک اپ کر لیتا ہے۔"

"خوش قسمت ہیں۔ جو بچہ آپ سے باقاعدگی سے پڑھتا ہے۔ یہ اپنے نوفل اور نیل تو

سینل سنس کر بولے: "شکھ صرف میاں کی موجودگی ہی دے سکتی ہے عورت کو محترمہ۔ آج میں بھی کہیں چلا جاؤں تو محترمہ بھی دکھی ہو جائیں گی۔"

"اٹھ نہ کرے۔" میں نے کروٹ بدل کر سینل کو کندھے سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ واقعی سنی کا شوہر دود تھا۔ سال میں ایک مرتبہ آکر چلا جاتا تھا۔ پیسہ ظاہر ہے بہت کماتا ہوگا۔ لیکن صرف پیسہ خوشیاں تو نہیں دے سکتا۔

مجھے سنی سے دلی ہمدردی محسوس ہوئی۔ اود میں نے تہیہ کر لیا کہ اس سے ضرور پوچھوں گی وہ اپنے شوہر کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتی۔ پورا سال انتظار کے جان بوجھ انتظار میں کیوں گزارتی ہے۔ ایک مہینے کی چٹنی تو پلک جھپکتے میں گزر جاتی ہوگی۔

اگلی شام میں بچوں کو تیار کر کے کوکب کا تحفہ لے کر سنی کے ہاں گئی۔

سنی کے گھر کے گیٹ میں داخل ہوتے ہی میری نگاہ اس کے لان پر پڑی۔ اتنا خوبصورت لان، میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ مزے یوں تھا جیسے مٹلیں فرش پہنچا ہو۔ رنگارنگ پھول پودے بڑی نفاست سے سجے تھے۔ بیلوں کی اک اپنی شان تھی۔ درخت اتنے اسٹائلش اور دیدہ زیب تھے کہ میں چند لمحے گم صم سی کھڑی نیچر کے اس صحن کو اپنے اندر جذب کرتی رہی۔ سنی کے صحن ذوق سے میں بڑی متاثر ہوئی۔

بچے مجھے اندر جانے کے لیے کھینچ رہے تھے۔ میں ان کے ساتھ پھولدار بیلوں کے چھجوں تلے سے ہوتی برآمدے میں آئی اور ڈرائینگ روم کی طرف بڑھی۔ جہاں کافی جمان آئے بیٹھے تھے۔ ہلکی ہلکی موسیقی فضا میں گھل رہی تھی۔ لوگ باتوں میں مشغول تھے۔ صرف عورتیں اور بچے ہی تھے۔

ڈرائینگ روم اتنے سلیقے اور آئٹسٹک طریقے سے آراستہ تھا کہ ایک باہر میری نظریں اس کے صحن کو جذب کرنے کے لیے چل اٹھیں۔ ڈرائینگ روم کی سچ دیوچ تو سنی کے ذوقِ نظر کی مرہونِ منت تھی ہی۔ لیکن قیمتی نادر اور نایاب اشیاء اس گھرانے کی امارت کا بھی اعلان کر رہی تھیں۔

سنی کسی خاتون سے باتیں کر رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑی تو پلک کر آئی۔ تپاک سے گلے ملی میرے

بچوں کو پیار کیا۔

آج وہ بجد دلکش اور پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس نے انتہائی خوبصورت اور قیمتی ساڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ نفیس سا زیور تھا۔ بال پشت پر کھلے چھوڑ رکھے تھے۔

"بہت حسین لگ رہی ہو۔" میں نے اس کے کان میں اونچی مرگوٹھی کی۔

"یعنی ہوں نہیں۔ لگ رہی ہوں؟" وہ ہنسی۔

"نہیں بھئی یہ بات نہیں۔" میں نے کہا۔

"اجھا آؤ بیٹھو۔" اس نے میرا ہاتھ پکڑا۔

"اپنے کوکب سے تو ملاؤ۔ مجھے اور میرے بچوں کو۔" میں نے کہا۔

"آئیں۔" فوفل نیبل آئیں آپ بھی۔ وہ ہمیں لیے وسیع ڈرائینگ روم کے مشرقی حصے کی طرف لے گئی۔ جہاں پانچ سالہ پیارا سا بچہ اپنے ساتھیوں سے کھیل رہا تھا۔ میرے بچے ایک لمحہ سکرٹس سے سہمے کچھ اجنبیت محسوس کی۔ لیکن دوسرے لمحے وہ اپنے ہم عمر ساتھیوں کی طرف بڑھ گئے۔

"میری امی سے تو آپ نہیں ملی نا؟" سنی نے کہا۔

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"آؤ ملاؤں۔" وہ میرا ہاتھ پکڑے دوسری طرف مڑی۔ جہاں خوبصورت صوفوں میں دھنی اور حیرت انگیز عورتیں۔ بیٹھی گپ شپ لگا رہی تھیں۔

اس نے اک عمر بھاری بھر کم سفید قیمتی ریشمی لباس میں ملبوس عورت کے پاس لے جاتے ہوئے کہا: "امی یہ دالہ ہیں۔ میری نئی دوست۔ آپ سے میں نے ذکر کیا تھا نا نئی نئی یہاں آئی ہیں۔"

میں نے قدرے جھجک کر انہیں سلام کیا۔ سنی کی امی بہت بردبار اور باوقار سی خاتون تھیں۔ سلام کا جواب دیتے ہوئے دعائیں دیں۔ احوال پرسی کی اور بتایا مٹنی تمہاری بہت تعریف کرتی تھی۔

میں ہولے سے مسکرا دی۔

سنی رول رہی۔ "بہت اچھے ہیں یہ۔"

”بس اب اتنا بھی نہ بتاؤ۔ اچھی تو تم خود ہو۔“

وہ ہنس پڑی۔ لیکن میں نے غصہ کیا کہ اس کے ہنسنے کے باوجود اس کی آنکھوں میں وہی سکوت وہی بے جان کیفیت اور وہی جو دہے۔ اس کی امی بھی سوگوار کی دکھائی دیں۔ ان کے چہرے پر شفقت تو تھی۔ لیکن سوگوار کی ایسی گہری چھاپ تھی جو کھلا اعلان تھی کہ خوشی کا سایہ اس کے چہرے پر نہیں پڑھا مجھے سنبی کی بات یاد آگئی۔ جو اس نے پہلی ملاقات میں اپنی امی کے متعلق کہی تھی۔ کہ ابو کے مرنے کے بعد امی بکھر گئی ہیں۔

وہ واقعی بکھری ہوئی تھیں۔ آج کے خوبصورت اور خوش کن موقع پر بھی وہ دل گرفتہ تھیں۔ ایک اگھوٹی بیٹی کے ایک اگھوتے بیٹے کی برتھ ڈے پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے تھا۔ واقعی زندگی کے متعلق بعض لوگوں کا رویہ اس قدر منفی ہوتا ہے کہ وہ اسی کی سیاہ عینک چڑھاتے رہتے ہیں۔ خوشی کی کوئی رقی آنکھوں میں اترنے نہیں دیتے۔

برتھ ڈے بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ ڈائمنڈنگ ہال کی بڑی سی میز پر ایک اور دوڑے لوازمات رکھے تھے۔ پانچ منزلہ لیک پر پانچ موم بتیاں لگی تھیں۔ جھنڈیاں، سنری ٹریاں، اخبار سے پھول ہر طرف لٹک رہے تھے۔ لیک کاٹنے کی رسم ہوئی۔

کوکب نے موم بتیاں ایک ایک کر کے بجھائیں۔ اس کے دائیں ہاتھ سنبی کھڑی تھی، بائیں ہاتھ لیک کے ساتھ عارف کی بڑی سی تصویر پڑی تھی۔ بتیاں بجھتے ہی بتایاں بجیں، بیسی برتھ ڈے گایا گانچے پھولوں اور غباروں پر پل پڑے۔ بڑے نفیس برتنوں والی میز کی طرف بڑھے اور پلٹیں اٹھا اٹھا چریں ان میں رکھ کر کھانے لگے۔ مہمان کافی تھے۔ اتنا بڑا کمرہ بھی تنگ محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے دونوں بچوں کو پلیٹوں میں کھانے بیٹنے کی چیزیں ڈال کر ایک طرف کر دیا۔ خود لیک پیس بیٹے کو بڑھی تو میں نے دیکھا۔ سنبی کے پیچھے کھڑی اس کی امی اپنی آنکھیں رومال سے پونچھ رہی تھیں۔

اس عبادک اور خوشی کے موقع پر آنسو؟

مجھے کچھ سمجھ نہ آئی۔

سنبی مہمانوں کی آؤ بھگت میں لگی تھی۔ میں اس سے کچھ کہہ سُن نہ سکی۔

شام کافی گہری ہو گئی تھی۔ جب میں بچوں کو لے کر واپس آئی۔

چند دن بھی نہ گزرے تھے وہ مجھے ایک اسٹور میں ملی۔ وہ کچھ چیزیں خرید رہی تھی۔ علیک سلیک ہوئی۔

وہ بولی: ”آج میں نے واپسی پر آپ کے ہاں آنا تھا۔ اچھا ہوا آپ یہیں مل گئیں۔“

”خیریت۔“ میں نے پوچھا۔

”میری ویڈنگ اینورسری ہے۔ آپ کو مدعو کرنا تھا۔“

”ویڈنگ اینورسری؟“ میں نے تعجب سے اسے دیکھا۔

”کیوں۔ نہیں ہو سکتی کیا۔“ اس نے مضمحل خیر انداز میں سوال کیا، تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے

سیل مین کے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”جی جی عارف سعودی عرب اور تم یہاں اینورسری مناؤ گی۔“

”اب اس میں کیا قصور کسی کا کہ اینورسری کی تاریخ اس ماہ کی چھبیس ہے۔ اور عارف نے

اگلے ماہ کی انیس کو آنا ہے۔“ اس نے بے پردائی سے کہا۔

”پھر کیا مسئلہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک ماہ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ عارف آجائیں تو منالینا“

”یہی تو مسئلہ ہے۔“ وہ بولی۔

”کیا؟“

”میں اینورسری اسی ڈیٹ پر مناتی ہوں۔ جس پر شادی ہوئی تھی۔“

میں چونکہ دکان میں کھڑی تھی۔ اس لیے بحث میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے اس کی

یہ بات مجھے بہت عجیب لگی۔

”اچھا رابعہ“ وہ اپنا سامان اٹھاتے ہوئے بولی ”جیجیس کی رات ڈنر ہمارے ساتھ کرنا ہوگا۔“

میں ہنس کر بولی۔ ”میں تو اگلے ماہ کی انیس کو تمہارے ہاں ڈنر کرنا چاہتی ہوں۔“

”نہیں رابعہ نہیں۔ پلیر جھبیس کی رات ضرور آنا۔ اور پھر معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں اکہلی ہی کو دعوت دے رہی ہوں۔“

”حالانکہ اینور مری عارف کے ہوتے ہوئے ہونی چاہیے تھی۔ اور میرے ساتھ سہیل کو بھی ڈنر میں شریک ہونا چاہیے تھا۔“

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہی موت کے گھلے سکوت والی نگاہ مجھ پر ڈالی اور باتے کہتے ہوئے اسٹور سے نکل گئی۔

میں نے اس اینور مری کا ذکر سہیل سے کیا۔

”بھئی میں کیا جانوں عجیب و غریب شخصیت ہے تمہاری دوست کی؟“

”کتنی غلط بات ہے۔ اینور مری منانے کا فائدہ۔“

”بالکل! سہیل نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا: شوہر صاحب سعودی عرب

بیگم صاحبہ یہاں اور سالگرہ منائی جا رہی ہے وہ دم دھڑکے سے۔“

”پاگل ہے بالکل۔ سبھی میں ذرا بھی عقل نہیں۔“

”پلو تمہیں کیا اور ہمیں کیا۔“

”لگتا ہے دولت بہت ہے اس کے پاس۔ آئے ون فنکشن کرتی ہے۔ برتھ ڈے تھوڑی شاندار کی تھی۔“

”اینور مری تو اس سے بھی شاندار ہوگی بیگم صاحبہ۔ آپ فنکشن کی نگر چھوڑیں تحفے کا سچیں

وہ تو لے جانا ہی پڑے گا۔“

”بالکل۔ وہ تو ہے۔“

”فنکشن بھی ہوگا۔ دعوت بھی اڑے گی۔ تحائف بھی دیے جائیں گے۔ پھر کتنے ظلم کی بات

ہے۔ محترمہ وہاں ہوں گی اور ہم گھر پر بچوں کی دیکھ بھال کر رہے ہوں گے۔“ سہیل نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”ٹھیک کہا آپ نے۔ لیکن مسئلہ تو یہی ہے۔ عارف صاحب یہاں ہوتے تو آپ بھی ملو

ہوتے۔ اکیلے عورت تو مردوں کو اس فنکشن میں مدعو نہیں کر سکتی نا۔“

اس رات ہم دونوں کافی دیر تک سنبی ہی کی باتیں کرتے رہے اس کے خوبصورت آراستہ پیراستہ گھر سے لے کر اس کی حسین موت کے گھلے سکوت والی آنکھوں تک کا تذکرہ کیا۔ اس کی باقاعدہ باقاعدہ لیکن سوگوارائی کی باتیں کیں۔ سوگوارائی جو اکلوتے نواسے کی برتھ ڈے کے خوشی کے موقع پر بھی چپکے چپکے آنسو پونچھے جا رہی تھیں۔

اتفاق ہی کی بات کہ جھبیس تاریخ کی شام میرے نندوئی کراچی سے آگئے۔ مجھے ڈنر میں شریک ہونا تھا۔ لیکن ان کے آجانے سے مجھے اپنا پروگرام مختصر کرنا پڑا۔

سنبی تے تو سات بجے کا دعوت نامہ دیا تھا۔ اور یہ محفل رات گئے تک جاری رہتا تھا۔ سنبی کی ایک دو سہیلیاں مارمونیم کے ساتھ گانا بہت اچھی لگاتی تھیں۔ سنبی نے مجھے بطور خاص کہا تھا ”ڈنر تو خیر ہوگا ہی۔ گانے کی محفل خوب ہے گی۔“

گانا میری بھی کمزوری تھی۔ میں محفل میں بیٹھ کر گانا سننے کا تصور ہی میں لطف لے رہی تھی۔

لیکن پروگرام بدلتا پڑا۔ حسین بھائی ایک عرصے کے بعد آئے تھے اور صبح انہوں نے پنڈی چلے

جانا تھا۔ اس لیے میں صرف سنبی کو مبارکباد اور تحفہ دینے کے لیے ہی تھوڑی دیر کے لیے گئی۔

کیڈل ڈنر بڑا پُر تکلف اور شاندار تھا۔ کچھ زیادہ خوانین نہیں تھیں لیکن جو تھیں خاص ماڈ

اور امیر کبیر تھیں۔

سنبی آج دلہن کی طرح بھی بنی تھی۔ پھولدار شیشیوں کی بھاری ساڑی پہنی تھی۔ بھاری بھاری

زیور زیب تن تھے۔ بالوں کا خوبصورت جوڑا بنا تھا جس کے گرد مچھلوں کی کھیلوں کے چمکتے ہار پٹے

تھے۔ میک اپ بھی بہت خوبصورت اور گراں تھا۔

میں نے اسے تحفہ بھی دیا اور مبارکباد دیتے ہوئے بولی: ”سنبی میں تمہاری اس حسین محفل میں

شرکت نہیں کر سکتی۔“

”دیکھو؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ میری کلائی پر تھپتھپاتی ہوئی۔ اس کی آنکھوں کی بے جان دیوانی



اور گری ہو گئی

اس ویرانی کو دیکھ کر جی چاہا کہ دوں۔ ایسے بھی کیا اصول کہ اسی تاریخ کو اینورسری منانا تھی۔ تم جتنا مس کر رہی ہو نا عارف کو وہ تمہاری ان اداس اور بے جان ویران آنکھوں سے ظاہر ہو رہا ہے۔

لیکن میں نے یہ بات نہیں کہی۔ اور واپسی کی اجازت چاہی۔

”رابعہ نہیں۔ تم نہیں جاؤ گی۔“

”پگلی۔ میرا جی تو بہت کر رہا ہے۔ لیکن مہمان آگئے ہیں۔ مہمان بھی سسرالی، خواجہ تہا باتیں بنیں گی۔ حسین بھائی اچانک ہی آگئے ہیں۔ نہ اتنے تو میں رات بھر تمہارے پاس رہتی۔ پھر میں نے ہنس کر کہا۔ ”آج اتنی حسین لگ رہی ہو۔ عارف ہوتے تو۔“

میں نے ہنسنے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کی آنکھوں کا سکوت لمحہ بھر کو دہم بہم ہوا۔ لیکن وہ مسکرا دی۔ مجھے تو لگا تھا۔ پھسک سے رو دے گی۔ لیکن وہ مسکرانے لگی تھی۔

میں نے اس سے کلائی چھڑائی۔ جی تو واقعی نہیں کر رہا تھا کہ یہ دعوت نہ اڑاؤں اور محفل موسیقی میں شرکت نہ کروں۔ لیکن کیا کرتی۔ مجبوری تھی۔ واپس لوٹ آئی۔

آج ان عورتوں میں مجھے سنبی کی امی نظر نہیں آئیں۔ شاید وہ کسی اور کمرے میں تھیں۔

اس رات کے بعد میں تقریباً حمید بھر سنبی سے نہ مل سکی۔ اگلے ہی ہفتے مجھے امی کی بیماری کی وجہ سے ان کے ہاں جانا پڑا۔ دو ایک دفعہ گھر بچوں کو دیکھنے تو آئی۔ لیکن سنبی کے ہاں جانے کا وقت نہ ملا۔

اور

وہ

انتیس کی شام تھی۔ میں بازار سے واپس لوٹ رہی تھی۔ سبیل ڈرامیو کر رہے تھے۔ اور میں اُن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اپنی اسٹریٹ میں داخل ہونے کو تھے کہ سامنے سے سنبی کی گاڑی آگئی۔

”ذرا روکنے گا۔“ میں نے سبیل سے کہا۔

”کیوں؟“ وہ بولے۔

”سنبیل کی گاڑی ہے سامنے۔ بڑے دن ہوئے اسے دیکھا نہیں۔ ذرا علیک سیک ہو جائے۔“ سبیل نے گاڑی روک دی۔ سنبیل بھی مجھے دیکھ چکی تھی۔ اس نے گاڑی کے ساتھ گاڑی کھڑی کرتے ہوئے بڑے نپاک سے مجھے پکارا۔ سبیل بھی آج اس سے ملے۔

”اتنے دن کہاں غائب رہیں؟ اس نے پوچھا۔“

”امی کے ہاں تھی۔ بہت بیمار تھیں وہ۔ خدا کا شکر ہے اب ٹھیک ہیں۔“

”خدا انہیں صحت دے۔ میں دو تین دفعہ آپ کے ہاں آئی۔“

”ہاں شیداں نے بتایا تھا۔“

”اور سب ٹھیک ٹھاک۔“

”بالکل۔“

اس نے گھٹری دیکھی۔ میں نے پوچھا ”کہاں جا رہی ہو؟“

”ایئر پورٹ۔“

”کوئی آ۔۔۔۔“

”میا د نہیں آج انتیس تاریخ ہے۔“ وہ بڑے دلفریب انداز میں مسکرائی۔

”آج عارف آرہے ہیں۔“

”اوہ۔ واہ۔ مبارک ہو بھئی۔ انہیں لینے جا رہی ہو۔“

”ہاں“ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

”جاؤ بھی جاؤ۔ لیٹ نہ ہو جانا۔“ میں نے کہا۔

”اچھا خدا حافظ۔“ اس نے اسٹیرنگ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”عارف آئیں۔ تو نے کراتا ہمارے ہاں۔“ میں نے اس کے گاڑی نکالتے نکالتے کہا۔

”سنہی عارف کے ساتھ ضرور آئے گی۔

لیکن وہ نہیں آئی۔

تیسرے دن بھی نہیں آئی۔ میں نے یہی سمجھا کہ سال بھر کی جدائی کاٹی ہے۔ اب وہ وطن کی گھڑیاں کہاں ضائع کرنے کے متحمل ہوں گے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے عزیزوں کو ملنے چلے جاتے ہوں۔

لیکن جب سات آٹھ دن گزرنے پر بھی وہ نہ آئی۔ تو میں نے سہیل سے کہا۔

”سنہل اور عارف ہمارے ہاں آئے نہیں۔ شاید سنہی چاہتی ہے مدعو کریں“

”ہات ویسے ہے تو ٹھیک“ سہیل نے کہا۔ گو پہلے انہیں ہیو ہیلو کرنے آنا ہی چاہیے تھا پھر بھی تمہیں ان دونوں کو مدعو ضرور کرنا چاہیے“

”میں کل ہی دعوت دے آؤں گی“

”کل رات کا کھانا کرلو۔ کچھ اور لوگوں کو بھی بلا لیں گے۔ محلے کے دو تین لوگ بھی آجائیں گے اچھی گیند رنگ ہو جائے گی“

”بالکل ٹھیک۔ لیکن کل رات نہیں پرسوں رات اتنے آدمیوں کا کھانا بنانا پڑے گا۔ کل

سالانہ کھانا بناتے چیزیں لانے ہی گزرے گا“

”ٹھیک ہے۔“ سہیل نے کہا۔

میں اور سہیل، عارف اور سنہی کے اعزاز میں دیئے جانے والے ڈنر کا مینو اور لوگوں

کی فہرست بنانے لگے۔

کوئی بارہ چودہ لوگ بنے۔

میں نے پرنٹ کلف کھانے کا مینو بنایا۔ ویسے بھی سنہی کے ہاں برتھ ڈے پارٹی اور

کینڈل ڈنر کی آن ہاں دیکھ چکی تھی۔ کچھ نہ کچھ بل بری کے لیے مجھے بھی کرنا تھا۔

دوسرے دن کام سے فارغ ہو کر دس ساڑھے دس بجے تیار ہو کر میں سنہی کے ہاں گئی۔

”مزور۔ مزور“ وہ خوشی سے بولی۔ ”سہیل بھائی سے ملیں گے وہ“

”مزور“ سہیل نے کہا۔ پھر خدا حافظ کا تبادلہ ہوا۔ وہ آگے نکل گئی۔ ہم اسٹریٹ میں لگے۔

”کیسی ہے سنہی“ میں نے سہیل سے پوچھا۔ سنہی اس وقت کے لیے آسانی لباس میں تھی۔

ہلکا ہلکا میک اپ کیا ہوا تھا۔ بدست ہی اچھی لگ رہی تھی۔

”اچھی ہے“ سہیل نے کہا۔ ”ہاں اس کی آنکھیں“

”کیسی ہیں“ میں نے بے صبری سے کہا شاید شعوری طور پر میں نہیں چاہتی تھی کہ سہیل سنہی

کی آنکھوں کی تعریف کریں۔

وہ بوسے۔ ”یوں لگتا ہے دکھ اور درد کو گوندھ کر اس کی آنکھیں بنائی گئی ہیں“ میں ہنس پڑی

”پتہ نہیں کیوں“ میں نے سر ہلایا۔ ”واقعی اس کی آنکھوں میں دکھ جم گیا ہوا لگتا ہے جالانکہ

سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے“

”کچھ نہ کچھ تو خرابی ہوگی۔ شوہر کا سال بھر انتظار کرتی رہتی ہے۔ یہ کوئی خوشگوار تجربہ ہے“

”جانے اس کے ساتھ کیوں نہیں جاتی“

”ہو سکتا ہے یہیں کوئی گڑبڑ ہو“

میں نے کہا۔ ”بظاہر تو نہیں لگتی کوئی گڑبڑ۔ سب ٹھیک ٹھاک ہی لگتا ہے۔ دیکھو نا اسے

لیٹے جا رہی ہے ایئر پورٹ“

”ہوں“

میں ہنس پڑی۔ سہیل کی طرف دیکھا۔ سہیل بھی مسکرائے اور بوسے۔ ”دیکھو نا تمہاری“

آنکھیں ماشاء اللہ کیسی چمک رہی ہیں ہنس رہی ہیں۔ ہم جو پاس ہیں تمہارے جن کے شوہر پاس

نہ ہوں۔ ان کی آنکھوں میں درد و کرب ہی بسا کرتا ہے“

ہم باتیں کرتے گھر آ گئے۔

دوسری شام مجھے سنہی کا انتظار تھا۔ میں نے سہیل کو بھی کہیں جانے نہ دیا۔ خیال تھا۔

کے عالم میں بولی: "آئی آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ عارف..."

"عارف اس دنیا میں کہاں ہے بیٹی"

مجھے اک جھکا سا لگا۔ گھبرا کر بولی: "کیا۔ کیا کوئی حادثہ ہو گیا ہے کیا؟"

"آج نہیں چار سال پہلے ہوا تھا۔" انہوں نے اک گہری سانس چھوڑی۔

"عارف نے انتیس کو میاں آنا تھا۔ لیکن ریاض میں ایئر پورٹ پر پہنچنے سے پہلے ہی گاڑی

کے حادثے میں ختم ہو گیا تھا۔"

"لیکن لیکن،" میرے منہ سے ڈھنگ کا کوئی لفظ نہ نکل سکا۔ اس کی امی نے کچھ پر ہاتھ

رکھ لیا۔ ان کی آنکھوں کے گوشے گیلے ہو گئے۔ دکھ سے ڈوبتی آواز میں پوچھیں۔

"ہملا دے ہی میں بیٹی۔ سنبی ان ہوا دوں کے سہارے ہی جم رہی ہے۔ عارف بہت پیارا

انسان تھا۔ دونوں میں بچپن کی دوستی اور پیار تھا۔ کوکب کی پیدائش کے بیسے سنبی پاکستان آئی

تھی۔ کچھ بیمار پڑ گئی۔ جس کی وجہ سے وہاں جانا نہ سکی۔ پورا ایک سال اس نے جس طرح انتظار

میں کاٹا۔ تمہیں کیا بتاؤں بیٹی۔ انتیس کی شام اس نے ایک ماہ کی چھٹی پر میاں آنا تھا۔ اور سنبی

کو ساتھ لے جانا تھا۔"

وہ چند لمحے کہیں۔ میں آنکھیں پوری کی پوری کھولے صرف انہیں دیکھ گئی۔

"سنبی ایئر پورٹ اسے لینے گئی۔ لیکن وہ اس دنیا میں ہوتا تو آتا۔ چند دن بعد اس کی لاش

آگئی۔ وہ آنکھیں رومال سے صاف کرتے ہوئے بولیں: یہ بات نہیں کہ سنبی نے اس کی موت کو

تسلیم نہیں کیا۔ لاش اس کے سامنے آئی۔ کفن دفن سب کچھ اس نے آنکھوں سے دیکھا۔ غم سے

نڈھال بھی ہوئی۔ غش پر غش آئے۔ بیمار بھی پڑ گئی۔"

میں نے سر متھیل پر ٹکالیا۔ مجھ میں تو کوئی سوال کرنے کی ہمت ہی نہ رہی تھی۔

وہ خود ہی بولیں: "میری بد نصیب بچی نے اک انوکھا ہی فلسفہ گھڑ لیا۔ اپنے ذہن میں

مہ بات بٹھالی کہ عارف سعودی عرب ہی میں ہے اور اسے اس کا انتظار کرنا ہے۔ اسی طرح جس

بلے چوڑے شکوے کا پروگرام تھا۔ اس کے بعد کھانے کی دعوت دینا تھی۔

اس کے خوبصورت لان پر تھیں بھری نگاہیں ڈالتے میں آگے بڑھ گئی۔ اور برآمدے میں آ

گئی۔ جس پر چھیلوں سے لدی سیلوں کے کچھ جھکے ہوئے تھے۔

لاؤنج کی شیشے کی دیوار کے پردے سمٹے ہوئے تھے۔ اور ایک صوفے پر اس کی آبی بیٹی تھیں۔

ان کی لاؤنج بھی ڈرائنگ روم ہی کی طرح سجی تھی۔ سنی پلانٹ اور بڑا پلانٹ اور کیکس کی

کئی اقسام کے پودے لاؤنج میں تازگی کا احساس بھر رہے تھے۔

"آؤ بیٹی! میرے سلام کے جواب میں انہوں نے بڑی شفقت سے کہا۔ ان کا خوبصورت

چہرہ آج کچھ زیادہ ہی سوگوار لگا مجھے۔

رسمی سی احوال پرسی کے بعد میں نے سنبی پر اپنی دوستی کا پورا اہتمام جاتے ہوئے مصنوعی

عفوتے سے کہا: "کہاں ہے سنبی۔ اتنے دن سے انتظار کر رہی ہوں کہ عارف کو لے کر آئے گی۔

"ہمارے ہاں۔ لیکن..."

"عارف..." اس کی امی نے اک گہری آہ بھری۔

"ہے کہاں سنبی کی بچی؟ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہو پٹیل۔" وہ دکھ سے جیسے کراہیں۔

"کیا؟" میں عفتہ وہ بھول گئی۔ جلدی سے بولی "خیریت تو ہے"

وہ گہری ٹھنڈی سانس چھوڑتے ہوئے بولیں: "ان دنوں۔ ہر سال وہ چند دن ہسپتال

میں ایڈمٹ ہوتی ہے"

"میں۔ میں کچھ سمجھی نہیں۔" میں نے ان کی طرف تجسس سے دیکھا۔

وہ دکھی آواز میں بولیں: "سنبی نے تمہیں کچھ سمجھنے کا موقع ہی کب دیا ہوگا۔ میری

بد نصیب بچی!"

میں صوفے سے اٹھ کر ان کے پہلو میں بڑے صوفے پر آ بیٹھی۔ ان کا بازو پکڑ کر پریشانی

## چاہتیں کیسی

طرح سال ہر کیا ہے۔ سارا سال وہ پہل پہل انتظار کی کوفت و لذت سے دوچار ہوتے گزارتی ہے یہ سوچ آنے ہی نہیں دیتی کہ وہ اس دنیا میں نہیں۔ اسی لیے زندگی سے پوری طرح بے گناہ کرتی ہے۔ ہر کام میں جھڑپ لیتی ہے۔ گھر کی دیکھ بھال بچے کی تعلیم و تربیت اس کی برتھ ڈے اور اپنی شاؤ کی سالگرہ دھوم دھماکے مناتی ہے۔ میرا کلچر کتنا ہے بیٹی۔ لیکن کیا کروں۔ اس کا ساتھ دینے جاتی ہوں۔ وہ سانس لینے کو کہیں۔ پھر بولیں: ہر سال انتہی کی شام کو وہ عارف کو ایئر پورٹ لینے جاتی ہے۔ اور گیلی واپس لوٹ آتی ہے۔ اس دن اس کے صبر و ضبط کے بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ سال بھر دل کو دیے جانے والے ہلاؤں کا حوصلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ بالکل بکھر جاتی ہے۔ اس طرح کہ اسے پھر سے مجتمع کرنے کے لیے ہوسپٹل میں ایڈمٹ کروا کے ڈاکٹروں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

وہ بول رہی تھیں اور میری ہتھیلیاں آنسوؤں سے جھگی جا رہی تھیں۔ میں سسکیوں میں رونے لگی۔ تو انہوں نے میری پشت پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ”تمہیں اس کی روداد سن کر یقیناً دکھ ہوا ہے۔ لیکن خدا کی یہی رضا ہے۔ سبھی چند دنوں تک گھرا جلتے گی۔ ٹھیک ہو کر پھر سے عارف کے انتظار میں لمحوں کو دھکیکنے کے لیے ان ہلاؤں میں لگ جائے گی۔ بالکل نارمل ہو کر۔ سارا دکھ ساری کوفت آنکھوں میں جو جمع کر لیتی ہے۔

وہ جانے کیا کہتی رہیں۔ میں آنسو دوپٹے کے آئینل سے پونچھتے ہوئے سنبی کی آنکھوں میں موت کے سکوت کے گھلاؤ کا راز جان کر دکھی ہونے لگی۔

رات میں جب یہ سارا سانس سنبی کے گوش گزار کر رہی تھی تو بھی ناز و قطار رو رہی تھی۔ سنبیل بھی سنبی کے عجیب و غریب فلسفے سے متاثر ہوئے تھے۔

اک رنجیدہ سی سانس لیتے ہوئے بولے۔

”کیا کیا فریب دل کو دیے اضطراب میں، والی بات ہے۔“

”عجیب و غریب کردار ہے۔ میں نے ان سے کہا۔

”عجیب و غریب۔ لیکن واجب الاحترام اور انتہائی عظیم۔ سنبیل نے پھر غلوں سے کہا۔ اور میں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

یہ سنبی کی شخصیت اور کردار کو خراج عقیدت تھا۔

حسن کی رعنائی اور دلکشی کو جانچنا یا پرکھنا محسوسات کی ڈوری سے بندھا ہوتا ہے۔ فضا میں کتنی ہی رنگینی ہو۔ ماحول میں کیسی ہی خوبصورتیاں رحی سبیا ہوں۔ اور گرد و پیش میں کتنا ہی فصول پھیلا ہو۔ انسان ان سب سے اس وقت تک متاثر نہیں ہوتا۔ جس وقت تک اس کے اندر انہیں جانچنے پر کھنکھنے اور محسوس کرنے کی انگلیوں کا پھیلاؤ نہ ہو۔ شوق اور زندہ دلی نہ ہو، من میں سکون ہو تو ہر چیز ہنستی مسکراتی لگتی ہے۔ خوب صورت شاداب اور رعنائیوں سے بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ فضا ماحول اور گرد و پیش کا نکھر اپنی اپنی آپ متاثر کرنے لگتا ہے۔ جی اس رعنائی اور شادابی میں ڈوب ڈوب جانے کو چلتا ہے۔ اس نکھرے حسن کو من میں سمو لینے اور احساس کی قیدیں جکڑ لینے کو من چاہتا ہے لیکن ہر طبیعت میں الجھاؤ ہو۔ ذہن بے چین ہو۔ من تفکرات کے گھیرے میں ہو۔ تو نہ فضا کا حسن متاثر کرتا ہے۔ نہ ہی ماحول کی خوب صورتیاں دکھائی دیتی ہیں۔ جی ان سے اوجھ اوجھ جاتا ہے۔

اس رات بھی موسم بے حد حسین تھا۔ بارش اب تھم چکی تھی۔ آسمان دھل کر نکھر آیا تھا۔ بدلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر آوارہ چہرہ ہی تھیں۔ سینہ چرخ پر چاند ستاروں سے آنکھ پھولی کھیل رہی تھیں۔ کبھی سمٹ کر غائب ہو جاتیں۔ تو دھلی ہوئی چاندنی ہر شو پھیل جاتی اور کبھی پھیل جاتی تو ستاروں کی چمکتی آنکھیں ردا... اور دھل جاتیں۔

یہ دو دن کیسے گزرے تھے۔ زوبی اور شہباز ہی جانتے تھے۔

اداب گھڑی کی سونیاں دس بجے کی طرف مرک رہی تھیں۔ فیصلہ کن لمحہ ہوئے ہوئے قریب آ رہا تھا۔ اور دونوں کے دل کبھی تھم تھم جاتے اور کبھی گھڑی کی ٹک ٹک سے ہم آہنگ ہو کر دھڑکنے لگتے۔

ان کی شادی کو ابھی صرف تین ماہ ہوئے تھے۔ جنوں فیروز خونیوں اور بہار آفرین مسرتوں کے دن جیسے پلک جھپکنے گزر گئے تھے۔ دو ماہ تو دونوں گھومتے پھرتے ہی رہے تھے۔ ماہِ عمل کی دلفریبیوں میں جکڑے آزاد پرندوں کی طرح کبھی کاخان، کبھی سوات اور کبھی مری کے مریزاروں میں اڑتے پھرتے تھے۔ دس پندرہ دن زوبی کے مئی، پیا کے خوب صورت گھر میں گزارے تھے۔ دوستوں رشتہ داروں کی دعوتیں ہی ختم نہ ہو پاپی تھیں۔

مہینہ بھر پہلے ہی دونوں اس گھر میں آئے تھے شہباز خاں تے نین بیڈروم کا یہ خوبصورت بنگلہ کمرائے پہ لیا تھا اور زوبی کی باذوق ممتی نے ان کی عدم موجودگی میں اسے نفاست سے سجایا تھا۔ وہ اس گھر میں آئے تھے تو گھر گریہ مستی کی ہر چیز موجود تھی۔ کچن خانہ ماں کے پُرد تھا۔ گھر کی دیکھ بھال کے لیے معمر نوکرائی موجود تھی۔ ہر کمرہ آراستہ پیراستہ تھا۔ نفیس ذوق کی علامت تھا۔

دونوں اپنے نئے گھر میں اگر بہت خوش تھے۔

لیکن یہ خوشیاں دیر پا نہ تھیں۔

دو دن پہلے خان بابا کا فون آیا تھا۔ اور یہ خوشیاں اس فون سے بے موت ہی مر گئی تھیں۔ دو دن بڑے کرب اور بڑی اذیت میں گزرے تھے۔ زوبی نے رور و کر بڑا حال کر لیا تھا۔ شہباز گل بھی پہلے بھڑکا تھا۔ زوبی کو بازوؤں میں بھر بھر کر تسلیاں دی تھیں۔ اٹوٹ وعدوں کا یقین دلایا تھا۔ لیکن جوں جوں سوچا تھا۔ مایوسی اور پریشانی نے گھیرا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ دو دن کی جہلت کا کوئی مطلب نہیں۔ کوئی

ہواؤں کا زور بارش ختم ہونے کے ساتھ ٹوٹ چکا تھا اور اب ہونے ہوئے دھیرے دھیرے پھوار کا لطیف بوجھ... اٹھائے چل رہی تھیں پھولوں کی دھبک اس پھوار میں رچی بسی تھی۔ جب یہ مترنم ہوائیں سرسرتے ہوئے کھڑکی کے پردوں سے چھیر چھاؤں لگتی تھیں۔ تو پھوار کا ہلکا سا ریلا فضا میں پھولوں کی.... دھبک بکھیر دیتا۔ کمرے کی فضا مترنم اور متبسم ہوا لگتی۔

لیکن

موسم کی خوب صورتی اور حسن کا اس وقت زوبی کو احساس ہو رہا تھا نہ شہباز خان کو۔ زوبی نرم و گداز بیڈ پر چرت پڑتی تھی۔ آراستہ پیراستہ خوابگاہ میں گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ روشنی اندھی لگ رہی تھی۔ ان گنت سوچوں نے ذہن کو جکڑا ہوا تھا۔ لمحوں لمحوں کے وقفوں سے اس کے نازک سے وجود کو جھٹکے لگ رہے تھے۔ اندر ہی اندر جیسے جھکیاں ٹوٹ رہی ہوں۔ سسکیاں دم توڑ رہی ہوں اس کا پُرکشش خوب صورت چہرہ پریشانی اور اداسی سے دھندلا رہا تھا۔ وہ کھلی آنکھوں سے ٹوٹے بکھرے اورا جڑتے پسینے دیکھ رہی تھی۔ کچھ مئی حال شہباز کا بھی تھا۔

وہ خوابگاہ میں ٹہل رہا تھا۔ کبھی ٹہلے ٹہلے رک جاتا... سوچنے لگتا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا پھلا جا رہا تھا۔ وہ گرلنڈیل، خوب صورت اور باوقار سانو جوان حالات کے سامنے جھک جاتے کی کیفیت سے دوچار دکھائی دے رہا تھا۔

اور اس کی اسی کیفیت سے زوبی کے وجود کے اندر موت کی لپکیا ہٹا اتر رہی تھی۔ وہ بے جان سے جیسے کی طرح بیڈ میں بے حس و حرکت پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں متوہم تھیں۔ لیکن اب ان میں آنسو نہیں تھے، سارا پانی بہہ گیا تھا۔

دونوں کے دل وقت کے ساتھ ساتھ جیسے دھڑکنے بھولتے جا رہے تھے۔ گہبے گہبے دونوں کی نگاہیں وال لاک کی طرف اٹھتیں اور پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھے فون پر جا لگتیں۔

خان بابا نے شہباز گل کو دو دن کی جہلت سوچنے کو دی تھی۔

اور آج رات دس بجے انھوں نے فون پر اس کا آخری فیصلہ سننا تھا۔

فائدہ نہیں۔ کوئی اہمیت نہیں۔

دو دن بعد بابا وہی فیصلہ سننا چاہیں گے۔ جو انہوں نے کیا ہے۔

شہباز خان نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے اک نگاہ زدنی پر ڈالی۔ جلتا ہوا سگریٹ جھک کر آئیش ٹرے میں مسلا۔ دونوں ہاتھ... پیچھے باندھ کر سیدھے کھڑے ہو کر کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہے۔ لیکن کوئی موزوں لفظ ہی نہ ملا جیسے۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ وہ صوفے پر بے جان سا ہو کر گر گیا۔ کہنی صوفے کے بازو پر لکاتے ہوئے سر ہاتھ پر گر دیا۔ سوچوں کا بہاؤ اسے بہت پیچھے لے گیا۔

اس کا تعلق سرحد کے ایک معتبر اور معزز خاندان سے تھا۔ چار سہ کے اک نواحی گاؤں میں اس کے دادا خوشحال خان کی بہت بڑی حویلی تھی۔ وہ اپنے علاقے کے مانے ہوئے رئیس تھے۔ بے شمار سونا اگلی زمینیں تمعیں باغات تھے، مکانات تھے، جہرے تھے ان کا دبہ اور رعب آتا تھا کہ کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ علاقے کے چھوٹے بڑے تنازعات ان کے جہرے میں حل ہوتے، جہرے وہیں بیٹھتے۔ ان کا فیصلہ صرف آخر تسلیم کیا جاتا۔ کبھی کسی نے ان کے سامنے ان کے فیصلے میں رد و بدل کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ایک دفعہ ایک سر پھرے چھوٹے زمیندار نے ان کے فیصلے پر معمولی سی تنقید کی تھی۔ تو تلواریں چٹنے میانوں سے باہر آ گئے تھے۔ خوشحال خان کے دیروں اور جانثاروں نے صرف مخالفت کرنے والوں ہی کو نہیں اس کے سارے خاندان کو گولیوں کی بوچھاڑ میں موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اس پہلے اور آخری واقعے نے خوشحال خان کے خاندان کی ہیبت اور دبہ لوگوں کے دلوں پر بٹھا دیا تھا۔

خوشحال خان اپنے علاقے اور اپنی حویلی پر اک بے تاج بادشاہ کی طرح حکمرانی کرتے تھے۔ ان کے دونوں بیٹے دلبر اور صبور اور ان کی بیوی آغا بی بی سبھی انہیں اپنا مکرل تسلیم کرتے تھے۔ آغا بی بی کو تو کبھی ان کی کسی بات سے اختلاف ہوا ہی نہیں تھا۔ وہ جو کہتے

آغا بی بی سر تسلیم خم کر دیتی۔ اسی لیے وہ اس بے تاج بادشاہ کی طرح تھی۔ گھر کی لڑکیاں باندیاں، نوکرا، عزیز رشتے دار مزارع سبھی خوشحال خان کی اس چستی بگیم کی بھی اسی طرح عزت کرتے تھے۔ وہ بھی تو خان ہی کی زبان بولتی تھیں نا۔ گھر کے ماحول اور فضا کا اثر بھی تھا اور آغا بی بی کی تربیت بھی تھی۔ دلبر خان اور صبور خان بھی باپ ہی کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ بات ایک بار زبان سے نکل جاتی تو پتھر پر لکیر ہو جاتی۔ فیصلہ ایک دفعہ ہو جاتا تو بدلنے کی کسی کو مجال نہ ہوتی۔ دلبر میں تو باپ کی ساری سخت گیری سمائی ہوئی تھی۔ صبور خان کا اپنا انداز تھا۔ لیکن وہ بھی باپ اور بھائی سے مختلف نہ تھا۔ اس نے پشاور رہ کر تعلیم پائی تھی جب کہ دلبر خان نے گاؤں ہی میں تھوڑا بہت پڑھ لکھ لیا تھا۔ تعلیم نے صبور خان کے طور و اطوار نہیں بدلتے تھے۔ ہاں شہر کی فضا اسے اچھی لگتی تھی۔ اور شادی کے دو سال بعد وہ اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ پشاور آ گیا تھا۔ یہاں اس نے کاروبار شروع کیا تھا۔ سب سے اپنی محنت اور اصول پرستی سے بہت بڑھ چلا تھا۔ قسمت بھی مہربان تھی مٹی میں ہاتھ ڈالتا تو سونا ہو جانے والی بات تھی۔

شہری زندگی اپنا کر بھی اس کا دھن وہی تھا۔ سخت گیری اپنا فیصلہ مسلط کرنے کی خواہش رعب دبہ سب وہی تھا۔ وہ دوستوں کا بہترین دوست اور دشمنوں کا بدترین دشمن تھا۔ خوبیوں اور خامیوں سمیت وہ قول کا سچا اور زبان کا پکا تھا۔ وعدہ کرتا تو پابندی لازمی تھی۔ وعدہ ایسا کرنے کے لیے اسے آگ و خون کے دریا سے بھی گزنا پڑتا تو گزند جیا کرتا تھا۔ اس کے چاک و چوبند گن مین اس کی ایما اس کی آنکھوں ہی میں پڑے۔ جیسے تھے۔

صبور خان نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ وہ اسے پسند تھا۔ اس لیے گھر پر ماحول وہی تھا۔ اس کی بیوی تمکین اپنی ساس آغا بی بی کے نقش قدم پر چلتی تھی۔ صبور خان کے ہر حکم اور فیصلے کی تابع تھی۔ اس نے کبھی بھول کر بھی صبور خان کے کسی حکم کو نہیں ٹالا۔ گاؤں میں اس کا رابطہ اسی طرح تھا اور شہر کے حکموں کی تعمیل کے ساتھ ساتھ سراسر

اور جیٹھ جٹھانی کے سامنے بھی دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ خوشحال خان یادر خان کی سوچ کے ساتھ ساتھ ان کی سوچ بھی چلتی تھی۔

دونوں بھائی الگ الگ ماحول میں رہ رہے تھے۔ لیکن رابطے کی ڈوریاں کٹی نہیں تھیں۔ کچھ بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ سوائے اس کے کہ اندازِ راکش بدلتا تھا۔ صبور خان چار کنال کی کوٹھی میں رہتا تھا۔ جس کی آرائش وزیرِ بانش مشرقی اور مغربی دونوں طریق سے ہوتی تھی۔ یہاں ڈرائینگ روم تھا۔ ڈائینگ روم تھا اور الگ الگ بیڈ رومز تھے۔ کھانا ٹیبل پر کھایا جاتا تھا اور نشست صوفوں اور کرسیوں پر ہوتی تھی۔ جب کہ گاؤں میں بڑی سی حویلی کے دالان تھے جن کے فرش سرخ قالینوں سے ڈھکے تھے۔ کچی دیواروں کی چار دیواری میں پکے کچے بے شمار کمرے تھے۔ حجرہ بہت کشادہ اور بہت بڑا تھا۔ جس میں رنگین موٹے موٹے پایوں والے بان کے پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ دیواروں پر طعنے ٹنگے تھے۔ جانوروں کی کھالیں تھیں بیسیوں کام کرنے والے تھے۔ چمچیں تھیں۔ چائے پانی کے لیے برتن تھے۔ فرش موٹے موٹے قالینوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ حجرہ اپنی تمام تر روایات کے ساتھ زندہ و اکابر تھا۔

شہباز خان دونوں پانچ چھ سال کا تھا۔ اس سے چھوٹی شاہینہ کی عمر تقریباً ساڑھے تین سال تھی۔ دونوں بہن بھائیوں کا آپس میں بے حد پیار تھا۔ صبور خان اور تمکینے ان بچوں کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔

اس رات دونوں بچے کھیل رہے تھے۔ تمکینے نے کھانا میز پر لگوا دیا تھا۔ اور صبور خان کپڑے بدلنے اپنے کمرے میں گئے تھے۔

”اے شہباز خانا! تمکینے نے بیٹے کو پکارا۔“

”کیا ہے بی بی جان! شہباز نے اپنے کھلونے شاہینہ کے سپرد کرتے ہوئے“

جواب دیا۔

”بچے جاؤ خان بابا کو بلا لاؤ۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

”میں بلاؤں گی خان بابا کو! شاہینہ کھلونے پرے پھینکتے ہوئے اٹھی۔“

”میں بلاؤں گا! شہباز دوڑا۔ شاہینہ بھی اس کے پیچھے بھاگی۔ دونوں باپ کے کمرے میں جا پہنچے۔“

”خان بابا! دونوں ہی ان کی ٹانگوں سے پیٹ گئے۔“

”کیا ہے بچو! خان بابا، صبور خان نے بچوں کو پیار کرتے ہوئے پوچھا۔“

”بی بی جان کھانے کے لیے بلا رہی ہیں! شہباز بولا۔“

”اچھا بھئی اچھا ہم اوھر ہی آرہے ہیں! صبور خان نے جھک کر شاہینہ کو اٹھالیا۔ شہباز نے باپ کی انگلی پکڑ لی۔“

سب ڈائینگ روم میں آگئے۔

”کیا پکڑا؟“ کھانے کی اشتہا بڑھانے والی خوشبو تھنوں میں گھسی تو صبور خان نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا اور شاہینہ کو انھوں نے گود میں بٹھالیا۔

”اے اس کی کرسی پر بٹھا دیں۔ کھانا ٹمیک سے کھانے نہیں دے گی۔ تمکینے نے دائیں ہاتھ کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے خان کی طرف دیکھا۔“

انھوں نے اس کے سرخ دھکتے پھولے پھولے رخساروں پر پیار کرتے ہوئے کہا ”کوئی بات نہیں۔ کھالیں گے۔“

تمکینے نے شہباز کو پیار کرتے ہوئے برابر والی کرسی پر بٹھالیا۔ اور اس کی چوڑی پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ ”آپ بہت اچھے ہیں۔ خان بابا کو تنگ نہیں کرنے۔“

”ہاں میں بہت اچھا ہوں بی بی جان! شہباز نے سیٹے پر ہاتھ ملا۔“

اس کی حرکت پر صبور خان اور تمکینے مسکرا دیئے۔

تمکینے نے کھانے کے ڈونگے اور ڈشیں صبور خان کے سامنے سرکاٹیں۔ انہوں نے اپنا کھانا نکالا۔ پھر تمکینے نے شہباز کی پلیٹ میں سالن اور چاول نکالے

آغا جان: صبور اور تمکینے کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ وہ بیمار تھے۔ پچھلے ہفتے دونوں نہیں دیکھ کر گئے تھے۔ صحت گر چکی تھی۔ لیکن وہ اپنی بیماری سے بڑے شانِ شایان طریقے سے لڑ رہے تھے۔ صبور خان اور تمکینے کو تسلی ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ واپس لوٹ آئے تھے۔

لیکن

اب بطور خاص ایک آدمی گاڑی سے انھیں اطلاع کرنے آیا تھا۔ صبور خان کھانا وہیں چھوڑ کر بجی کو کرسی پر بیٹھا کر باہر آ گئے۔

خوشحال خان کی حالت نازک تھی۔ آج شام ایک وہ خاصے اچھے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن اچانک ہی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ صبور خان کو اسی وقت بلایا تھا۔ دلیر خان نے کہلوایا تھا کہ اطلاع ملتے ہی وہ چل پڑے۔

صبور خان نے واپس آکر تمکینے کو صورتِ حال بتائی۔ ”فوراََ پہننا ہے۔ آغا جان کی حالت نازک ہے۔“

تمکینے رونے لگی۔ صبور خان کے اوسان بھی خطا ہو رہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور کو جیپ نکالنے کا آرڈر کیا اور خود اپنے دوست ڈاکٹر عمر کو فون کرنے لگے۔ اسے فوری طور پر گاؤں پہنچنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا: ”ہو سکتا ہے آغا جان کو پشاور لاکر ہو ہسپتال میں ایڈمٹ کروانا پڑے۔ اس لیے تم سارے وہاں پہنچنا ضروری ہے۔“

اس نے ایک گھنٹے کے اندر اندر روانہ ہونے کا وعدہ کیا۔

تمکینے نے جلدی جلدی بچوں کے کپڑے بیگ میں ڈالے اپنے اور صبور خان کے دو دو تین تین جوڑے رکھے گھبراہٹ اور پریشانی سے جو کپڑا ہاتھ لگا دہی رکھ لیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ سب گاؤں جانے والی سڑک پر جا پہنچے۔

خوشحال خان کی حالت بہت خراب تھی۔ دقعوں سے بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ زندگی ہار رہی تھی۔ موت اپنی فتحیابی پر مسکلا رہی تھی۔

”بس بی بی جان“ شہباز نے کہا۔

”کیا بات ہے بھوک کیوں نہیں لگتی تمہیں“ تمکینے نے قدم سے متھکر نہ انداز میں کہا۔

”شاہیدہ تم سے زیادہ کھاتی ہے گوشت۔“

”اوں ہوں۔ ہماری بیٹی کے کھانے کو نظر نہ لگا دینا۔“ صبور خان نے تمکینے کی بات کاٹتے

ہوئے روشن چکن کی ٹانگ شاہیدہ کو پکڑادی۔

صبور خان کو بیٹی سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ اس کا اظہار وہ ہمہ وقت کرتے رہتے۔ شہباز

یہ بات محسوس کرتا تھا۔ لیکن تمکینے یہ کی پوری کرتی رہتی تھی۔ صبور خان سے اس سلسلے میں بات کرنے

کا کئی بار اس نے سوچا تھا۔ لیکن حوصلہ نہیں پڑتا تھا کہ ان کے کسی رویے کی خامی کو ان کے سامنے

لائے۔

”باہر کھانا بھیج دیا۔“ صبور خان نے گوشت کا پیس اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ تمکینے نے جواب دیا۔ ”عادل خان نے گیا ہے سب کے لیے کھانا۔“

”ہوں۔“ صبور خان نے لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے آواز نکالی۔ اپنے ملازموں اور کارندوں کے

کھانے پینے کا وہ خود خیال رکھتے تھے۔

بچوں کی پیاری پیاری باتوں میں کھانا کھایا جانے لگا۔

لیکن ابھی پوری طرح ختم بھی نہ کر پائے تھے کھانا کہ عادل خان جو اس گھر کے معتاد اور

پہلے ملازم تھا گھبرا ہوا اندر آیا۔

”خان! اس نے آتے ہی کہا۔“

”کیا ہے عادل خان؟“ صبور خان نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

”خان۔ گاؤں سے سرور خان آیا ہے۔“

”خیریت؟“

”نہیں خان۔ آغا جان کی حالت۔“



صبور خان جیپ سے کود کر اترے اور حویلی کے کچے صحن کو پھلانگتے اندر دوڑے۔ صحن میں کھڑے ملازمین اور دوسرے لوگوں کے سلاموں کا جواب بھی نہ دے پاتے۔

وہ آغا جان کہہ کر خوشحال خان کے بیٹے پر سر رکھ کسبے اختیار سے ہو گئے۔ آغابی بی سر ملنے ہی بیٹھی تھیں دلبر خان اس کی بیوی صابرہ اور رشتے کی کئی عورتیں اور مرد وہاں جمع تھے خوشحال خان اس وقت ہوش میں تھے۔ بیٹے کی خوشیوں کی تمنا آنکھوں میں جوت جگا گئی تھی۔ بہت دیر تک وہ انھیں پیار کرتے رہے۔ صبور سر جھکا کر بیٹی پر بیٹھ گئے۔ دلبر خان نے ان کی پشت پر ہاتھ پھیرا۔ لیکن کچھ کہا نہیں۔ غم اندوہ نے انھیں گنگ کر رکھا تھا۔ باپ سے انھیں بہت الفت تھی۔ بچھڑنے کا مرحلہ قریب دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہ پا رہے تھے کہ کیا کریں۔

تھیکینے اور بچے بھی آغا جان کے پلنگ کے قریب آئے۔ خوشحال خان نے اپنا شیخ سا ہاتھ اٹھا کر سب کے سروں پر پھیرا۔

ڈاکٹر بھی کچھ ہی دیر کے بعد پہنچ گیا۔ اس نے خوشحال خان کو دیکھا۔ معائنہ کیا۔ اس نے مایوسی ظاہر کی۔ اب انھیں ہسپتال لے جانے کی ضرورت نہ تھی۔ دوا سے زیادہ دعا کی ضرورت تھی۔ رات کا پچھلا ہر تھا۔

خوش حال خان نے آنکھ کھولی۔ وہ دو گھنٹے کی بے ہوشی کے بعد ہوش میں آئے تھے۔ سب گھروالے ان کے پلنگ کے گرد ہی بیٹھے بے خواب آنکھوں سے انھیں تکے جا رہے تھے۔ دونوں بہوئیں بھی تالین پر گاؤں کیوں کے سہارے بیٹھی تھیں۔ کچھ قریبی عزیز بھی اونگھ رہے تھے۔ دو ایک سو بھی رہے تھے۔

خوشحال خان نے دلبر اور صبور کے سر سینے پر رکھ کر انہیں لپٹا لیا۔ دونوں کی آنکھیں جلنے لگیں۔ خوشحال خان نے ٹوٹی بیٹھتی آواز میں انھیں صبر کی تلقین کی۔ پھر گردن گھا کر مہلنے بیٹھی آغابی بی کو دیکھا۔ وہ ان پر جھک گئیں۔

”صابرہ اور تمکینے۔ کو۔ بھی بلاؤ۔“

آواز سنتے ہی دونوں پلک کر اڑھرائیں گئیں۔ آغا جان نے اپنے تکیے اونچے کرنے کو کہا۔ وہ اس وقت پورے ہوش و حواس میں تھے۔

”میرے بچو۔ مجھے تم پر غر ہے۔“ انھوں نے کمزور آواز میں کہا۔ پھر دونوں بھائیوں اور بہوؤں کے پیار اور سلوک کی تعریف کی۔ آغابی بی کی عمر بھر کی وفادار نہ رفاقت کو خراج تحسین پیش کیا۔ آغابی بی بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ بہوئیں البتہ آنسو چاروں کے کونوں سے پونچھنے لگیں۔

تھوڑی سی تمہید کے بعد آغا جان نے کہا۔ ”میرے مرنے کے بعد اس خاندان کا اتحاد اور سلوک اسی طرح رہے۔ شیرازہ بکھرنے نہ پائے۔“

دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

”شاباش! آغا نے کہا۔“ میری ایک خواہش ہے۔ وہ بھی امید ہے تم ضرور پوری کرو گے۔ صابرہ اور تمکینے کو بھی اعتراف نہ ہوگا۔“

”آپ حکم کریں آغا جان۔“

اور آغا جان نے حکم کر دیا۔ ”دلبر اور صابرہ کے دونوں بچے زرگل اور زری گل۔ صبور خان اور تمکینے کے دونوں بچے شاہینہ اور شہباز خان۔۔۔ ان کی شادیاں۔۔۔“

”ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے آغا جان۔“ دلبر بولا۔

”ہمیں خوشی ہوگی۔“ صبور خان بولا۔ ”بلکہ ہماری تو دلی خواہش یہی تھی۔ آپ نے حکم فرمایا۔ ہمارے سر آنکھوں پر۔“

دلبر خان نے بھی یہی کہا۔ ”یہ بندھن ہم دونوں بھائیوں کو اور مضبوط کر دے گا۔“

”بہوؤں سے بھی کہہ دو آغابی بی۔ تمہاری بھی تو یہی مرضی ہے نا۔“

آغابی بی نے سرشات میں ہلایا۔

میں گھل مل کر کھیلے۔ تو والدین خوشی سے مچھوٹے نہ سماتے۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ پیار کے بندھن مضبوط ہوتے گئے۔

اب بچے شعور کی حدود کو پہنچ رہے تھے۔ انھیں نئے رشتوں کا پتہ چل رہا تھا۔ معصوم اور... ٹھنڈے ٹھنڈے پیار میں حدت بھر رہی۔ معصومیت چالاک ہوشیار ہوتی جا رہی تھی۔ شہباز اور شاہینہ شہر میں رہتے تھے۔ شہری فضا ان پر اپنا رنگ جماد رہی تھی گھر یلو فضا تو وہی تھی اس لیے کہ وہ خان بابا کے تابع تھی۔ لیکن اسکول کالج میں وہ گھر یلو گھٹن سے آزاد ہوتے تھے۔ شہباز کے کئی دوست تھے۔ شاہینہ کی بہت سی سہیلیاں تھیں۔ یہ سب لوگ تعلیم یافتہ اور آزاد خیال لوگوں کے بچے تھے۔ ان کا اثر شہباز اور شاہینہ پر بھی ہو رہا تھا۔

زر گل نے بھی زندگی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا۔ اس کے خیالات میں بھی وسعت آگئی تھی۔ گو وہ ہوشل ہیں رہتا تھا کہ آغا بی بی اور آغا جی کو پسند نہیں تھا۔ وہ اپنی منگیت کے گھر پر رہے۔ خالی چچا کا گھر ہوتا تو بابت اور تھی۔ اس لیے وہ ہوشل میں تھا۔ لیکن چھٹی کے دن گھر جانا ہوتا۔ تو شاہینہ کی قربت میسر آجاتی۔ شاہینہ بھی بیٹے بھرا اس کی آمد کی منتظر رہتی۔ دونوں ملتے تو یوں لگتا صدیوں کی مفارقت جھیل کر ملے ہیں۔ محبت کا نازک پودا اہلہار ہوا تھا۔ اس کی جڑیں تنومند ہوتی جا رہی تھیں کبھی کبھی دنوں گھر سے باہر بھی مل جیتے تھے۔ کسی ریسٹورانٹ یا ہوٹل کے میم ٹارکٹ ہکلتے اور مترنم گوشے میں بیٹھ کر چائے پینے یا کھانا کھاتے اپنی اپنی بے تابیوں کا ایک دوسرے پر اظہار بھی کر لیتے تھے۔

زر گی گاؤں ہی میں رہتی تھی۔ ڈال کے بعد آغا بی بی نے گھر بٹھا لیا تھا۔ اسے بھی پڑھنے کی لگن تھی۔ اور وہ بھی پشاور کے کسی اچھے اسکول میں پڑھنے کی متمنت تھی لیکن گھر میں آغا بی بی اور دلبر خان کا حکم چلتا تھا۔ اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے پشاور نہیں بھیجا گیا۔

"شاہینہ بھی تو پڑھ رہی ہے۔" زر گی شاکی انداز میں کہتی۔

"تم ان کے ہاں رہ سکتی تو تمہیں بھی پڑھنے کا موقع مل سکتا۔ لیکن تمہیں وہاں نہیں

تھیکے اور صابہ لگے ہیں۔ یہ ان کی خوش دلی سے رضا مندی کا اظہار تھا۔

"کل اس بات کا باقاعدہ اعلان ہو جائے" آغا جان نے کہا: "کل میں زندہ رہا۔ تو ان کی منگنی بھی کر دوں گا۔"

اور اگلے دن واقعی چاروں بچوں کی منگنی کر دی گئی۔ خاندان کے لوگ جمع ہوئے دعوت دی گئی۔ خوشی منائی گئی لڑکے دولہا بنے۔ ننھی منی دلہنیں کپڑے زیور پہن کر اٹھلائی پھریں دلبر اور صبور بار بار گلے ملتے۔ تھیکے اور صابہ نے دوپٹے بدلے۔ یوں دوپٹہ بدل بہنیں بن گئیں۔ خدانے خوشحال خان کو اپنی زندگی کی یہ آخری خوشی دیکھنے کی مہلت دے دی۔

دو دن بعد وہ راجھی ملک عدم ہو گئے۔ آغا بی بی کو سفید چادر اوڑھا دی گئی۔ اور کفن و دفن اور کئی دن کے سوگ کے بعد دلبر خان کو باپ کا جانشین بنا دیا گیا۔ صبور خان کا جائیداد میں پورا حصہ تھا۔ لیکن یہ سارا دلبر خان ہی کی زیر نگرانی رہا۔ کیونکہ صبور خان کاؤں میں نہیں رہتے تھے۔

چالیسویں کے بعد صبور خان نے بھائی سے واپسی کی اجازت چاہی۔ آغا بی بی سے بھی اجازت لی۔ تھیکے اور دونوں بچوں کو لے کر جیپ میں آ بیٹھے۔ روتی آنکھوں سے سب جدا ہو رہے تھے۔

لیکن

اس وقت ایسا تماشہ ہوا کہ سب ہنس پڑے۔ ان دنوں میں چاروں بچے آپس میں بہت بہت مانوس ہو چکے تھے۔ شہباز، زر گی کو ساتھ لے جانے کے لیے جیپ سے کود گیا تھا۔ اور زر گل نے شاہینہ کو کھینچ کھینچ کر جیپ سے اتارنا چاہا تھا۔

بچپن کے ہی جذبات وقت کے ساتھ ساتھ پروان چڑھتے گئے۔ زر گل شاہینہ اور شہباز زر گی سے مانوس اور وابستہ ہو گئے۔ صبور خان جب بھی گاؤں جاتے تھے ان کے ساتھ جانے کو تیار ہوتے اور دلبر خان تو اکثر شہر آتے رہتے تھے زر گل اور زر گی ان کے ساتھ ہوتے بچے آپس

زری تو اس کے سامنے گونگی ہی ہو جاتی تھی۔ چہرے پر شہابی رنگ دوڑ جاتے۔ ہونٹ  
پکپکاتے۔ آنکھوں پر پٹکوں کی سیاہ چلمیں گر جاتیں۔  
شہباز نے تکلفی سے باتیں کرنے کی کوشش کرتا۔ ہنستا بولتا چھیڑتا۔۔۔ ستا۔ لیکن وہ  
فری نہ ہو پاتی۔ گھبرائے گھبرائے بچے میں کبھی کوئی بات کر لیتی اور بس۔ شہباز اس کے اس انداز پر  
لوٹ پوٹ ہو جاتا۔

کبھی کبھار وہ آغا بی بی کے ساتھ شہر بھی آجاتی۔ بصورت چاچا کے ہاں ہی ٹھہرتی۔ یہاں  
بھی گھسنے ملنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ شہباز کی کوشش کے باوجود بھی نہیں ملتا تھا۔ اس لیے  
کہ ساتھ آغا بی بی جیسی کڑی نگراں ہوتی تھی۔  
اس کے باوجود بھی محبت پروان چڑھ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پانے کے لیے  
بے چین رہتے تھے۔

”۱۵ سال کا چکر چلتا رہا“

زر گل زری یونیورسٹی سے گریجویشن کر رہا تھا۔ اس نے اپنی زمینداری سنبھالنا تھی۔ زمینوں  
سے سونا اگلونا تھا۔ بے شمار اراضی تھی۔ زر گل کو اپنی مٹی سے پیار تھا۔ اپنی تہذیب سے انس تھا۔  
گاؤں کی زندگی سے بیزار نہیں تھا۔ گاؤں میں رہ کر اپنے لوگوں کی معیت میں وہ تہذیب کی ہمک  
اور تعلیم کی روشنی اپنے لوگوں میں پھیلانا چاہتا تھا۔ گاؤں میں لوگوں کی اکثریت ایسی تھی جو زندگی کو  
بس گزارے چلے جا رہے تھے۔ اپنی روایات کے تحفظ اور دوستی دشمنی جیسے جذبوں سے نروازا ہونا  
ہی ان کا مقصد تھا۔ زر گل کی دلی خواہش تھی کہ یہ لوگ اپنی ذہنی و جسمانی توانیاں کسی اچھے مقصد  
کے لیے صرف کریں۔ انہیں زندگی کی اعلیٰ اقدار سے شناسائی ہو۔ جانوروں کی طرح کھانا پینا اور سونا  
جاگنا ہی مقصد حیات نہ ہو۔ وہ باپ دادا کی طرح لوگوں پر صرف حکمرانی ہی کرنا نہیں چاہتا تھا۔  
وہ انہیں انسان ہونے کے ناطے ان کے سارے حقوق ٹوٹانا چاہتا تھا۔

شہباز خان اس کے بالکل برعکس تھا۔ گاؤں میں زری نہ ہوتی تو شاید وہ کبھی لوٹ کر دیکھتا

رکھا جاسکتا۔

”ہوٹل تو ہیں۔ خان شہاب چاچا کی بیٹی ریشٹھ بھی تو ہوٹل میں رہ کر پڑھ رہی ہے“  
”لوگوں کو ہوٹلوں میں رکھنا ہمیں پسند نہیں۔“

زری چپ ہو جاتی۔ ماں سے لڑتی جھگڑتی تو وہ بے بسی سے کہتی: ”میرا بس کہاں چلتا  
ہے بیٹی۔“

زری کو پڑھائی کا شوق تھا۔ درگل نے اس کا بندوبست یوں کیا کہ ایک ٹیچر رکھ دی اور  
میٹرک کے کورس کی کتابیں لا دیں۔ یوں زری نے میٹرک کر لیا۔ اس کے بعد اس طرح ایف اے  
بھی پاس کیا۔

آغا بی بی نے کہہ دیا: ”بس اتنی تعلیم کافی ہے۔ اب کچھ گھر گرہنٹی سیکھو۔ شادی کے  
بعد یہی چیزیں کام آتی ہیں۔“

ان کے حکم کے آگے دم مارنے کی کسے مجال تھی۔ زری کیا کرتی۔ گھر کے کام کا کچ کرنا  
شروع کر دیے۔ نوکرائیوں کی کھپ کے باوجود وہ کھانا پکانا، کوسے ترتیب دینا اور کپڑے سینا  
سیکھنے لگی۔

شاہینہ اور زر گل کی طرح زری اور شہباز کو ملنے کے مواقع نہیں ملتے تھے۔ کبھی کبھار  
شہباز خان گاؤں چلا جاتا تو زری کی جھک نظر آ جاتی۔ سیدھی سادی سی ٹکی شرم دجیا کا مجسم  
تھی۔ شہباز کے نام پر ہی کانوں تک سرخ ہو جاتی۔ لیکن چاہتیں اور محبتیں پروان چڑھ رہی  
تھیں۔ شہباز من مندر کا دیتا تھا۔

شہباز کے لیے بھی بڑی کشش انگیز تھی زری کی ذات۔ جب بھی وہ گاؤں جاتا۔ زری کی  
جھک دیکھ لیتا۔ کئی کئی دن سرشاری اور نشے کی سی کیفیت رہتی۔ بہت بے تاب ہوتی تو  
وہ اس سے ملنے کا موقع نکال ہی لیتا۔ کئی مکانات پر پھیلی حویلی کے کئی گوشے ایسے تھے ہی جہاں  
”تنہائی“ میسر آ سکتی تھی۔ چاہے چند لمحوں ہی کی سہی۔

گھر یاد آتا۔ بی بی جان اور شاہینہ یاد آئیں۔ خان بابا کی سخت گیری میں بھی ان کے پیار کی ہلک  
کا احساس ہوتا اور سب سے بڑی بات ذریعے طرح یاد آتی، سنہری رنگت، سیاہ آنکھوں اور گھٹنوں  
یہ سیال چمکیلے ریشمی بالوں والی چپ چاپ سی زری۔ جس کی خاموشی بولا کرتی تھی۔ وہ اسے  
بے حد یاد آتی۔

لیکن رفتہ رفتہ وہ نئے ماحول میں گھلنے لگا۔ اسے دو تین اچھے دوستوں کی قربت میسر  
آگئی۔ اس کا وقت بہت اچھا گزرنے لگا۔ وہ ایک امیر کیرپا کا اکوٹا بنایا تھا۔ روپے پیسے  
کی کمی نہ تھی۔ یوں بھی صبور خان نے بچپن ہی سے دونوں بچوں کے بینک اکاؤنٹ الگ  
الگ کھلوا دیے تھے۔ اب تک دونوں بہن بھائیوں کے اکاؤنٹ میں کافی روپے جمع ہو چکا تھا۔  
شہباز کو خوش قسمتی سے اچھے دوستوں کی صحبت میسر آگئی تھی۔ وہ ان کے ساتھ گھومنے  
بھٹمنے اور سیر و تفریح میں روپیہ تو خرچ کرتا تھا۔ لیکن یہ خرچ اسراف نہیں تھا۔ نہ ہی کسی غلط  
کام پر کبھی پلیمہ لگایا تھا۔ اس کے دو دوست عثمان اور تسنیم تو ننہو بھی امیر کیر تھے۔ راشد توسط  
طبقت کا تھا۔ راشد اور تسنیم سے دوستی فرسٹ ایئر سے ہی تھی، عثمان سے دوستانہ مراسم انجینئرنگ  
کے آخری سال میں ہوئے تھے۔

عثمان کے ڈیڑھی امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ اور روشن خیال تھے۔ اس  
کی ممتی نے بھی ایم۔ اے کیا ہوا تھا۔ اور کچھ عرصہ لاہور کالج میں پڑھائی بھی رہی تھیں۔ بڑے  
غنیس ذوق کی مالک تھیں۔ ان کی نفاست طبع کا عثمان نے تو کچھ زیادہ اثر نہیں لیا تھا۔ ہاں  
ان کی بیٹی زوبیدہ نے ماں کی یہ خوبی ضرور اپنائی تھی۔ وہ ان دنوں ہوم سائنس کالج میں تھی۔  
بی۔ اے کا آخری سال تھا۔ شکل و صورت تو ماں جیسی تھی۔ لیکن بے حد سمارٹ تھی۔ ملاحت  
و دلکشی بھی قدرت کی دین تھی۔ ماڈرن گھرانے کی لڑکیوں کی طرح وہ بھی اپنے اصول و آدش  
رکھتی تھی۔ والدین نے ہر طرح کی آزادی دے رکھی تھی لیکن آزادی کے ساتھ غیر محسوس کی پابندی  
بھی تھی۔ جس سے آزادی بے راہ روی نہیں بنی تھی۔

بھی نہیں ادھر۔ شہر میں پلا بڑھا تھا۔ شہری آداب خود بخود کردار کا حصہ بن گئے تھے۔ اس نے مصنوعی  
اور کھلی نمائش زندگی کو پسے ہوئے اپنایا تھا۔ جوش، دلوئے، جرات اور بہادری کو جو اس کے  
خاندان کی شناخت تھی، پہچان تھی اسے شائستگی کے لبادے تلے چھپا دیا تھا۔

ایف ایس سی کے بعد اس نے لاہور انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ لاہور اگر اس  
نے نئی دنیا دیکھی ماں، باپ کے کڑے اصولوں تلے وہ اب تک ڈرا ہما سا زندگی گزار رہا تھا۔  
لیکن یہاں اگر وہ مادر پدر سے آزاد تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اب تک وہ کنوئیں میں بینڈک کی  
سی زندگی گزار رہا تھا۔ کنوئیں سے باہر تو وہ اب آیا تھا۔

نئی زندگی اسے بہت پسند آئی۔ یہاں نہ خان بابا کی گونج گرج تھی۔ نہ ہی بی بی جان کی پوچھ گچھ۔  
”کہاں رہے اتنی دیر؟“

”وقت پر گھر آ جایا کرو۔“

”دوستی صرف کالج تک ہی محدود ہونا چاہیئے۔“

”تمہارے خان بابا کو شہر بے بہار کی طرح پھرنا پسند نہیں؟“

”مانا کہ تم ماشاء اللہ بہت لائق ہو۔ پھر بھی یہ وقت پڑھائی کی طرف دھیان دینے کا ہے۔“

”تمہیں شہر ضرورت سے زیادہ ہی اس آگیا ہے، میں دیکھ رہی ہوں۔ تم گاؤں سے دور

ہوتے جا رہے ہو اور یہ اچھی بات نہیں۔ ہماری جڑیں گاؤں ہی کی مٹی میں ہیں۔“

”آغا بی بی تم سے نالاں ہیں۔ پیشتر اس کے کہ ان کا عتاب ٹوٹ پڑے۔ اپنی اصلاح

کرو۔ باقاعدگی سے انھیں سلام کرنے جایا کرو گاؤں۔“

”وہ تمہیں زر گل جیسا دیکھنا چاہتی ہیں۔“

بی بی جان سے وہ قطعاً نہیں ڈرتا تھا۔ ہاں خان بابا سے جان جاتی تھی۔ ان کے سامنے

دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ ان کا حکم ماننے کا حوصلہ نہیں تھا۔

لاہور اگر اس نے سکون کا سانس لیا۔ شروع شروع میں تو کچھ اکھڑا اکھڑا ضرور رہا۔

”واقعی؟“ زوبی بولی۔

”ہاں“ عثمان نے یقین دلایا۔ ”ایک دم پٹھان میں بھاری بھر کم قسم کے پٹھان! شہباز ہنسنے لگا۔ زوبی کو اس کی مردانہ پردہ کار مسکراہٹ بہت اچھی لگی۔ چند منٹ وہ باتیں کستے رہے۔ پھر زوبی نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

”مافی ہنس کر بولا: ”مجھے پتہ تھا تم میرے پیچھے آؤ گی۔۔۔ ہا کہیں کی۔“

زوبی نے بھائی کا منہ چڑھایا۔ چابی انگلی کے گرد گھماتے ہوئے بولی: ”ابھی چل سکتے ہو؟“

”پیرید تو فری ہے، کتنی دیر لگے گی!“

”تم آؤ تو ہسی!“ زوبی نے بھائی کا بازو پکڑ کر گھسیٹا۔ شہباز کو بہن بھائی کی بے تکلفی بہت اچھی لگی۔

”میں ابھی آتا ہوں!“ عثمان نے گاڑی کی طرف جاتے ہوئے شہباز سے کہا۔

”فری ہیں تو آپ بھی آجائیں!“ زوبی نے نگاہوں سے پُر زور دعوت دیتے ہوئے کہا۔

شہباز کو اس کی بے تکلفی عجیب لگی۔ مافی نے بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا: ”تھوڑی دیر کا کام ہے۔ ابھی آجائیں گے آجاؤ!“

وہ خاموشی سے آگے بڑھا اور گاڑی کا دروازہ کھولا۔

زوبی نے چابی بھائی کو دی اور خود پچھلی نشست پر بیٹھ گئی۔ یوں شہباز فرنٹ سیٹ پر عثمان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ تینوں جتنی دیر ساتھ رہے باتیں کرتے رہے، زوبی پٹ پٹ باتیں کیے جارہی تھی۔ شہباز کو کچھ حیرانگی بھی ہو رہی تھی۔ پہلی ہی ملاقات میں لڑکی کا اس قدر بے تکلف ہونا اس نے کب دیکھا تھا۔

لیکن حیرت کے باوجود اسے اچھا بھی لگ رہا تھا۔

چند دنوں بعد زوبی، شہباز کو ایک اسٹور کے کاؤنٹر پر ملی۔ وہ شاید شاپنگ کر چکی تھی۔ دو تین پکیٹ اٹھا رکھے تھے۔ اور اب بل ادا کر رہی تھی۔ شہباز نے تین چھٹیوں میں پیشاد

زوبیہ ہنس مکھ سی لڑکی تھی۔ بے تکلفی سے باتیں کرتی تھی۔ دل نشیں انداز میں ہنستی تھی۔ اور آواز دے گومتی پھر قتی تھی۔ ڈانٹوں لگے آتی تھی۔ تیراکی سیکھی تھی۔ دبی پتلی اور نازک سی لڑکی کو گھڑسواری کا بھی شوق تھا۔ محی کی طرح اسے باورچی خانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہیرے خانہ سے موجود تھے۔ اسے کچن میں جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہاں گھر کو ڈیکور بیٹ کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ پاپ میوزک اس کی کمزوری تھی۔

وہ اپنی سہیلیوں میں کچھ اپنی امارت اور کچھ نفیس ذوق کی وجہ سے بہت مقبول تھی۔

شہباز سے پہلی ملاقات یونیورسٹی ہی میں ہوئی تھی وہ اپنے کسی فارم کے سلسلے میں عثمان کے پاس آئی تھی۔

عثمان نے جو اس وقت شہباز کے ساتھ گیٹ کے قریب ہی کھڑا کسی پروفیسر کے محنت سے پڑھانے کی باتیں کر رہا تھا۔ زوبیہ کو گیٹ سے اندر آتے دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ کر ادھر بڑھ گیا۔ شہباز نے شوخی سے اس پر کوئی آواز نہ کسا پھا تھا۔

لیکن منہ سے کوئی لفظ نکلا بھی نہ تھا کہ عثمان نے کہا: ”آؤ شہباز۔ اس سے ملو۔ یہ میری چھوٹی بہن زوبیہ ہے۔“ شہباز نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کے منہ سے مذاق سے کوئی غیر شااست بات نہیں نکل گئی۔

زوبیہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔ عثمان نے شہباز کے متعلق بھی اسے بتایا۔ ”بہت اچھے، بڑے عمدہ انسان ہیں۔ مجھے ان کی دوستی پر فخر ہے۔“

زوبیہ نے عثمان کی بات سنی بھی کہ نہیں وہ ایک ٹک اسے تکے گئی۔

شہباز کچھ خفت سی محسوس کرتے ہوئے سے کھنکھارے زوبی کی محسوسیت ٹوٹی تو بھائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور بے تکلفی سے بولی: ”بڑے گرائڈیل قسم کے دوست ہیں۔ مافی تمہارے۔“

”پٹھان جو ہیں!“ عثمان نے ہنس کر کہا۔

خاص تجربہ بھی نہیں تھا۔ اس نے زوبیہ کا شکریہ ادا کیا۔

”خالی خولی شکریہ“ وہ ہنسی۔

”جی!“ حیرانگی سے شہباز نے کہا۔

”بھئی ایک کپ چائے ہی ہو جائے!“ نمی نے ہنس کر کہا۔

”بالکل۔ بالکل!“ زوبیہ بولی۔ ”وہ ساڑھے ہی تو ریٹورنٹ ہے۔“ آئیے“

”شہباز کٹھ پتلی بنا تھا۔ دونوں لڑکیوں کے ساتھ اس خوبصورت ریٹورنٹ میں چائے

کے لیے آنا پڑا۔ اس کے لیے یہ تجربہ نیا تھا۔ نیا اور سفسنی خیز“

نمی زوبیہ سے بھی زیادہ باتونی تھی۔ دونوں بے تکلفی سے ہنس بول رہی تھیں۔ اور شہباز

میں ہی من میں ان کا موازنہ اپنے ماحول کی پردہ زد لڑکیوں سے کر رہا تھا۔ شاید یہ جیسے وہ خانی

مود سمجھتا تھا۔ وہ اب بھی ان جیسی نہ تھی اور نرمی۔ نرمی کا خیال آنے ہی اسے ہر جھری

سی آگئی۔ یہ لڑکیاں بہتی اچھلتی گاتی ناچتی پنپل تریوں کی طرح تھیں اور نرمی۔ جھیل کا ٹھہرا

ہوا پانی۔ جس میں کبھی کبھار بچل ہوتی ہے۔ کبھی کبھار۔ جب آئندہ صیوں کے طوفان اٹھتے ہیں

یا کوئی کشتی اس کا سینہ چیرتے نکل جاتی ہے۔

اگلے ہی ہفتے شہباز رات کے کھانے پر مانی کے ہاں مدعو تھا۔ وہ اسے اپنے مٹی ڈیڈی سے

ملنا چاہتا تھا۔ زوبیہ ہی نے ڈنر پر بلانے کی تجویز پیش کی تھی۔

بہت خوب صورت اور بڑا ہی آراستہ گھر تھا ایک ایک چیز نفاست کا منہ بولتا ثبوت

تھی۔ تھوڑا سا ڈیڈی گنگن کا انتخاب تو لا جواب تھا۔ پتھر کے جیسے خوب تھے۔ پھولوں کی آرائش

بھی قابل دید تھی۔ مانی کے مٹی، ڈیڈی بڑے خوش خلق اور زندہ دل تھے۔ یہاں حکمرانی مٹی کی

تھی۔ ڈیڈی تو ہر کام سے لائق تھے۔

شہباز نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ مردہ کو گھر میں حکمرانی کرتے دیکھا تھا۔ حکمرانی

بھی سخت گیری کی حد تک عورت تو صرف حکم کا بندہ تھی۔ مرد کے حکم سے سربازی کی مجال

بنا تھا۔ اس بے بی بی جان، شاہینہ اور خان بابا کے لیے چھوٹے موٹے تحائف خریدنا تھے۔ اس فوج

گاؤں جانے کا بھی ارادہ تھا۔ اس لیے تحفوں کی فہرست میں آنکھانی بی اور نرمی کا نام بھی شامل تھا۔

اس کی نگاہ زوبیہ پر پڑی اس کی شاید کوئی سہیلی بھی ساتھ تھی۔ زوبیہ نے اسے دیکھا۔

دیکھتے ہی پلٹی اور بڑی بے تکلفی سے بولی۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو!“ اس نے بھی شائستگی سے کہا۔

”کیسے ہو؟“

”فائن۔“

”اکیلے آئے ہو؟“

”ہاں۔“

”میرا مطلب ہے مانی ساتھ نہیں۔ کیسے چھوڑ دیا اکیلے اس نے۔ وہ تو پتہ نہیں رات

بھی کیسے گزارتا ہے تمہارے بغیر“

شہباز ہنس کر بولا۔ ”محبت ہے اس کی۔ بہت پیارا انسان ہے۔“

”وہ یا۔ تم۔“ زوبیہ نے اس کی آنکھوں میں شوخی سے جھانکا۔ شہباز گڑ بڑا گیا۔

زوبیہ بھٹ سے بولی۔ ”میں یہ سامان گاڑی میں رکھ آؤں۔ آپ یہیں ٹھہریے گا۔ آؤ نمی!“

اس کی دوست نے شہباز پر اک نگاہ ڈالی مسکراتے ہوئے بولی۔ ”یہ ہی مانی کے نئے

دوست ہیں۔ جن سے ایک بار ملی ہوا اور ہزار بار ملنے کی تمنا جاگی ہے؟“

وہ ہنس پڑی۔ ”ہاں نمی۔ خود ہی دیکھ لو۔ کیا میں نے غلط بات کہی؟“

”نہیں۔“

دونوں ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ شہباز وہیں کھڑا کچھ حیران حیران سا انہیں تکتا رہا۔

وہ اپنا سامان گاڑی میں رکھ کر واپس آگئیں۔ شہباز ان کا منظر ہی تھا۔

دونوں لڑکیوں نے شاپنگ میں اس کی مدد کی۔ عورتوں کے پسند نہ پسند کا اسے کوئی

تو کیا۔ شاید کسی نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اس گھر میں دوستانہ فضا تھی۔ باپ، ماں اور بچے سب آپس میں بے تکلف تھے۔ ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ڈیڑی مٹی کی حکمرانی مان رہے تھے۔ اور تغافر سے سب کو احساس دل رہے تھے۔ زہبیر اور مانی باپ سے جس بے تکلفی اور شوخی سے باتیں کر رہے تھے۔ شہباز نے تو اپنے خاں بابا سے اتنا فری ہونے کا کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ اپنے گھر کی گھٹن کا اسے اب احساس ہو رہا تھا۔ وہ اس ماحول میں خوش تھا۔ اسے یہ سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ اچھا بہت اچھا۔

کھانے کے بعد توڑی دیر گپ شپ رہی۔ پھر مٹی ڈیڑی مٹیوں کو بے تکلفی سے باتیں کرنے کے لیے چھوڑ کر اٹھ گئے۔ ڈیڑی ناول پڑھنے لگے اور مٹی اپنی پسند کا میوزک دھیمے سروں میں سننے لگیں۔ وہ مینوں ڈرائیونگ روم سے باہر نکل آئے۔ خوبصورت لان میں کرسیاں کبھی تھیں۔ پھلدار کا سحر بھلا تھا۔ ہوائیں جھک رہی تھیں۔ فضا مترنم تھی۔ رموڈ آپرل آپ رومیٹک ہو رہا تھا۔ زہبیر پر تو سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔ مانی اپنے کسی ادھر سے ردائیں کی باتیں کرنے لگا۔ شہباز بڑے شوق سے زہبیر کو دیکھ رہا تھا اور مانی کی خوبصورت باتیں سن رہا تھا۔

شہباز واپس جانے لگا تو زہبیر نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”پھر کب آؤ گے؟“

”جب تم بلاؤ گی؟“

”کل ہی بلاؤ تو؟“

”پلا آؤں گا۔“

”ہج۔“

”بالکل؟“

زہبیر نے واقعی اسے دوسرے دن ہی چائے پر بلا لیا۔

یوں شہباز زہبیر سے ملنے لگا۔ زہبیر تو اس کی ایمر پہلی ہی ملاقات میں ہو چکی تھی۔ شہباز ہی اپنے آگے بند باندھنے کی کوشش کیے جا رہا تھا۔ لیکن پانی کے بہاؤ میں زور آجائے اور راستے ڈھلائی ہو جائیں تو پھر بھلا کون روک سکتا ہے؟ پانی کو سر کے بل گرنے سے۔

زہبیر اک نشے کی طرح شہباز کے تواس پر چھا رہی تھی۔ وہ اس نئے تجربے اور خوش کن تبدیلی سے محفوظ ہو رہا تھا۔ وہ مین دن کے لیے پشاور گیا۔ گاؤں جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن آغا بی بی اور زری دونوں آئی ہوئی تھیں۔ زری سے تصویری ہی دیر کے لیے سامنا ہوا۔ شہباز کے ذہن میں پک جھپک زہبیر آگئی۔ شوخ چمنیل باتوں اور قہقہوں کی پھوار برسانے والی۔ یہ پھوار شہباز کے من کو گھیرا کر گئی۔ اس کا من تو جیسے خشک بجز اور ویران تھا۔

اس نے زری کے ساتھ بے تکلف ہونے کی کوشش کی تو زری کی خوبصورت کشادہ آنکھیں حیرت سے چمکی گئیں۔ وہ اس کا سامنا نہ کر سکی۔ پھر دو دن شہباز نے زری کو نہیں دیکھا۔ ہاں کھڑکیوں اور کواڑوں کے پیچھے اس کی جھلک ضرور نظر آئی۔

وہ واپسی کے لیے بے چین تھا۔ رات کی فلائٹ سے بھی واپس آ سکتا تھا۔ لیکن وہ اسی دوسرے واپس آ گیا۔ شام اس نے زہبیر کے لیے تھوڑی۔

وہ اس کے ہاں گیا۔ زہبیر کہیں جا رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے ہی کو تھی۔ شہباز کو دیکھا تو خوشی سے پاگل ہو گئی جیسے دوڑ کر اس کی طرف آئی۔ رکتے بچتے بھی وہ شہباز کے سینے سے اسٹکوائی۔

”ادہ۔ تم کہاں چلے گئے تھے شہباز۔ میں نے تمہیں کتنا مس کیا۔ تم نے کیا کر دیا ہے۔ میں۔“

میں تمہارے بغیر ہو رہی رہی ہوں۔“

شہباز آہستگی سے اسے الگ کرتے ہوئے بولا۔ ”میں بھی تو تمہاری خاطر جلدی چلا یا آیا۔“

دل ہی نہیں لگا وہاں۔“

”ادہ شہباز۔ تم کتنے پیارے ہو۔ وہ اس کے بازو کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے جھول سکی گئی۔“

شہباز اس کے بالوں کی مہک سے مدہوش ہونے لگا۔

”کہاں جا رہی تمہیں؟“ شہباز نے ممتی ڈیڑی اور مانی کی احوال پر سی کہنے کے بعد پوچھا۔

”یونی۔ وقت گزاری کے لیے ایک سہیلی کے ہاں۔“ وہ بولی۔

”جھاؤ۔“ شہباز نے شوخی سے اسے دیکھا۔

”چلو۔“ وہ بھی شوخی سے بولی۔

”سہیلی کے ہاں۔“

”نہیں۔“

”تو۔“

”کہیں گھومنے پھرنے۔“

”چائے نہ پلاؤ گی۔“

”ہاں ہی پیئیں گے۔“

”گڈ۔“

”او۔“

دونوں گاڑی میں آ بیٹھے۔ پھر یہ گاڑی آباد مڑکوں سے ہوتی لمبی چوڑی سرمئی اور سناں

مڑکوں پر مڑی۔ دونوں ایک دوسرے کی مہکتی قوتوں سے مدہوش ہوئے جا رہے تھے۔

پھر

یہ قربتیں پھیلتی گئیں۔ مدہوشیاں بڑھتی گئیں۔ دونوں محبتوں کی حلاوتوں لطفوں میں

ڈوبتے چلے گئے۔

زوبیہ نے اپنا جیون ساتھی چن لیا کرے چنا ہی تھا۔ وحیہ و باوقار اور بقول اس کے

گزندیل قسم کا محبوب پانا اس کی تمنا تھی ضرورت تھی۔ وہ آزاد تھی اپنے معاملے میں اپنے انتخاب میں۔

لیکن شہباز تو آزاد نہیں تھا۔ اس کی ٹھیکرے کی منگ موجود تھی۔ اور بسے کا رشتہ بھی ہو چکا

تھا۔ جس خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ اس کی روایات سے بھی آگاہی تھی۔

پھر بھی

وہ پھسل گیا تھا تھا۔ زوبیہ کے دام محبت میں اسیر ہو گیا تھا۔ محبت شوریدہ سراندھی

اور طوفان کی طرح اٹھی تھی اور اس کے ڈر خوف اندیشے اڑا کر لے گئی تھی۔

زوبیہ تھی اور وہ تھا۔

وہ تھا اور زوبیہ تھی۔

زوبیہ کے والدین کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بیٹی کو اپنی آئندہ زندگی کے لیے جیون ساتھی

کا انتخاب کرنے کی انہوں نے اسے پوری پوری آزادی دے رکھی تھی۔ اس لیے شہباز کے ساتھ

لانا جلنا گھومنا پھرنا ان کے لیے قابل اعتراض نہیں تھا۔ اور پھر شہباز بھی تو اپنی شخصیت اپنی

حیثیت میں منفرد تھا۔ اعتراض کی گنجائش کہاں نکلتی۔ اس کے ماں باپ آج آکر رشتہ

طلبہ کریں تو وہ بیٹی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دینے کو تیار تھے۔

زوبیہ بھی ان دنوں یہی سوچ رہی تھی۔ شہباز فائنل میں تھا۔ امتحان قریب تھے۔

اس شام دونوں ایک ریسٹورنٹ کے گوشے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ سرخ اندھیرا

سا غبار چھپلا تھا۔ ہلکی ہلکی موسیقی سے فضا معمور تھی۔ بہت دلکش دلفریب سے تھا۔

اچانک ہی زوبیہ نے پوچھا۔ ”امتحانوں کے بعد کیا کرو گے؟“

شہباز چونکا۔ آہستگی سے بولا۔ ”کیا بے وقت سوال کیا ہے؟“

”بہت اہم ہے شہباز۔“

”ہوں۔“

”امتحانوں کے بعد کیا ارادہ ہے؟“

”ابھی تو صرف امتحانوں کی تیاری پر زور دے رہا ہوں۔“

”ہالو نہیں۔ کیا واپس پشاور چلے جاؤ گے؟“



میں میں نہیں تھا۔ اس نے مٹی اور ڈیڈی کو صاف صاف کہہ دیا۔ اگر انہوں نے شہباز کے ساتھ اس کی شادی نہ کی تو وہ خود یہ فرض انجام دے لے گی۔ اس نے شہباز کو ہر قیمت پر حاصل کرنا ہے۔ ہر قیمت پر۔

”اور یہ قیمت تمہاری خوشیوں کی موت بھی ہو سکتی ہے“ ڈیڈی نے سگار کی راکھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

”شہباز کی قربت کے ایک دن پر میں اپنی ساری زندگی قربان کر سکتی ہوں“ وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

”یہ سب باتیں ہوتی ہیں بیٹی“ ممتی نے کہا: ”شہباز کو پا کر کھونٹے سے ابھی ٹھو دینا سہل ہو گا۔ وہ اپنے رسم و رواج سے بغاوت کر کے بھی ان کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور ہو گا تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں“

”جان لوں گی“

”جانو گی تب نا۔ جو وہ تمہیں قبول کریں گے“

”مذکرین مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ مجھے شہباز قبول کر رہا ہے میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے“

بیٹی کی ضد کے سامنے انہیں جھکا ہی پڑا۔ شہباز کو بلا کر انہوں نے سنجیدگی سے بات کی۔

”انکل۔ اگر آپ ساتھ دیں تو میں زوبیر سے خود شادی کر سکتا ہوں“ اس نے موڈ بنا کر کہا۔

”اور تمہارے گھر والے...“

”وہ تو باگل پن کی حد تک قدامت پسند ہیں۔“

”ان سے کیسے پٹو گے“

”پٹنے کی ضرورت نہیں۔ میں اپنے زور بازو پر یہ ہمت کر دوں گا۔ میرے پاس روپے

پیسے کی کمی نہیں۔ پھر نتیجے کے بعد کہیں جاب بھی مل ہی جائے گی“

”جانا تو پڑے گا۔“

”پھر کسے کے لیے؟“

شہباز نے ایک گہری نگاہ اس پر ڈالی اور بولا: ”ضرور زوبیر۔ میں ضرور آؤں گا۔ خواہ بغاوت

کر کے ہی آنا پڑے“

”بغاوت؟“

”ہاں۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

اس نے کہا تو شہباز کو اسے پوری طرح سمجھانا پڑا۔... کچھ بھی نہیں چھپایا۔

زوبیر خوف زدہ سی نظر آئی ہسم کر اسے دیکھا۔ اور میز پر رکھا اس کا ہاتھ دونوں ہاتھوں

میں سمجھتی تے پکڑ کر بولی: ”یہ سب کچھ کیوں بتا دیا۔ مجھے اندھ جیسے ہی میں رہنے دیتے۔“

”نہیں۔ زوبیر۔ تمہیں یہ سب کچھ بتانا ضروری تھا۔ میں تمہیں دھوکے میں رہنے نہیں

دینا چاہتا۔ میرا ارادہ کھٹن ہے۔ اور اس کی کھٹائیاں پائنے میں تم نے میرا ساتھ دینا ہو گا“

”میں تمہاری ہوں شہباز۔ تمہاری“ اس نے بڑے دل گزرتے جذباتی لہجے میں کہا۔

”میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے ہر کاوٹ سے ٹکڑا جاؤں گا۔“

شہباز واقف ٹکڑا گیا۔ اس نے اپنے خاندان سے بغاوت کردی روایات سے بغاوت کر

دی۔ خان بابا اور بی بی جان سے بغاوت کر دی۔ اور۔ اور۔ بچپن کی معصوم محبتوں

سے بغاوت کر دی۔

زوبیر کے ممتی اور ڈیڈی کو اعتراض ہوا۔ انہوں نے زوبیر کو سوچنے سمجھنے کی تلقین

کی۔ چٹانوں کی دشمنیوں کا کھل کر بتایا۔ خون خرابے سے ڈرایا۔

لیکن

وہ تو شہباز کی محبت میں پاگل ہو چکی تھی۔ جذبات کی پُر زور آمدنی کو روکنا اس کے

ان کے منتظر تھے۔ آتے ہی پیار سے دونوں کو بازوؤں میں بھر لیا۔

”خیریت رہی نا! ڈیڈی مائے پوجا۔“

”خوش رہے ہونا۔“ ممتی نے سوال کیا۔

دونوں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ممتی ڈیڈی کو ان کی مسکراہٹ سے مطمئن کر دیا۔

شام سب لان میں بیٹھے تھے کہ شہباز نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ممتی سے پوچھا۔ ”ممتی“

میرے لیے کوئی فون۔ دو دن تو نہیں آیا تھا۔“

”کہاں سے آتا تھا؟“ زوبیہ نے ممتی کے نفعی میں سر ہلانے ہی پوچھا۔

وہ پیار سے زوبیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”سارا وقت مجھے دھڑکا ہی لگا رہا کہ خان بابا کو

کہیں پتہ نہ چل گیا ہو۔“

”شادی کا؟“ ممتی بولی۔

”جی۔“ وہ مسکرایا۔

”پتہ تو کسی نہ کسی دن انہیں چلے گا ہی۔“

”وہ تو ہے۔“

”اس وقت ہوشیاری دکھانا ہوگی۔ بغاوت تو کر لی ہے۔ آئندہ۔“

”چھوڑیں ممتی۔ دیکھا جائے گا۔ ہمیں ابھی سے ہراساں نہ کریں۔“

”تم میری بیٹی ہو۔ اک ماں کے مانے میں اگر فکر مند ہوں تو کوئی بڑی بات نہیں۔“

”فکر نہ کریں۔ شہباز میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔“ وہ شان سے بولی۔

”خدا کرے۔“ ممتی نے ہنس کر کہا۔

وہ چند دن وہیں رہے۔ پھر اپنے گھر آ گئے۔

اپنا گھر جے ممتی نے بڑی محنت سے ان کے لیے ڈیکوریٹ کیا تھا۔

نیلن

”سوال پیسے کا نہیں۔ وہ تو زوبیہ کا بھی اتنا جھٹ ہے ہمارے پاس کہ زندگی گزارنے کا

وسیلہ بن سکتا ہے، صرف تمہارے والدین سے ڈر لگتا ہے۔“

شہباز بھی اندھا بہرہ ہو رہا تھا۔ چاروں اور زوبیہ ہی نظر آتی تھی۔ اتنی خوف ناک اور تلخ

حقیقتوں کو نظر انداز کر رہا تھا۔

دونوں نے ممتی ڈیڈی کو اتنا مجبور کیا کہ وہ انہیں ازدواجی بندھن میں باندھنے کو تیار ہو گئے

شہباز نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ چپکے چپکے شادی کرے گا۔ والدین کو اس کی ہوا نہیں گلفے

دے گا۔ اور ایک بار شادی ہو جائے تو پھر والدین کو پتہ بھی چل جائے تب بھی انہیں اس شادی

کو قبول کرنا ہوگا۔

شادی ہو گئی۔

زوبیہ ڈیڈن بن کر ہوٹل کے اس سوٹ میں آگئی۔ جو شہباز نے تکیہ کر دیا تھا۔

بیڈ پر وہ سوئے موقی اور چھوٹوں سے لہری پھندی بیٹھی تھی۔ جھلجھل کر تالیاں اس عمری

بدن پر سجا تھا۔ شہباز مستانہ انداز میں چلتا اس کے قریب آیا۔ پٹی پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے حسن و

عشق کے آداب و تیز چلے۔ پھر شہباز نے زوبیہ کا گھونگھٹ.. الٹ دیا۔

زوبیہ نے ٹرگیں ادا سے اسے دیکھا وہ دل تھا کہ رہ گیا۔

پھر اس نے رومنائی کے طور پر چھوٹا سلاکٹ زوبی کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”زوبیہ نہیں

میرے والدین اگر باقاعدہ طور پر بیاہ کر لے جلنے تو آج میں اس چھوٹے سے لاکٹ کی بجائے اپنا

بڑے سے خاندانی میرے والا ہا تمہیں تحفہ دے رہا ہوتا۔“

”میرے لیے سی بہت بڑا ہے شہباز۔ تم مجھے مل گئے تو سب کچھ مل گیا۔“

شہباز نے دفور جذبات سے مغلوب ہو کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

دونوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

تیسرے دن دونوں ہنی مون کے لیے چلے گئے۔ گھوم پھر کر واپس آئے تو زوبیہ کے ممتی ڈیڈی

کے حکم کی تعمیل مجھے کرنا پڑے گی۔ نہیں تو۔ نہیں تو۔ اُف خدایا۔ تم خان بابا کو نہیں جانتیں؟  
 ”تمہیں نہیں مار سکتے شہباز۔ ایک باپ ہو کر بیٹے کے خون؟  
 ”زوبیہ یہ کرنا ان کے لیے مشکل نہیں۔ وہ بہت سخت، بڑے جذباتی اور جوشیلے آدمی ہیں  
 انتقام لینے سے کبھی نہیں چوکتے ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھر پر لکیر ہوتا ہے۔“  
 زوبیہ اس کی بانہوں سے نکلے ہوئے سنگین پتھر لیے لیے میں بولی: ”تو تم ان کے سامنے جھک  
 جاؤ گے؟“

وہ چند لمحے چپ رہا۔

”زری سے شادی کر لو گے؟“

وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر کرب و افرات سے ہونٹ کاٹتے ہوئے زوبیہ کو دیکھا۔ زوبیہ نے  
 پتھر لیے لیے میں کہا: ”تم ایسا ہی کر دو گے؟“  
 ”میں وعدہ کرتا ہوں زوبیہ۔ یہ شادی برائے نام ہوگی۔ صرف اس لیے ہوگی کہ خان بابا  
 کی بات رہ جائے۔ خاندان میں کوئی مشکل پیدا نہ ہو۔ شاہینزادہ گل کی ہو جائے۔ تعلقات  
 ٹھیک ہو جائیں؟“  
 ”ہوں؟“

”میں شادی کر کے زری کو وہیں چھوڑ آؤں گا۔ اس کا سایہ بھی تم پر پڑنے نہیں دوں  
 گا۔ زوبیہ تھوڑی سی ہمت کرو۔ میں۔ آگ و خون کے دریا میں نہیں کودنا چاہتا۔“  
 وہ اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔  
 اور پھر دس بج ہی گئے۔

اس نے بابا سے کہہ دیا کہ وہ پشاور آجائے گا اور زری سے شادی کرے گا۔  
 وہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا۔ زوبیہ کے لیے کون کون سی مراعات مانگتا رہا۔ زوبیہ تو  
 صوفے پر گر کر رہے ہوش ہو گئی تھی۔

اس ارضی جنت میں وہ بمشکل چند دن ہی سکھ کا سانس لے پاتے تھے۔ کرافٹ آؤں پڑی۔  
 دو دن پہلے،

ہاں، صرف دو دن پہلے خان بابا کا فون آیا، انھیں شادی کی خبر ملی تھی۔ ظاہر ہے اس  
 خبر سے طوفان اٹھنا تھا۔  
 لیکن صرف طوفان ہی اٹھا تو اس کے گزر جانے کا جان لیوہ انتظار کر لیا جاتا۔ کٹھن سے  
 کٹھن وقت بھی گزر جاتا ہے۔ رکتا نہیں ٹھہرتا نہیں۔

لیکن خان بابا نے تو اس طوفان کو اور ہی شکل دے دی تھی۔ اسے فوری طور پر واپس  
 پشاور بلا یا تھا تا کہ اس کی شادی زری سے کی جائے۔ زری کو کسی طور نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔  
 اسے چھوٹنے سے زرگی اور ریشماں کے بندھن ٹوٹنے کے علاوہ دونوں بھائیوں میں کبھی نہ ختم  
 ہونے والی دشمنی کی بنیاد پڑ سکتی تھی۔ یہ دشمنی آگ و خون کی ہولی بھی کھیل سکتی تھی۔  
 بابا نے صرف دو دن کی مہلت دی تھی۔

اور آج دس بجے انہوں نے فون کر کے شہباز کا آخری فیصلہ معلوم کرنا تھا۔  
 آخری فیصلہ۔

جوان کی مرضی کے تابع نہ ہونے کی صورت میں شہباز اور زوبیہ پر تباہی و بربادی بن  
 کے ٹوٹ سکتا تھا۔ شہباز کی موت بھی بن سکتا تھا۔ اور زوبیہ کے والدین کی تباہی بھی۔  
 اور اب دس بجے کی طرف گھڑی کی سوئیاں اپنی مخصوص رفتار سے بڑھ رہی تھیں۔ چپ  
 رہا۔ بڑے سکون اور بڑے اعتماد سے دس بجنا ہی نہ تھے نا۔

دس بجنے میں پانچ چھ منٹ باقی تھے۔ زوبیہ نے نگاہ گھڑی پر ڈالی تو ٹرپ کر بیڈ سے  
 اٹھی اور دوڑ کر شہباز سے لپٹ گئی۔ خوفزدہ اور سہمی ہوئی بولی: ”شہباز۔ شہباز دس بجے والے  
 ہیں۔ آؤ اس وقت کی قید سے کہیں دور بھاگ جائیں۔“

شہباز نے اسے بازوؤں میں جکڑ کر پیار کیا اور پھر بولا: ”ہمت نہیں ہارو زوبی۔ خان بابا

نوکر چاکر سبھی جھاک دوڑیں گے تھے۔

شہباز نک تماشائی کی حیثیت سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ بت بنا پھرتا تھا۔ اسے کوئی شوق نہ تھا نہ دلچسپی وہ تو صرف خاندان کو دشمنی کی آگ سے بچانے کے لیے زری کو بیاہ کر لانے کو تیار ہوا تھا۔

شادیاں ہو گئیں۔ پہلے زرگل شاہینہ کو بیاہئے آیا۔

پھر شہباز، زری کا ڈولہ گھرے آیا۔

خاندان کی عزت اور روایات کا وفات قائم رہا۔ خان بابا نے بھائی کو دی ہوئی زبان اور وعدہ پورا کر دیا تھا۔

جملہ عروسی بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا۔ روشنیوں اور خوشبوؤں سے مکروہک رہا تھا۔ خوبصورت بیڈ پر ڈالین بیٹھی تھی۔ اس نے بیش قیمت لباس پہن رکھا تھا، میرے موتیوں سے بھی تھی۔ پھولوں سے لدی تھی۔ وہ گاڈ بیکیے کے سہارے بیٹھی تھی۔

شہباز ذہنی اذیت سے دوچار تھا۔ زری سے اب محبت نہ رہی کبھی تو تھی۔ اور پھر۔۔۔ پھر یہ لڑکی۔ یہ معصوم اور بے گناہ لڑکی محبت کے آستانے پر یونہی قربان ہو رہی تھی۔ اس لڑکی سے اس نے کوئی مرد کار نہیں رکھنا تھا۔ اسے چھوٹا لک نہیں تھا اس کے اراٹوں کو پکنا چور کر چکا تھا۔ رہی یہی کسر آج نکالنا تھی۔ اس کا ضمیر اسے پریشان کر رہا تھا۔ شاہینہ اور دوسری خواتین اسے جملہ عروسی کی طرف کھینچنے لیے جا رہی تھیں اور وہ پریشان پریشان صوچ رہا تھا کہ زری سے کیا بات کہے گا۔ کیوں کر اس کا گھونگھٹ اٹھے گا۔

وہ کمرے میں آیا۔

تو نگاہ بیڈ پر گئی۔

وہاں زری بیٹھی تھی۔

لیکن پتھرائی پتھرائی۔۔۔ اس نے گھونگھٹ نکالا ہوا تھا۔ نہ ہی چہرے پر حیا آلود

جس دن وہ پشاور جا رہا تھا۔ وہ بھی دیدنی تھا۔ مٹی ڈیڑی اور مانی توجیران و پریشان تھے ہی۔ زوبیہ کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی۔ ویسے بھی ایک نھاسا وجود اس کے اندر تخلیق کے عمل سے گزر رہا تھا۔ یہ خرافی طبع اپنی جگہ اس نے تو اس وجود کے ہونے کی خوشخبری بھی ابھی شہباز کو نہ سنائی تھی۔ افتادیوں آن بڑی تھی کہ صدرے اور غم نے بالکل ہی مڈھال کر دیا تھا۔

شہباز اسے تسلیاں اور وعدے دیے جا رہا تھا۔ جیسے جیسے بن پڑتا تھا تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں جلد لوٹ آؤں گا۔ زوبیہ۔ میں اپنی زبان سے پھر نہیں سکتا۔ آؤں تو دیکھو۔“ اس نے اسے الگ کرتے ہوئے آخری بار کہا۔ تو زوبیہ نے دھندلائی آنکھوں اور پتھرائی آواز میں کہا: ”شہباز۔ میں آئیلی نہیں ہوں۔ تمہاری امانت میرے پاس ہے“

”امانت؟“

”ہاں۔ تم زری ہی کے ہو کر رہ گئے۔ تو میں اس امانت کے سہارے جی لوں گی۔“

”یعنی۔ یعنی۔ تم میرے بچے۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ شہباز بے اختیار سو گیا۔ اسے بازوؤں میں مہینچ لیا۔ نم آلود آنکھوں سے ایسے دیکھا اور بولا: ”یہ خوشخبری۔ کس وقت سنائی ہے زوبیہ۔ لیکن خیر۔ اب تو ہمارے بندھن کی یہ زنجیر بن گئی ہے۔ اب تو حوصلہ کرو۔ اس زنجیر کو کوئی نہیں توڑ سکتا۔ خان بابا بھی۔ نہیں۔“

وہ بچھڑ کر چلا آیا۔

گھر میں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا۔ وہ ہونا ضروری بھی تھا۔ بغاوت کی سزا تو ملنا چاہیئے تھی۔ وہ سب کچھ بڑے تحمل اور خاموشی سے سہے گیا۔ زوبیہ سے چھٹکارا دلانے کی بھی کوشش کی گئی۔ لیکن ایسا کرنا کسی کے بس میں نہیں تھا۔

گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ بی بی جان اور شاہینہ بے طرح مصروف تھیں۔

”شہباز: زری نے سر جھکایا۔ پھر آہستہ آہستہ سر اٹھائے ہوئے بولی: ہماری یہ ناشی شادی۔ آج ہی ختم ہو جانی چاہیے۔“

”زری: شہباز بے اختیار نہ چھینا۔ اور محبوبانہ انداز میں اس کی طرف پیکا۔

لیکن

زری نے ہاتھ بٹھا کر اسے قریب آنے سے روک دیا۔ ”نہیں۔ شہباز۔ وہیں کھڑے رہو۔ کسی جذباتی کمزوری کا شکار ہونے کی گنجائش نہیں۔ ہمارا یہ رشتہ آج اور ابھی منسوخ ہو جانا چاہیئے۔“

”زری:“

”جو بندھن بندھا ہی نہیں اسے توڑ دینا مشکل نہیں۔ تم مجھے طلاق دے دو۔“

”زری: شہباز گہری گہری سرخ سرخ آنکھوں سے اسے تکتے ہوئے بے صبری سے بولا: ”جانتی ہو کیا کہہ رہی ہو۔ سوچا بھی ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔“

”سب کچھ سوچ لیا ہے شہباز۔ نتیجہ یہ ہے اس لیے بھی نہیں ہوگا کہ طلاق کا لانا ہمارے سینوں میں دفن رہے گا۔ یہ بھی صرف خاندان کی آن بان روایات اور بہتری کی خاطر۔ مجھے یقین ہے۔ تم تعاون کرو گے۔“

”لیکن زری۔ زندگی کا سفر طویل ہے یوں اکیلے مسافرتیں طے کر لو گی۔“

وہ تلخ سی ہنسی ہنسی۔ شہباز نادام ہو گیا۔

زری بولی: ”مسافرتیں تو مجھے تنہا ہی طے کرنی ہیں۔ طلاق ہو یا نہ ہو۔ میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ تم اپنی بیوی کے وفادار نہ رہو۔ تمہیں اس سے کچھ چھپانا پڑے۔ اسے دھوکے میں رکھنا پڑے۔ میں تمہارے لیے آزمائشی بھی نہیں بننا چاہتی۔ کہ جب تم اپنے اس گھر آؤ۔ تو۔ تو میں۔ میں۔“

شہباز نے اک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ زری کے اندر جو ٹوٹ چھوٹ ہو

نہیں اور جھگی جھگی سرخیاں لہرا... رہی تھیں۔

وہ چند لمحے کھڑا رہا۔ زری نے اس پر اک بھر پور نگاہ ڈالی۔ وہ کانپ گیا۔ معذرت کرنے کو لفظوں نے شکل تو اختیار کی۔ لیکن آواز نہ پائی۔

زری خود ہی بیڑے اتر آئی۔ اس کے عین سامنے آتے ہوئے بولی: ”شہباز۔ یہ شادی تم نے شادی کی نیت سے نہیں کی۔ تم اس خون خرابے سے ڈر گئے۔ جو یہ شادی نہ ہونے کی صورت میں ہونا تھا۔“

وہ چند لمحے رک کر شہباز کو سپاٹ نظروں سے دیکھا۔ وہ ان نظروں کی تاب نہ لاسکا۔

سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولا: ”میں شرمندہ ہوں زری۔“

”اس کی کوئی ضرورت نہیں:“ اس نے رخ قدم سے واپس جان بگھاتے ہوئے کہا۔

”شادی میں نے نبھا کہنے کے لیے نہیں کی۔ تمہاری طرح میں بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ خاندان الگ ہو کہ دشمنی کی ایسی راہ پر گامزن ہو جائیں جو کہیں ختم نہیں ہوتی۔ صدیاں لڑائیں اس کی زد میں اگر تباہ و برباد ہو جاتی ہیں:“

وہ خاموشی سے سر جھکائے نادام نادام سا کھڑا رہا۔ زری نے بغیر اس کی طرف دیکھے آہستگی سے کہا۔

”دوسرے میں نہیں چاہتی تھی کہ تمہاری غلطی کی سزا زنگ لالہ اور شاہینہ جگتیں۔ وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں اور چاہتیں بکھر جائیں۔ شاید اس سے بڑی زیادتی اور کوئی نہیں۔“

شہباز نے نگاہ اٹھائی و زردیدہ سی نگاہ زری پر ڈالی۔ زری کی سبزی مائل نیلگوں آنکھوں میں غمی تر رہی تھی۔

شہباز مرتاپا کانپ رہا تھا۔ کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے۔ اس وقت وہ زوبیہ کو مچھول کر صرف اور صرف زری کو تنگ رہا تھا۔

## کایا پلٹ

وہ باتھ روم میں شیو بنا رہا تھا۔ تولیہ کندھے پر تھما اور چہرے پر شیونگ کریم لگا رکھی تھی۔ آئینے میں دیکھتے ہوئے وہ اپنے گال پر ریزر چلا رہا تھا۔ کہ اچانک ہی ببلو کے زور زور سے چیخنے اور رونے کی آواز آئی۔ وہ ریزر وہیں پھینک کر جلدی سے باتھ روم سے نکلا اور کمپن کی طرف لپک کر آیا۔ اس کا اندازہ غلط نہیں تھا۔ زیبی، ببلو کو پیٹ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ہچٹا تھا۔ اور اڑھائی سالہ مرنخ و سپید گولی مٹولی سا ببلو چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ اس کی ناک بھد رہی تھی، چہرہ آنسوؤں سے بھیگ رہا تھا۔ اس کے بال زیبی نے مٹھی میں بھر رکھے تھے۔ وہ اس کا سر جھٹک جھٹک کر دوسرے ہاتھ میں پکڑے جھٹے سے بڑے وحشیانہ انداز میں پیٹے جا رہی تھی۔

”زیبی۔“ وہ یہ منظر برداشت نہ کر پایا۔ اتنے زور سے چیخا کہ لگا درود دیوار مل گئے ہیں۔ ایک لمحے کو زیبی بھی ڈر گئی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں خون سا اتر آیا۔ اس نے ہلکی قوت سے جھٹا لہرایا لیکن ببلو کے گلنے سے پہلے ہی عمر نے اس کی کلائی پکڑ کر زور سے مردڑ لالی چمٹا ہاتھ سے گر گیا۔ عمر نے اُسے دھکا دے کر پرے ہٹایا۔ وہ کمپن کی کینڈیٹ سے ٹکرائی۔ عمر نے ببلو کو بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگاتے ہوئے کندھے پر پڑے تولیے سے اس کا چہرہ پونچھا اور خشنمناک نظروں سے زیبی کو گھورتے ہوئے بولا۔ ”آئندہ تم نے اسے ہاتھ بھی لگایا۔ تو ہاتھ توڑ دوں گا۔“

رہی تھی۔ اس سے بھی نہ تھی وہ اس بہادر لڑکی سے مرعوب ہو رہا تھا۔ جو اپنا آپ لٹا کر اس کے لیے زندگی سہل بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”شہباز۔“ زری نے آہستگی سے کہا ”زندگی کی راہ بڑی طویل ہے۔ لیکن جھک میں اسے مختصر کرنے کی کہیں کوشش نہیں کروں گی۔ تم اطمینان سے اپنی زندگی کی طرف لوٹ جانا۔ خاندان مصائب سے بچ گیا ہے۔ زرگل لالہ نے اپنی منزل پالی ہے۔ میرے لیے یہی کافی ہے میں اس خوشی کے سہارے جی لوں گی۔“

یہ گھر میرے چچا کا گھر ہے۔ اس گھر میں مجھے طلاق پا کر بھی رہنے کا حق ہے۔ تم نے اس راز کو راز رکھا تو کوئی الجھن پیدا نہیں ہوگی۔ سب۔ ٹھیک۔ رہے گا۔ سب۔“

”زری۔“ وہ بے اختیاری سے چیخا۔

لیکن زری نے اس بے اختیاری کو اختیاری جانا۔ اسی لیے ثابت قدمی سے اپنی بات پر قائم رہی۔ آخر شہباز نے اس نے نین بار طلاق کا لفظ کہلوا ہی لیا۔

پھر وہ شہباز کی طرف دیکھے بغیر اس کے کمرے سے نکل کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

شہباز ٹاٹا سا کھڑا رہا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زری کے اس فیصلے نے اسے آزاد کر دیا ہے یا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سلگتی آگ کی بھٹی میں ڈال کر کبھی زخم ہونے والی سزا دے دی ہے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی سزا۔

ضمیمہ کی سلگتی آگ کی بھٹی میں۔ ڈال کر۔

چمکا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن زیبی کو بچے سے نفرت کا دورہ سا پڑتا تھا۔ اور وہ کسی معمولی سی بات کا سہارا لے کر اُسے دھک ڈالتی تھی۔ بچہ تو مار پیٹ کے بعد عمر کا پیار پر اکر چپ ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ اذیت کے تازیانے اپنے دل و دماغ پر مسلسل برستے محسوس کرتا۔ سرب کی مہرابوں تلے سے گزرتے اس کی حالت دگرگوں ہو جاتی۔ وہ اتنا دکھی ہو جاتا کہ رُواں رُواں درد کی ناقابل برداشت کیفیت سے دوچار ہو جاتا۔ وہ سمجھ نہ پاتا کہ کیا کرے۔ اس نے پرج بولا تھا۔ اور یہ اس سچ کی سزا تھی۔ جو معصوم بچہ اور وہ خود بھگت رہا تھا۔

وہ اکثر سوچتا کراچ بولنا کیا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی کڑی سزائے۔ اس کا سچائی پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا تھا۔ لیکن کبھی کبھی اُسے زیبی پر ترس بھی آ جاتا۔ وہ اُسے حق بجانب سمجھنے لگتا۔ پرج تاخیر سے بولا جائے تو شاید جھوٹ کی بدترین شکل بن جاتا ہے۔ اس نے بہت دیر کر دی تھی۔ اس دیر نے زیبی اور اس کے درمیان اعتماد کی جو دیوار تھی۔ وہ دھما دی تھی۔ اس گری دیوار کے پلے تلے وہ دب گئی تھی۔ زخمی ہو گئی تھی۔ چھوڑ چھوڑ ہو گئی تھی۔

عمر بچے کو سینے سے لگائے چپ کرانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچوں میں گم ہوا جا رہا تھا۔ جو ہو چکا تھا اسے لٹانے پر قادر نہیں تھا۔ لیکن مستقبل کے لیے تو کوئی لائحہ عمل مرتب کیا جا سکتا تھا۔ زیبی اسی طرح سفاکی اور زندگی کا مظاہرہ کرتی رہی۔ تو کیا خبر کسی وقت غصے اور جوش میں وہ بھی لوٹی کا ردوائی کر بیٹھے۔ اس کے ہاتھ ہی توڑ ڈالے یا اُس کا گلہا ہی دبا دے۔

اُس نے بچے کو بیڈ پر بٹھا دیا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑی تصویر اس کے سامنے رکھ دی گھڑی تیکے تلے سے نکال کر اُس کے ہاتھ پر باندھی۔ اُس کے کاٹ سے چوں چوں کرنے والی چڑیا اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ رنگین بال ہاتھ میں پکڑائی۔ بچہ کھلونوں سے بھیلے لگا۔ وہ اب چپ تو ہو گیا تھا۔ لیکن اس کی ہچکیاں اس کے اندر وقفے وقفے سے اب بھی ٹوٹ رہی تھیں۔

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" وہ چلائی۔

"میں تمہارا گلا دبا دوں گا۔" وہ اس سے بھی زیادہ زور سے چیخا۔ بالکل پاگل ہی ہو جاتی ہو۔ وہ بیلو کو پیار کرتے ہوئے کچن سے نکل آیا۔ زیبی نے گلاس، پلیٹیں جو کچھ سامنے پڑا تھا غصے اور وحشیانہ پن سے توڑ ڈالے۔

عمر بکنا بھگتا اپنے بیڈ روم میں آ گیا۔ اُس نے بچے کے گال پر ہاتھ پھیرا اور بڑی محبت سے اُس کا منہ، سزا تھا چومنے لگا۔

بچہ اب بھی ہلک ہلک کر رہا تھا۔ ہچکیاں اُس کے اندر ٹوٹ رہی تھیں اور اس کے معصوم وجود کو جھٹکے لگ رہے تھے۔

"بس، بس میرا بیٹا۔" عمر نے بچے کو بیڈ پر بٹھا کر گلے میں پٹا تولیہ اتارا اور بیلو کا منہ ٹھیک سے پونچھنے لگا۔ وہ بے بسی سے بڑبڑا رہا تھا۔ میری غلطی کی سزا تو بھگت رہا ہے میرے بچے! بس، بس چپ ہو جا میری جان۔"

بچے نے چیخنا تو بند کر دیا تھا۔ لیکن اب بھی روئے جا رہا تھا۔ عمر اسے پیار کرنے اور چمکانے لگا۔ سائیڈ ٹیبل پر پڑی تصویر اس کو دی۔ اپنی گھڑی تیکے کے نیچے سے نکال کر اس کی کلائی پر باندھی۔ ساتھ ساتھ وہ اس سے باتیں بھی کرتا گیا۔ بچہ بہل رہا تھا۔ لیکن ہچکیاں اب بھی لے رہا تھا۔

کتنا خوبصورت کتنا پیارا، سُرخ و سپید گول دمٹول سا بچہ تھا۔ سیاہ بال اور بڑی بڑی کالی آنکھیں۔ اُبھرے اُبھرے سُرخ ریشمی بے داغ گالوں میں دھنسی ہوئی چھوٹی سی ناک۔ سُرخ ہونٹ، کپتا سے ہاتھ۔ موٹی موٹی ٹانگیں۔ عمر اُس کے ایک ایک عضو کو چومتے ہوئے زیبی کی سفاکی اور بے رحمی پر گڑھ رہا تھا۔ فرشتوں کا سناقتس تھا بچے کے چہرے پر۔ پھولوں کی سی دھبک آتی تھی اس سے۔ پھر بھی زیبی جلا دین جاتی تھی۔

یہ پہلی بار نہیں تھا۔ اس سے پہلے بھی بچے کے وحشیانہ پن سے بٹھنے کا نظارہ وہ کر

عمر بید پر بچے کے قریب ہی چٹ پڑ گیا۔ اس کے دماغ کی نسیں سننا رہی تھیں۔ جسم بے جان سا ہو رہا تھا۔ سوتھ کے زاویے بن بن کے بگڑ رہے تھے۔

زیبی ایسی تو نہیں تھی کبھی بھی نہیں تھی۔ اس کے سینے میں تو ممتا کے طوفان چھپے تھے وہ تو بچوں کی دیوانی تھی، بچپن ہی سے بچوں سے پیار کرتی چلی آئی تھی۔ وہ تو پیدائشی ماں تھی عمر اور وہ چچا زاد تھے۔ ایک ہی حویلی میں پلے بڑھے تھے۔ دونوں میں شروع ہی سے بڑا پیار تھا۔ ملنے کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ساتھ کھیلنے، لڑتے جھگڑتے، پیار کرتے وقت گزر رہا تھا۔ دونوں میں پیار بھی بہت تھا۔ لڑائی بھی بہت تھی۔ کچھ باتیں عمر کو اچھی نہ لگتی تھیں۔ کچھ زیبی کو۔ جب فکر اڑ ہو جاتا و دونوں ہی لڑ پڑتے۔ رڑتے بھی اس طرح کہ بڑوں کو بیچ بچاؤ کے لیے آنا پڑتا۔

زیبی تو شروع ہی سے ننھے ننھے ممتا بچوں سے پیار تھا۔ بڑی بھابی بازار جاتیں۔ تو ممتا اس کے حوالے کر جاتیں۔ چھوٹی آپا کا راجو تو سدا ہی اُس کے پاس رہتا۔ چھوٹی آپا کی مینا بھی زیبی کو بہت اچھی لگتی۔ جب بھی وہ میکے آتیں۔ زیبی مینا کا دودھ پنانے، ڈائپر بدلنے کا ذمہ لے لیتی۔ پیارے پیارے بچوں میں تو اُس کی جان ہوتی تھی۔ اور اسی بات سے عمر کو چڑھتی۔ وہ اُسے کھیلنے کے لیے بلاتا۔ ”زیبی آؤ نا۔ آج

ہم سب کرکٹ کھیلیں گے۔“

”لیکن مینا کو کون اٹھائے گا۔“

”پھینکواسے۔“

”ہائے اللہ۔ دیکھو تو کتنی پیاری ہے۔ جاؤ بابا، میں نہیں کھیلتی۔ تم راشد اصغر اور نبیلہ کے ساتھ کھیلو۔ میں نے ابھی اس کی بوتل دھونی ہے۔ دودھ کا وقت

ہو رہا ہے۔“

”تم اس کی آیا ہو۔؟“

”واہ جی۔ کیا ہی یہ کام کرتی ہے۔“

”تو پھر اس کی اماں ہو۔“

”بلواس بند کرو۔ بنا سو پچے سجھے منہ سے باتیں نکال دیتے ہو۔ خبردار جو ایسی بات پھر کبھی کی تو۔“

”تو کیا کر لو گی۔ بچے کھانا کیوں نہیں چھوڑتیں تم۔ نوکرانی بنی رہتی ہو سب کی۔“

”عمر! میں تمہیں ماروں گی۔“

”ہاتھ اٹھا کر تو دیکھو۔ مینا کو فرشس پر نہ بٹخ دیا تو عمر نام نہیں۔“

”بڑے آئے مینا کو تھخنے والے۔“

اسی بات پر دونوں اُلجھ پڑتے۔ ہاتھ پائی پر اُتر آتے۔ کبھی کبھی تو دونوں کے درمیان سجدہ آکر پٹ جاتا۔ شور مٹا رہا چل جاتا۔ بچے کی ماں دوڑی آتی۔ دونوں کو الگ کر کے بچے کو لینے کی کوشش کرتی۔ لیکن زیبی بچے کو الگ کندھے سے لگا کر تھکتے ہوئے غونسنے لڑھکے سے عمر کو دیکھ جاتی۔

عمر چاہتا تھا زیبی زیادہ سے زیادہ وقت اُسے دیا کرے۔ اُس کے ساتھ کھیل کے کھایا پیا کرے۔ اسکول کا کام کیا کرے۔ جب وہ ایسا نہ کرتی تو عمر جان بوجھ کر اپنی دوسری ہم عمر لڑکیوں سے گھل مل کر کھیلتا۔ زیبی کو نظر انداز کرتا۔ زیبی کو یہ بات بہت بُری لگتی وہ غصے سے بیچ و ناب کھاتی۔ اُن کزنوں سے لڑ پڑتی۔ جو عمر کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھیں عمر کو بھی خوب کوسنے دیتی۔ اور پھر منہ پھیلائے گھومتی پھرتی۔ عمر کو اپنا غصہ دکھانے کی کوشش کرتی رہتی۔ غصہ عمر کا دیر پا ہوتا نہ زیبی کا۔ دونوں جلد ہی گھل مل بھی جاتے زیبی ہوم ورک لے کر اس کے پاس آ بیٹھتی۔ وہ اس کا بہت سا کام خود کر دیتا۔ کھانا بھی دونوں اکٹھے ہی کھاتے۔ کبھی زیبی اُن کی میز پر جا بیٹھتی اور کبھی عمر کے اُن کے دستہ خوان پر آ بیٹھتا۔



”عادت نہیں گئی ناتمہاری بھی۔“

”کونسی؟“

”ٹریکوں کو تاکنے جھانکنے کی۔“

”یہ تو اپنی ہوئی ہے میرے تمہارے پیار میں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”تو سمجھ لو کہ ننھے ننھے پیارے پیارے بچوں کو کھلانا بھی میری ہوئی ہے اس سے میرے

تمہارے۔“

”پوری بات کرو نا۔“

”ہٹو بھی۔“

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتا۔ زیبی بھی ہنس پڑتی۔

یوں ہنسنے کھیلنے دن گزر رہے تھے۔ عمر بچا ش تو نہیں لیکن کچھ دل بھینک قسم کا نوجوان ضرور تھا۔ جہاں کہیں جوان لڑکیاں دیکھی۔ نظر ٹپک گئی۔ فلیکٹ کرنا خوب جانتا تھا۔ محبت و محبت کا تو قائل نہیں تھا۔ اس لیے کہ اسے محبت صرف اور صرف زیبی سے تھی۔ خوبصورت اور اسکاٹ سی زیبی تو اپنی تھی ہی۔ زیبی اس کی اس عادت کو جانتی تھی۔ کبھی کبھی بُرا بھی مان جاتی۔

سلمیٰ آپا کی چھوٹی ننھی شادی پر جانے کہاں سے دھیروں جوان لڑکیاں اکٹھی ہو گئی تھیں۔ خوش شکل، خوش لباس، خوش ذوق، قسم کی لڑکیاں سلمیٰ آپا کے سسرال میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھیں۔ عمر کو تو خدا ایسا موقع دے۔ پریوں کے اکھاڑے میں راجہ اندر بننے کی اُسے بڑی خواہش ہو کرتی تھی۔ اب تو جیسے اُس کی مراد برآئی تھی۔ لڑکیاں لڑکے مل جل کر ہلاکلا کرتے ہیں۔ اس پر بھی کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو ایسے موقع ملتے ہیں کہ ایک ہی گھر میں پورے کا پورا خاندان برادری اکٹھی ہو جاتے۔ بزرگ اپنی محفل جمایاتے ہیں۔ عورتیں لباس اور زیورات کی فائش میں لگ جاتی ہیں اور نوجوان

وقت پر لگا کر اڑتا چلا جا رہا تھا۔ دونوں جوان ہو گئے تھے۔ والدین نے دونوں کی پسند اور پیار کو دیکھ کر انھیں ازدواجی بندھن میں باندھنے کا فیصلہ بھی کر دیا تھا۔ عمر انجینئرنگ کے آخری سال میں تھا۔ اور زیبی سیکنڈ ایئر میں۔ جب دونوں کی باقاعدہ ملگنی کر دی گئی تھی۔ دونوں اس بندھن سے بہت خوش تھے۔

”زیبی۔“ عمر اُسے اکثر پھیرتا۔

”کیا ہے۔“

”تم پر ظلم تو نہیں ہوا۔“

”کیسا؟“

”میرے پتے ہمیشہ کے لیے بندھنے کا۔“

”مہم اپنی کہو۔“

”مجھ پر تو خاصا ظلم کیا ہے انا بزرگوں نے۔“

”تو پھر انکار کر دونا۔“

”تمہارا خیال آجانا ہے۔ انکار کیا تو رو رو کر مر جاؤ گی!“

”بالکل نہیں مروں گی۔“

”اچھا ایک بات تمہیں ماننا ہو گی۔“

”کیا؟“

”یہ سچے کھلانا چھوڑ دو۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ جب اپنے سچے...“

”ہاٹے اللہ۔ کتنے خراب ہو تم۔“

”کیسے؟“

ہر لڑکی عمر سے جدا ہوتے وقت اپنے جذبات کا اظہار کر رہی تھی۔ کنول اور تجو تو رو بھی پڑی تھیں۔ بڑی دل گرفتہ تھیں۔

زیبی جانتی تھی کہ عمر کسی کے متعلق بھی سنجیدہ نہیں۔ پھر بھی اُسے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ شادی کے یہ چار دن اُس نے بڑی کوفت اور ذہنی اذیت میں بسر کر گزارے تھے۔ عمر بھی تو ان لڑکیوں کے حسین چہرے میں یوں غائب ہوا تھا کہ زیبی کی طرف دھیان دینے کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ زیبی نے عمر کی پسند کے پڑے پہنے تھے۔ لیکن اُسے ایک بار بھی اُن کی تعریف کرنے کا موقع نصیب نہ ہوا تھا۔ زیبی اسی لیے تو اس سے روٹھ گئی تھی۔

شادی کا ہنگامہ ختم ہوا۔ جہان چلے گئے۔ عمر اور زیبی بھی اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے ساتھ گھروں کو واپس لوٹ آئے تو زیبی منہ پھلائے پھرتی رہی۔

”اے“ عمر کو جیسے اب اُس کا خیال آیا۔

”کیا ہے؟“ وہ دہشتی سے بولی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“

”کچھ نہیں۔“

”یہ موڈ کیوں آگیا ہے؟“

”شکر ہے تمہیں یہ جاننے کی فرصت تو ملی۔“

عمر نے قہقہہ لگایا۔ زیبی کو غور سے نکتے ہوئے بولا۔ ”غلامی ہو؟“

”میں کیوں ناراض ہونے لگی؟“

”جل سبُن گئیں نا۔“

”جی۔ نہیں۔“

”میرا لڑکیوں سے گھٹنا ملنا تمہیں اچھا نہیں لگا۔“

”میں کون ہوئی ہوں تمہیں۔ روکنے والی؟“ زیبی کی آواز بھرا گئی۔ دوسرے لمحے وہ منہ

اپنی دنیا بلیتے ہیں۔ دو چار دن بڑے رنگیں بڑے حسین گند جاتے ہیں۔

سلمیٰ آپا کی نند کی شادی میں گھٹنے ملنے کا موقع سب ہی ٹوٹا تھا۔ عمر نے تو اس موقع کو سنہری جانا تھا۔ نند نے شکل و صورت اچھی دی تھی۔ قد کاٹھ کا بھی خوب تھا چہرہ زبانی زبانی میں ماہر۔ نظر بازی کا شوقین۔ لڑکیاں اس کے دام میں بنا چوگا ڈالے ہی چلی آتی تھیں۔ وہ بھی اُن کی محفل میں برابر کا شریک تھا۔ کسی سے منہ نہیں مذاق کر رہا ہے۔ کسی کی تعریفیں کرتے زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ کسی کو چپکے چپکے تلے جا رہا ہے۔ لڑکیوں کے حسین چہرے میں ڈھولک بیلے بیٹھا ہے۔ مایہ کے ٹپے سنار رہا ہے۔ تاک تاک کر نشانہ لگا رہا ہے۔ شادی کے ہنگامے اور ہلا گلا میں کئی لڑکیاں اُس کے قریب آگئیں۔

”عمر بھول تو نہیں جاؤ گے ہمیں۔“

”عمر تمہارے بغیر زندگی ایک دم سوئی ہو جائے گی۔“

”میرا تو یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہ رہا۔“

”اب پتہ نہیں کب ملنا ہو۔“

”تم ہمارے ہاں آیا کرو نا۔ اسخو تو میری کے بھانجے ہو۔ دُور کے سہی۔“

”میرا رشتہ تو بہت قریب کا۔ امی ابو دونوں کے رشتے دار ہو۔“

”عمر یہ دن میری زندگی کا حاصل ہیں۔“

”مجھے تو روٹنا کر رہا ہے واپس گھر جاتے ہوئے۔“

kutubistan.blogspot.com

”میں تمہیں پسند ہوں نا۔“

”میری آنکھوں کی تم نے اتنی تعریف کی ہے کہ جی چاہتا ہے آئینے میں ہر وقت اپنی آنکھیں

جی دیکھتی رہوں۔“

”ہائے اللہ! پاک چپکے میں چار دن گزر گئے۔ ہم آج واپس جا رہے ہیں عمر۔“

”میں تمہیں کیسے بھلا سکوں گی عمر۔ تم میری رُوح میں سما گئے ہو۔“

وہ کھسکھس کر سنس پٹا پھر اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیارے میں بھر کر بولا۔ "کیسی چچی ہو تم؟"

"منہ دھور کیجیے۔ میں نے تو مذاق کیا ہے"

"اور میں نے بھی مذاق سمجھا ہے۔ جانتا ہوں اتنے دل گردے کی نہیں ہو تم؟"

"تمہیں سیدھا کر لوں گی۔"

"کب؟"

"کب۔ کیا۔"

"شادی کے بعد نا؟"

"یہ ساری عادتیں ایک دم چھوڑنا پڑیں گی، سمجھ جناب؟"

"بیر پابندی مت لگانا زیبی؟"

"کیوں؟"

"میں بھی پابندی لگا دوں گا۔"

"کس بات پر؟"

"اس بات پر کہ تمہارے دو روزہ دیک کوئی شیر خوار بچہ نظر نہ آئے؟"

"زیبی شراب لگا کر بولی۔" ایسا تم نہیں کرو گے؟"

"کیوں نہیں کروں گا؟"

"اس لیے کہ شادی کے بعد۔ ہمارے۔ ہمارے اپنے بچے؟"

"اوں ہوں۔ قطعاً نہیں۔ اپنے بھی نہیں ہوں گے؟"

"زیبی نے بے اختیار اُس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھبراتے ہوئے انگلیاں کہا۔" ایسی

بڑی باتیں مت نکالو زبان سے؟"

وہ اُس کے ہاتھ پر دانت سے ہولے سے کاٹتے ہوئے بولا۔ "تم بھی اُنٹی سیھی پابندی"

لگانے کی باتیں نہ کیا کرو۔"

ہاتھوں میں چھپا کر اپنے آنسوؤں کو چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

"ادھو۔ ہو۔ سوری زیبی؟" عمر جلدی سے بولا۔ وہ رونے لگی۔ عمر اُسے بہانے

پھسلانے لگا۔ اس نے اپنے روتیے کی کٹی بار معافی مانگی۔

"مجھے تمہاری یہ عادت زہر لگتی ہے؟" زیبی دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچتے ہوئے بولی۔

"کیا کروں۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ لیکن زیبی۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے نا، دفعتی ہوتا ہے۔"

اب دیکھو نا، سب لڑکیاں چلی گئیں۔ قسم لے لو۔ جو مجھے کسی ایک کا ناں بھی یاد ہو؟"

"فلرٹ کہیں کے؟"

"تمہیں فلرٹ نہیں کرتا کم از کم؟"

"کیا پتہ؟"

"بکواس بند کرو؟"

"عمر؟"

"میرے جذبات کو ایسی باتوں سے ٹھیس نہ پہنچا یا کرو۔" جانتی ہو مجھے اچھی طرح۔"

زیبی مرعوب و متاثر ہو کر اسے تکتے لگی۔ اس کی آنکھوں میں پیار کا سمندر ٹھاٹھیں مار

رہا تھا۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

وقت کا چکر چلتا گیا۔ ہر گھماؤ دونوں کو قریب لانا گیا۔ زیبی، عمر کی اس خامی کی عادی

ہو گئی تھی اور عمر زیبی کی بچوں کی آغیر کی کرنے سے مانوس ہو گیا تھا۔

"زیبی؟" ایک دن اس نے زیبی سے کہا۔

"ہوں؟"

"میں پاس ہو جاؤں گا تو تم مجھے کیا تحفہ دو گی؟"

وہ ہنس کر بولی۔ "اپنی دو ایک حسین اسکارٹ ہسلیوں سے چند دن دوستی کرنے

کی اجازت؟"

سے میں تحفہ لینا کیوں نہ چاہوں گی۔  
 ”ابھی لاتا ہوں۔ دیکھ کر خوش ہو جاؤ گی۔“  
 ”لایئے۔“

عمر لپک کر گیا۔ اور زری بھابی کا تین دن کا مناجو ہلکے نیلے کبیل میں لپٹا تھا اٹھا لیا۔  
 زری برآمدے کی سبڑھیوں پر گول ستونوں سے ٹیک لگائے بیٹھی شاید اس تحفے کے متعلق  
 قیاس آرائیاں کر رہی تھی۔ جو عمر لینے گیا تھا۔  
 عمر ہولے ہولے چلتا ادھر آیا۔ اور زری کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ پھر جھکا اور زری کی گود  
 میں منادال دیا۔

زری نے منے کو دیکھا پھر گردن گھما کر پیچھے نظر ڈالی۔ عمر سنس رہا تھا۔  
 ”یہ۔ یہ۔ اسے کیوں اٹھا لائے۔ باہر سردی ہے۔ ابھی تین دن کا ہوا ہے یہ چارہ“  
 وہ بچے کو ساتھ چمٹا کر پیار کر سنے ہوئے بولی۔  
 ”تحفہ لایا ہوں تمہارے لیے۔“ وہ شوچی سے اُسے دیکھتے ہوئے ہنسنا۔ ”کیسا ہے؟“  
 ”بہت پیارا“ بہت اچھا۔“ زری نے بچے کے گلابی گال پر ہونٹ رکھتے ہوئے کہا۔  
 ”جب تک ہماری شادی نہیں ہو جاتی نا۔ اس تحفے کو سینے سے لگائے رکھنا دیا گیا  
 کہ تمہیں پوری آزادی اور اجازت ہے۔“

زری مسکراتے ہوئے شوخ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ پھر بولی ”ان بچوں میں تو میری  
 جان ہے عمر۔ تمہیں بتا نہیں سکتی کہ چھوٹے چھوٹے یہ معصوم اور مقدس بچے مجھ کتنے اچھے  
 لگتے ہیں؟“

”لگتا ہے پیدائشی ماں ہو تم۔“ وہ مسخرے سے بولا۔  
 ”ہر عورت پیدائشی ماں ہی ہوتی ہے عمر۔“ وہ بچے کو پیرا سے سیٹے ہوئے اٹھ کھڑی  
 ہوئی۔ عمر بڑا متاثر ہوا۔ اُسے بڑی تعظیم سے دیکھنے لگا۔

زری نے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ عمر شوخ پیار بھری نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے ہنس پڑا۔  
 عمر نے امتحان پاس کر لیا۔  
 گھر میں خوب خوش منانی گئی۔ تعلیم کا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔ زری بھی بہت خوش تھی۔  
 اس نے ایک خوبصورت پل اور اسے دیا۔ اور یہ پل اور اس نے خود اس کے لیے بڑی محنت  
 اور نفاست سے تیار کیا تھا۔  
 عمر بہت خوش ہوا۔ ”کہاں چھپ چھپ کر بناتی رہیں۔ میں نے تو ایک دن بھی تمہیں  
 بنائی کرتے نہیں دیکھا۔“

”رات کو بناتی تھی۔ تم پہلے سے دیکھ لیتے تو اتنے خوش نہ ہوتے۔“  
 ”واقعی؟“

”پسند آیا؟“  
 وہ ہنس کر بولا۔ ”تم پسند آگئی ہو تو تمہاری ہر چیز بھی پسند ہے۔“  
 وہ خسرے مسکرا دی۔

پھر اسی شام کو شرارت سوچی۔ زری سے بولا۔ ”زری؟“  
 ”ہاں۔“

”بھئی تم نے مجھے پاس ہونے کا تحفہ دیا۔“  
 ”تو پھر۔“

”تمہیں بھی تحفہ ملنا چاہیئے۔“  
 ”مجھے۔ مجھے کیوں؟“

”تمہیں اس لیے کہ تمہارا منگیتر پاس ہوا ہے۔ منگیتر۔ جو نوکری ملتے ہی تمہارا شوہر  
 نامدار بن جائے گا۔“

وہ خوش دلی سے مسکرانے ہوئے بولی۔ ”بڑی فرائضی ہے لایئے دیکھئے تحفہ۔ اس حوالے

”فکر کی کوئی بات نہیں بیٹے۔ انگ گھر چلانے میں اگر دقت محسوس کر دو گے۔ تو زیبی بہار پاس ہی رہا کرے گی۔“

”اؤں ہوں۔ یہ بات غلط ہے امی۔ شادی کروں گا تو زیبی میرے ساتھ ہی رہے گی۔“  
”تیری خوشی۔ میں تو یہی بات کر رہی تھی۔ یہ گھر تمہارا اپنا ہے۔ گوشش کرنا تمہاری پوسٹنگ یہاں ہی ہو جائے۔ اپنے گھر میں رہنے سے سوطر کی بچت ہوتی ہے۔“  
”مشکلوں سے نوکری ملتی ہے امی۔ جہاں مجھے ملے رکھیں گے۔ وہیں رہنا ہوگا۔ شاید مجھے کچھ عرصہ خوشاب میں رہنا پڑے پھر سرگودھا۔“

”چلو جہاں بھی رہو خوش رہو۔ شادی اتنا ہی میں نہیں ڈالی جاسکتی۔ تیرے چچا جی اس فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں اب تو زیبی نے بھی بی لے کر لیا ہے۔ گھر تو نہیں بٹھانے رکھنا اُسے۔ اُن کی اور بھی سچیاں ہیں۔“  
امی نے اُسے سمجھا بکھا کر اُسے راضی کر لیا۔ راضی تو وہ تھا ہی صرف یہی چاہتا تھا کہ مالی طور پر اپنے آپ کو کچھ مستحکم کر لے۔

امی کے خیال سے متفق ہو کر وہ زیبی کے پاس آیا۔ زیبی ان دنوں اس سے بہت شرمانے لجانے لگی تھی۔ کچھ تیاریوں میں لگی تھی۔ خریداری میں ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ سلائی کی کئی چیزیں خود تیار کرنا تھیں۔ گھر گھر مشین چلاتی رہتی۔ دوپٹوں میں گونا گونا مکتی رہتی۔ کئی کام سہیلیوں کے سپرد دیکتے تھے انھیں دینے لینے اتنی جاتی رہتی۔ یوں عمر سے بہت کم آسنا سامنا ہوتا۔ عمر کی بھی ننھی ننھی نوکری تھی۔ خوب بخت کر کام کر رہا تھا۔ زیبی اپنی ہی تو تھی۔ اور اب تو مستقل اپنا ہو جانا تھا۔ اس لیے اُسے کترانے شرمانے کی چھٹی دے رکھی تھی۔

اُس دن وہ اُس کے کمرے میں چلا آیا۔ زیبی مشین پر گلابی رنگ کا پیٹی کوٹ سی رہی تھی۔ ارد گرد ریشمی رنگارنگ کپڑے تہہ شدہ اور کھلے پڑے تھے۔ دس بارہ جوڑے درزی سے سل کر آئے تھے۔ رنگ ساز دوپٹے رنگ کر دے گیا تھا۔ ایک طرف لوہے کے دو بکس

عمر نے ٹیکنیکل انجینئرنگ کی تھی۔ رزلٹ آتے ہی نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ جہاں کہیں خالی جگہ ہوتی وہ درخواست دے دیتا۔ بہت دور دھوپ کرنا پڑی۔ پورا سوا سال اسی تنگ و دو کی نظر ہو گیا۔ پھر ابلے کے ایک ایم پی اے دوست کی وساطت سے اُسے واپڈا میں ایس ڈی او کی پوسٹ مل گئی۔

ادھر نوکری ملی ادھر شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔  
عمر ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سال دو سال کا کر کچھ آنا نہ بنالینے کی خواہش تھی۔ زیبی اپنی ہی تو تھی۔ نہ وہ کہیں بھاگی جاتی تھی نہ وہ خود۔ اس نے اس بات کا اظہار امی سے کیا۔ ”امی چار پیسے تو پاس ہو جائیں۔ شادی بھی کر لوں گا۔“

”تنخواہ کافی نہیں ہے کیا؟“  
”نا کافی ہی ہے۔ اتنے پیسوں میں ڈھنگ سے جیا جانے کا۔“  
”کیوں نہیں۔ کمی کس بات کی ہے۔ شروع شروع میں ایسے ہی ہوتا ہے۔ گھر چلانا سیکھو گے اس طرح۔“

”امی ننھی ننھی نوکری ہے۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں رکھیں گے ابھی۔“  
”یہ تو اور بھی اچھا ہے چھوٹے شہروں میں گزر بسر آسانی سے ہو جاتی ہے۔ پھر پریشانی کی کیا بات ہے ضرورت کی ہر چیز تمہیں ہمیز کی صورت میں مل جائے گی۔ روپے پیسے کی تنگی بھی تمہیں نہیں ہوگی۔ ہم جو ہیں۔“  
”ٹھیک ہے۔ بعد میں باتیں نہ بنائیں گا۔ ضرورت کے وقت آجایا کریں گے آپ سے پیسے مانگنے۔“

”شادی تو ہو لینے دے۔ سارے طریقے سیتے آجائیں گے خود ہی۔ زیبی بڑی سنگھڑ اور سیانی بیٹی ہے۔“  
”ہوں۔“

پڑے تھے۔ دوسری طرف چڑے کے سوٹ کیس رکھے تھے۔ جو چیزیں تیار سوچکی تھیں وہ ان بکسوں اور سوٹ کیسوں میں رکھی جا رہی تھیں۔

”زیبی!“ عمر کرے میں آتے ہی زیبی کے گرد و پیش نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا درزی خانہ کھول رکھا ہے؟“

زیبی نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ مشین کی ہتھیلی پر ہاتھ رک گیا۔ شرمیلی ادا سے اُسے دیکھا۔

”یہ کیا بکھڑا ڈال دیا ہے؟“ وہ اس کے سامنے بکس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”کیا؟“ زیبی بولی۔

”بہت جلدی ہے تمہیں شادی کی؟“

زیبی نے شرمیلی ادا سے اُسے دیکھا۔

”کیا ڈاکرو کی میرا۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”کیا ڈاکو تمہارے والدین کا ہو رہا ہے؟“

وہ اُسے حیرت سے کو بولا۔ ”مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ تمہیں اتنی جلدی کس بات کی تھی؟“

”مجھے؟“

”ہاں تمہیں۔“

”تم!“

”بھئی شادی تو بھاری ہونا ہی تھی۔ کیا ہرگز تھا جو دو چار سال بعد ہو جاتی۔“

زیبی نے حیرانی سے اُسے دیکھا۔

”ہرگز تھا کوئی؟“ — عمر نے جھک کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر دی۔

”ہاں تھا۔“

”کیا؟“

”تم بالکل ہی مادر پدر آزاد ہو جاتے۔“

وہ اُس کی بات پر کھٹکھٹا کر ہنس پڑا۔ زیبی مسکراتے ہوئے پکلیں جھپکانے لگی۔

”تو گویا تم میری آزادی پر پابندی کی ٹھہرن جاؤ گی۔“

”بالکل۔“

”بہت خوش ہو۔“

”تم نہیں ہو کیا؟“

”ہوں تو۔ لیکن فکر مند بھی ہوں۔“

”وہ کیوں؟“

”زیبی۔ بات یہ ہے کہ میری تنخواہ جو ہے نا، ابھی اتنی نہیں کہ....“

زیبی ہنس پڑی۔ ”ابھی سے فکر تانے لگی؟“

”فکر کی بات تو ہے ہی۔ کرائے کا گھر لینا پڑے گا۔ نوکر رکھنا پڑے گا۔ سبھی پانی کا

خرچہ ہوگا۔ کھانے پینے....“

”ٹھیک ہے۔ تنخواہ تمہیں لا کر دے دیا کروں گا۔ تم بیاننا اور تمہارا کام۔ پیسوں کے لیے

لڑنا جھگڑنا نہیں مجھ سے۔ بڑی بھائی اور بھتیجا کی طرح سمجھیں۔ لڑائی جھگڑے سے میری

ہان جاتی ہے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ پھر بولی۔ ”یہی کہنے آئے تھے۔“

”نہیں۔ آیا تو تمہیں دیکھنے تھا چھپتی تو پھرتی ہو مجھ سے۔“

زیبی نے شرماکہ سر جھکا لیا۔

”ہم دونوں تک خوشاب جا رہے ہوں۔“ وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد بولا۔

”واقعی؟“

”ہاں۔ چھوٹی سی جگہ ہے رہ لوگی وہاں۔“

انتظار کرتے کرتے تھک چکا ہوگا۔ جلد عروسی میں رنگ و نور کا ٹھاٹھیں ملتا سمندر اور خوشبوؤں کی مہک بھی جان لیوا انتظار سے شدت کم ہو رہی ہوگی۔

رات کا بہت سا خوبصورت صبح رسوں کی نذر ہو گیا۔ جانے رات کا کونسا پہرہ تھک جودہن کی خلاصی ہوئی۔ اور سہانگیں سہاگ گیت گاتے ہوئے اسے جلد عروسی میں لے آئیں۔

زیبی سرنخ زندگی کی گٹھری بنی چھڑکٹ پر بیٹھی تھی۔ کمرہ نیا تھا۔ عرا جینی پھر بھی دنیا بول گئی تھی۔ عمر بھر کے دیکھتے ہوئے خواب تعبیر کے سانچوں میں ڈھل گئے تھے۔

خواب جو خوبصورت تھے۔ رنگارنگ تھے۔ مکمل تھے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت عمر کی تھی۔ لگتا تھا ادھوری زندگی کی آج تکمیل ہو گئی ہے۔

:محببتوں نے عروج کو چھو لیا ہے، رفاقتیں قریبوں میں بدل گئی ہیں۔ دونوں غمش تھے بے انتہا غمش۔

دونوں شردا ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے چلے آ رہے تھے۔ لیکن یہ چاہتیں ڈھکی چھپی تھیں۔ آج ان چاہتوں کے اظہار ہو رہے تھے۔ محبتوں کے اقرار ہو رہے تھے۔

دونوں ایک دوسرے میں گم تھے۔ ویسے کے بعد دونوں ہفتہ بھر کے لیے مری چلے گئے۔ مری کے سبزہ زاروں میں، کوسلوں میں دونوں شاداں و فرحان گھومتے پھرتے رہے۔ تنہائیاں یکجا بیٹوں کے لیے سازگار تھیں۔

”زیبی“ اس دن جب بادل بہت نیچے جھک آئے تھے۔ اور ان کا دھواں سا ہٹل کے کمروں میں بھی گھس آیا تھا۔ باہنوں میں پیٹی زیبی سے عمر نے والہانہ انداز میں کہا۔

”ہوں“ وہ ہر پیردگی کے عالم میں تھی۔

”زیبی۔ ازدواجی زندگی کی ابتدا کتنی حسین ہے“

”ہاں“

”خدا کمرے یہ حسن سدا برقرار رہے“

”جگہ چھوٹی ہو یا بڑی کیا فرق پڑتا ہے“

”سبح؟“

”ہاں“

”تم بہت اچھی ہو زیبی۔“

”اب پتہ چلا“

عمر نے پیار سے بھرپور نگاہ اس پر ڈالی۔ زیبی کے گالوں پر شفق پھوٹ پڑی۔

شادی کی گھاگھی کٹی دن رہی۔ عمر کی پوسٹنگ خوشاب ہو گئی تھی۔ شادی کے ہنگامے اور ہنگامے میں شریک ہونے کی حسرت ہی رہی۔ چند دن کی چھٹی ملی تو وہ اُس نے شادی کے

بعد ہنی مون منانے کے لیے سنبھال رکھی۔ مہندی کی رات وہ خوشاب سے گھر پہنچا۔ شادی بڑے چاؤ بڑے ریت و روانہ سے ہوئی۔ دونوں طرف سے اچھے شگون کے

لیے چھوٹی بڑی رسمیں ذوق و شوق سے ادا کی گئیں۔

زیبی نے باہر تو کہیں جانا نہیں تھا۔ حویلی کے ایک حصے سے دوسرے حصے میں دلہن بن کر آتا تھا۔ لیکن رافینہ چچی اور چھوٹی بڑی جمابیوں کا اصرار تھا کہ زیبی دلہن بن کر ڈولی میں

ضرور بیٹھے۔ گھر کے مردوں کو یہ بات مضمکہ خیز لگتی تھی۔ لیکن خواتین اسے بدشگوننی قرار دے رہی تھیں۔ ڈولی کے بغیر دلہن کا تصور ہی ادھورا

لگتا تھا۔ چنانچہ زیبی کو ڈولی میں بٹھایا گیا۔ گلی کا چکر لگا کر ڈولی سسرال کے دروازے پر آئی۔ پھر دلہن اس دروازے پر اترتی۔ صدمتے اتارے گئے پھول برسائے گئے۔ خوشبوئیں چھڑکی

گئیں۔ پورے اہتمام کے ساتھ دلہن کو اندر لایا گیا۔ جہاں چھوٹی موٹی بے شمار رسمیں ہوتیں۔ خوشی و مسرت سے چہرے دمک رہے تھے۔ قہقہے ابل رہے تھے۔ ہنسیوں کی مترنم مچھل بریں

رہی تھی۔ سب بہت خوش تھے۔ اس خوشی میں سب اتنے گمن تھے کہ کسی کو خیال تک نہیں آیا کہ دلہن بے چاری کی کمر تنہا ہو چکی ہوگی۔ گردن اکڑ گئی ہوگی۔ اور اس کا سوا گت کرنے والا دلہا

”یقیناً رہے گا۔“

”تم سدا سے مجھے اپنی لگتی تھیں۔ لیکن اپنی ہو جانے کا... احساس جتنا حسین ہے بتا نہیں سکتا۔ تم بھی ایسا ہی محسوس کرتی ہونا۔“

”ہاں۔“

”بھولنا آنگن ان پھولوں سے۔“

”ہاں عمر۔“

”ہٹو۔ شرمیہ۔“ وہ اس کے گلے میں بازو ڈال کر اُس کے سینے میں چھپے ہوئے بلی۔  
”نہیں چاہئیں بچے۔“ وہ شوخی سے کہنے لگا۔

”زیبی۔“

”ہاں۔“

زیبی نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔  
عمر نے ہنستے ہوئے اس کا سر بازو پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ  
تھام کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور بولا۔ ”کتنے بچے ہوں گے ہمارے۔“  
زیبی نے شرماکر آنکھیں بند کر لیں۔ اُس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے۔  
”صرف دو۔“ عمر بولا۔

”اب تو تم سے ایک دن بھی جدا ہونے کی ہمت نہیں۔“

”ہم جدا ہوں گے ہی کیوں؟“

”میرے ساتھ ہی چلو گی نا خوشاب۔“

”ہاں!“

”چھوٹا سا گھر ملا ہے۔ رہ لو گی نا وہاں۔“

”مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے عمر۔ چھوٹا سا گھر ہماری چھوٹی سی بھرت ہو گی۔“

”اس چھوٹی سی بھرت میں ہم دونوں چھپکتے پھریں گے،

”ہاں عمر۔“

”زیبی!“

”ہوں۔“

”ہمارا چھوٹا سا گھر بہاروں کا امین ہو گا۔ فردوسی رعنائیوں سے بھر جائے گا۔ پھول

مہکیں گے۔“

”ہاں عمر۔ نیٹے نیٹے مئے پھول۔ شاداب تر و تازہ۔“

عمر نے اس کے بالوں میں منہ چھپا کر دھیرے سے سرگوشی کی۔ ”تمہیں ننھے مئے بچے

”اول ہوں۔“ زیبی نے آنکھیں بند کیے کیے سرفنسی میں ہلایا۔

”پھر کتنے؟“

”بہت سارے۔“ زیبی نے پھرائی کی چھاتی میں منہ چھپالیا۔

”سنجعال لو گی بہت ساروں کو۔“

”کیوں نہیں۔“

”نہ بابا۔ اس دور میں دو بچے۔“

”چپ رہو گی۔“

”اچھا بابا۔ تمہاری مرضی۔ درجن بھر ٹھیک رہیں گے۔“

دونوں ہنس پڑے۔

چھٹی ختم ہو رہی تھی۔ عمر کو واپس جانا تھا۔ زیبی کو ساتھ لے جا رہا تھا۔ اُس سے  
جدا رہنے کا تواب تصور بھی محال تھا۔ اس سلسلے میں ماں سے بات کی۔ تو اتنی پیار سے بولیں



”بھئی ساتھ ہی رہتا ہے تم دونوں نے۔ ابھی چند دن سے اور یہاں رہنے دو۔ ہمارے چاؤ تو تم نے پورے ہونے ہی نہیں دیئے۔“

”نہیں امی! وہ مسکرا کر بولا: ”زیبی میرے ساتھ ہی جائے گی۔“

”گھر تو ٹھیک کر لے پہلے۔“

”زیبی ہی کہے گی۔“

”لو اور سونو۔ ابھی تو اُس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اُتری اور تم اُسے کام پر لگا دو۔“

وہ مہنس کر بولا: ”کام سے مہندی اُتر گئی تو اور لگا لے گی۔“

”گویا تیرا آخری فیصلہ ہے۔“

”دراصل امی وہاں کھانے پینے کی بڑی تکلیف ہے۔ جب گھر لے لیا ہے تو گھر والی کا

بھی وہاں رہنا ضروری ہے۔ روٹی کی تکلیف۔“

امی اس کی بات پر دل کھول کر سنیں۔ پھر بولیں: ”ٹھیک ہے بیٹے ٹھیک ہے۔“

لے جاؤ دلہن کو ساتھ ہی۔ ویسے یہ روٹی کا بہانہ بہت ہی پُرانا ہے۔“

عمر شوخی سے بولا: ”یقیناً جب آبا آپ کو اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے تو یہی بہانہ بنایا

ہوگا۔“

”بالکل بالکل! امی خوش دلی سے ہنسنے لگیں۔ پھر انہوں نے ڈھیر ساری دعائیں دیتے

ہوئے زیبی کو ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی۔“

عمر نے پیار سے اُن کے گلے میں بانہیں ڈال کر انھیں پیار کر لیا۔ ”اوہ میری امی۔ آپ کتنی

اچھی ہیں۔“

”بس بس! امی بولیں: ”چاپلوس کہیں کا۔ بات اپنی ہی منوائی۔ خیر۔ جازیبی سے

کہہ دے تیاری کو لے۔“

وہ زیبی کے پاس آیا۔ شرارت مچھی۔ منہ مچھلا کر مسکسی سی صورت بنانے زیبی کے

قریب آ بیٹھا۔

”کیوں جی کیا ہوا۔“ زیبی اُسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ اپنے کپڑے سوٹ کیسوں

میں پیک کر رہی تھی۔

”وہ امی ہیں نا۔“

”ہاں۔ کیا ہوا انھیں۔؟“

”اُن سے میں نے تمہیں ساتھ لے جانے کی بات کی تھی۔“

”تو؟۔“

”وہ کہتی ہیں: زیبی کچھ عرصہ یہیں رہے۔“

”اچھا۔“ زیبی نے نگاہیں گھٹاتے ہوئے کہا۔ اُس کے لبوں میں مسکراہٹ متحرک رہی تھی۔

”ہاں۔ وہ کسی طور پر تمہیں میرے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دے رہیں۔ کہتی ہیں۔“

”ہیں ابھی دلہن کے چاؤ پر پچھلے دیکھنے ہیں۔ وہ یہیں رہے گی۔ تم اکیلے چلے جاؤ۔“

”تو پھر؟۔“

”میں کیا کروں زیبی۔ امی کی عدول حکمی کی تو سب کہیں گے۔ چار دن ہی میں بیوی

کا غلام بن گیا۔“

وہ مہنس کر بولی۔ ”اس میں شک ہے کوئی۔“

”یعنی۔“

”یعنی یہ کہ تائی امی کی بانیں میں بھی سُج چکی ہوں۔ ابھی ابھی میں ادھر ہی سے آرہی ہوں۔“

وہ کھینا ناسا ہو کر مہنس پڑا۔ اور زیبی کو بازوؤں میں بھر کر کٹی چکتر دے ڈالے۔ زیبی ہوئے

ہوئے چھینے لگی۔ ”چھوڑنا کیا کر رہے ہو۔ ابھی کوئی آجائے تو۔“

وہ پیار سے اُسے کھڑا کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ بہانے وہاں تو نہیں چلیں گے۔ اکیلے گھر میں

۔ پورا پورا میرا ہی اختیار ہوگا۔“

”یہ جن صرف ہمارے ہی حصے میں آیا ہے۔ یا۔ یا ہر شادی شدہ جوڑا ایسا ہی محسوس کرتا ہے!“  
 ”ہو سکتا ہے، یہ جن صرف ہمارے حصے میں آیا ہو۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہر شادی شدہ جوڑے کا مقدر ہوتا ہو!“

”ہنیں یہ صرف ہمارے حصے میں آیا ہے زیبی، اس لیے کہ یہ جن میری زیبی کے وجود کا حصہ ہے۔ دنیا کی کوئی عورت میری زیبی جیسی حسین نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف تم ہو۔ جو خوشیوں کی پھوار بن کر میری زندگی میں برس رہی ہو“۔ وہ بے حد جذباتی ہو جاتا۔

زیبی استغاثی اٹھاتی اور اپنے آپ پر مان کرتے ہوئے اُس کے سینے میں سما جانے کی کوشش کرتی۔

شادی دو جہوں کے اتصال کا نام ہے۔ اگر دو جہیں بھی مل جائیں تو زندگی شراب و دوا شدہ بن جاتی ہے۔ وہیے شروع شروع کے دن جذباتی دھاروں پر بہتے گزرتے ہیں۔ تلاطم ہی تلاطم ہوتا ہے، زندگی ٹھہراؤ کی طرف اُسے سے پہلے خوب پھلتی اچھلتی ہے۔

زیبی اور عمر شہزادہ زندگی پر رواں دواں تھے۔ دن اُڑتے پہلے جا رہے تھے۔ شادایاں نکھرتی جاری تھیں۔ دونوں دو تین ہفتے کے بعد گھر کا چکر بھی لگا آتے۔ دونوں کے والدین انہیں خوش و خرم دیکھ کر فرحت و تسکین محسوس کرتے۔ زیبی اپنے ماں باپ کے سامنے عمر کی تعریفیں کرتے نہ تھکتی۔ اور عمر ہر ایک کے سامنے زیبی کے قصیدے پڑھتا رہتا۔ دونوں کو ان دنوں واقعی ایک دوسرے میں کوئی غامی نظر نہ آتی تھی۔ پیار کا خار چڑھا ہوا تھا۔

کچھ دنوں سے زیبی کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ سستی سی چھائی رہتی۔ پینڈالیاں دکھتی رہتیں۔ صبح صبح اُبکائیاں آنے لگتیں۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں زیبی۔؟“ عمر نے اس دن پریشان ہو کر کہا۔

”پرہہ نہیں۔“ وہ ہیڈ پر کڑوٹ بدل کر بولی۔

”ڈاکٹر کے پاس پہلوگی؟“ وہ اُس پر جھک گیا۔

”اوس۔ بڑے آئے۔“ وہ اٹھا کر الماری کی طرف بڑھ گئی۔

عمر سارو سامان کے ساتھ زیبی کو لے آیا۔ وہ ایک چھوٹا سا بگلا لٹکا رہا تھا۔ صفائی ستھرائی ہو چکی تھی۔ دو ایک مزدور لگا کر دوا رکھی تھی۔ جہیز کا نیا فرنیچر نیا سامان زیبی نے چپراسی جی کی مدد سے سیٹ کر لیا۔ چھوٹا سا گھر سچ پچ ہی چھوٹی سی جنت بن گیا۔

دونوں نے بڑے پیار اور اہتمام سے اس جنت کو سجایا۔ اور بسایا۔ زندگی بھر پور غنائوں اور توانائیوں سے ہمکنار تھی۔

عمر دفتر جانے لگا۔ زیبی اس چھوٹی سی جنت کو محبتوں کے رنگ سے نکھانے لگی۔ گھر کی بچاؤ اور سچ دج میں لگی رہتی۔ عمر کی پسند کے کھانے بناتی۔ اُس کی الماری ٹھیک کرتی کپڑے تیار رکھتی۔ اس کے چھوٹے موٹے کام زیبی نے اپنے ذہن سے لیے تھے۔ وہ دفتر سے تھکا ہوا آتا تو زیبی کی حسین مسکراہٹ اس کی نگاہ ایک لمحہ میں دور کر دیتی۔ صاف ستھرا گھر گوشہ عافیت نظر آتا۔ اُسے لگتا کہ اب یہ ایک وہ ادھوری اور بے ربط سی زندگی گزار رہا تھا۔ نہ زیبی نے اس پر رنگ و سبب کیف زندگی میں بڑے خوبصورت رنگ بھر دیے تھے۔ اس پر چھوڑی اور عمر شادی کی کیفیت طاری رہنے لگی تھی۔ وہ زیبی کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ چاہنے اور پیار کرنے لگا تھا۔

”زیبی۔“ وہ اکثر اُسے بانہوں میں سمیٹ کر کہتا۔

”ہوں۔“ زیبی کی آواز میں نغموں کی گنگناہٹ ہوتی۔

”زندگی کتنی خوبصورت ہو گئی ہے۔“

”ہاں۔“

”یہ جن برقرار ہے گانا۔“

”اور حسین ہو جائے گا عمر۔“

”سچی۔“

”ہاں۔“

زیبی کے چہرے پر شرمیلی نشیلا مسکراہٹ پھیل جاتی خوشی کے سوتے اس کے انگ انگ سے  
 پھوٹتے تھے۔ بچے کا تصور اتنا شیریں اور دلنواز تھا کہ وہ پھولانہ ساقی طبعیت خراب رہنے کے باوجود  
 مسرتوں کے بندھوے میں جھولتی رہتی۔ ممتا اُس کے اندر طوفانی صورت میں موجزن تھی۔ وہ تو  
 دوسروں کے بچوں پر اس ممتا کو پنچاؤ کرتی رہتی تھی۔ اب تو اس کا اپنا بچہ اس کے وجود میں  
 اصل رہا تھا۔ اپنے اس اُن چھوٹے اُن دیکھے بچے پر اُسے ٹوٹ ٹوٹ کر پارہا پارہا۔ عمر کی توجہ جاتی  
 کیفیت کچھ عرصے میں توازن کی طرف لوٹ آئی تھی۔ لیکن زیبی۔ زیبی تو پل پل گن کر گزار رہی  
 تھی۔ ایک ایک لمحے کو والہانہ پن سے دھکیل رہی تھی۔

”عمر ہماری بیٹی ہوگی۔“ وہ کہتی ”تہیں بیٹی پسند ہے نا“

”بیٹا ہوگا۔“ وہ کہتا ”تہیں بیٹا پسند ہے نا“

”مجھ تو بچہ پسند ہے عمر بیٹا ہو یا بیٹی“

”خدا کہے بیٹا ہو۔“

”نام کیا رکھیں گے۔“

”جب تشریف لے آئے گا تو نام بھی رکھ لیں گے۔“

”نہیں عمر۔ میں تو ابھی سے نام سوچ رہی ہوں۔“

”ٹک کا سوچا اور ٹکی ہوگئی تو۔“

”میں دو نام سوچ رہی ہوں۔ ایک ٹک کے کا دوسرا ٹکی کا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“

دونوں دھیروں نام اکٹھے کر لیتے۔ پسند کرتے۔ پھر ناپسند کر دیتے نئے نام ڈھونڈتے  
 کبھی نام بے معنی تلاش کرتے کبھی معنی والے۔

نام معنی والا ہو یا بے معنی یہ تو کسی وجود کو تشخیص کرنے کا ایک صوتی اشارہ ہوتا ہے۔  
 دونوں ہی اس بات کے قائل تھے اس لیے نام وہ رکھنا چاہتے تھے جس میں خوبصورتی ہو،

”ہاں۔“ اُس نے ہولے سے کہا۔

”ڈاکٹر زبیر ہیں میرے واقف۔“ وہ بیڈ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے بازو اُس کے اوپر سے  
 لے جا کر دوسری طرف ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

”نہیں عمر۔ کسی لیڈی ڈاکٹر۔ کو۔ دکھاؤں گی۔“ زیبی اُس کی ناٹی سے کھیلے ہوئے بولی۔  
 ”ٹھیک ہے۔“ اُس نے کہا اور پھر ایک دم ہی چونک کر زیبی کو دیکھا۔ زیبی کے چہرے  
 پر بڑی ہی حیا کو دمسکراہٹ تھی۔ یہ مسکراہٹ نئے معنی اور نئی جتہیں لیے ہوئے تھی۔ عمر نے  
 غور سے زیبی کو دیکھا۔

”تو کیا زیبی؟“ وہ بے پناہ خوشی محسوس کرتے ہوئے اس پر جھجک گیا۔

”لگتا ہے۔“ زیبی نے ہولے سے سرگوشی کی۔

”ہجڑا۔“ وہ خوشی سے چلایا۔

”ابھی نہیں۔“ وہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر مسکرائی۔ ”ڈاکٹر کو دکھالیں۔“

”ابھی چلو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

زیبی بولی: ”کل چلیں گے۔“

”جی نہیں۔ ابھی۔“

”سبھی نہیں۔ کل صبح۔ ٹیسٹ ویسٹ صبح ہی ہوگا نا۔“

دوسرے دن وہ زیبی کو لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ خوش خبری متوقع تھی۔ ڈاکٹر نے

امید ظاہر کی۔ یورین ٹیسٹ کر دانے کے لیے کہا۔

رپورٹ پوزیٹو تھی۔ زیبی کے وجود میں ایک نئے وجود نے خلق ہونا شروع کر دیا تھا۔ دونوں  
 کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

”زیبی۔“ عمر اس کا ہاتھ سرشار ہو کر کہتا۔ ”ہمارا بچہ ہوگا۔ میں باپ بنوں گا۔ تم

ماں بنو گی۔ یہ نیا احساس کتنا جانفزا ہے۔“

ہم دونوں کا۔ عمر ہم دونوں کا۔ وہ ہمیں الگ نہیں کرے گا۔ باندھ دے گا ہمیں مضبوطی سے۔ پختہ تو ڈوری ہوتا ہے۔ جوں باپ کو بہت ہی مضبوط بندھن میں باندھ دیتے ہیں۔ یہ بات ہے۔

”ہاں۔“

”بندھے تو ہم ازل سے ہیں زیبی۔“

”ہمارا پختہ ہمیں ابد تک باندھ رکھے گا۔“

”زیبی۔ میری جان۔“

”عمر۔“

دونوں بے پناہ مسرتوں میں ڈوب جاتے۔

دن گزرنے لگے۔ عمر زیبی کی ناز برداریوں میں لگ گیا۔ زیبی کا طبیعت خراب رہتی تھی۔ ہم بھی بچے کا انتظار بڑا کیف افزا تھا۔ نازاٹھوانے میں بھی اکسا لطف تھا۔ تفاخر تھا۔ زندگی کا یہ موڈ بڑا ہی دلغزیب تھا۔

عمر تو کام کاج میں لگ جاتا۔ لیکن زیبی سارا وقت اپنے اُن دیکھنے بچے کو تھوڑی آنکھ سے دیکھنے میں مگن رہتی۔ گول مٹول سا بچہ قلعاریاں کرتا۔ پیاری پیاری باتیں کرتا۔ اسکول جاتا پڑھ لکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاتا۔ برسوں کا عمل اس کے ذہن میں جھپکے لیتا گزر جاتا۔ وہ خوش سے ہلک ہلک جاتی۔ ممتا کا طوفان بیسنے میں اٹھتا۔ پیارا منہ اُٹھاتا۔ اور اس کا جی چاہتا وقت کو تیزی سے دھکیل دے۔ نواہ پلک جھپکتے میں گزر جاتیں۔ اور وہ بچے کو جسم دے کر اپنی آغوش میں آباد کرے۔

لیکن

انسان جو کچھ سوچتا ہے۔ وہ کبھی کبھی تقدیر کی سوچوں سے مطابقت نہیں کھاتا۔ کوئی چیز بھی اتنا کو پیچ جاتے تو ابتدا کی طرف لوٹ آتی ہے۔ کبھی ایک دم ہی کبھی ہوتے ہوئے۔

نعلی ہو، پیار ہو۔

وہ جب ڈھیر سارے ناموں میں بھی کوئی نام منتخب نہ کر پاتے تو عمر کہتا: ”زیبا بھی بڑا وقت پڑا ہے۔ رکھ لیں گے کوئی نہ کوئی نام۔“

تو زیبی سارا صراحت دھڑھڑاتے ہوئے کہتی۔ ”نام کا انتخاب ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ وقت تو بہت پڑا ہے ابھی۔ لیکن یہ فیصلہ کر لینے سے میں مطمئن ہو جاؤں گی نا پھر انتظار رہیں ہو جائے گا۔ جانتے ہوئے اس انتظار میں کتنا لطف ہے، خوشی ہے۔ میں تو پل پل گھڑی گھڑی گن گن کر گزار رہی ہوں۔“

”ہاں زیبی، مجھے تمہاری خوشی اور تمہارے انتظار کی لذت کا پورا پورا احساس ہے۔ تم تو بچوں کی دیوانی ہونا۔ اب تو ہمارا اپنا بچہ...“

”ادہ عمر۔ میرے بازوؤں میں پکیپی سی ہونے لگتی ہے، میری گود میں گدگدی سی ہونے لگتی ہے۔ میں اپنے اُن دیکھنے بچے کو اپنے بازوؤں میں ہلکتا محسوس کرتی ہوں، گود میں بچتا پاتی ہوں۔ لطف و انبساط کی لہریں میرے وجود کو ڈھانپ لیتی ہیں، میری خوشیوں کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔“

عمر اُس کی والہانہ اور بے پایاں خوشی کو دیکھ کر بڑا متاثر ہوتا۔ اُسے پیار کر لیتا۔ بازوؤں میں بھر لیتا اور پھر سونے سے سرگوشی کرتا۔ ”زیبی۔ مجھے تو تمہارے بچے سے حد محسوس ہونے لگتا ہے۔“

”کیوں جی۔“

”بچہ آگے تو مجھے بالکل نظر انداز کر دو گی۔“

”ہائے نہیں عمر۔“

”لگتا تو ایسا ہی ہے۔ تمہارا بچہ۔ تمہیں مجھے چھین نہ دے۔“

وہ کھلکھلا کر ہنسنے ہوئے کہتی۔ ”وہ صرف میرا بچہ نہیں، تمہارا بھی تو ہو گا۔“

خوشی اور غم بھی اسی اصول کے پابند ہوتے ہیں۔

زیبی اور عمر کی خوشیاں بھی شاید نقطہ عروج پر رہے وقت جا پہنچی تھیں۔ اتنا تو چھو کر پلٹ آنے کے عمل کے تابع تھیں۔ ساری احتیاطوں اور سنبھل سنبھل کر قدم رکھنے کے باوجود وہ.... سیر میوں سے پھسل کر گری۔ روزانہ سیر میوں پر چڑھتی اُترتی تھی۔ لیکن اس دن تقدیر کی ہونانکی نے اپنا رخ دکھانا تھا یا ڈن نئے کوئی چیز اُٹھی۔ جانے چل کا چھلکا تھا۔ یا ناٹیدون کا کوئی کاغذی ٹکڑا۔ پاؤں پھسلا۔ اس نے سیر می کا جھگلا جلدی سے پکڑ لیا۔ اور دم سے اگلی سیر می پر بیٹھ گئی بظاہر پھسل بھی کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن نقصان اتنا زیادہ ہو گیا کہ جسے برداشت کرنے کی وہ متحمل نہ تھی۔

اس وقت تو کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی۔ وہ خود ہی اٹھ کر بیڈروم میں آئی، بستر پر چٹ بیٹ گئی، صرف کمر میں درد محسوس ہوا۔  
عمر دفتر سے آیا تو وہ بیڈروم ہی میں تھی معمول کی طرح اس کا استقبال کرنے دروازے پر نہ پہنچی۔ عمر کو عجیب سا لگا۔ نوکر سے پوچھا: "بی بی کہاں ہیں؟"  
"اپنے کمرے میں ہیں صاحب۔"

"خیریت۔"  
"سیر میوں سے پھسل پڑی تھیں آج۔"

"ادہ میرے خدا۔ خیریت سے تو ہیں نا۔"

نوکر کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ کمرے کی طرف پکا: "زیبی زیبی۔ کیسے گریں چوٹ تو نہیں آئی۔ ٹھیک تو ہو۔"

وہ تیزی سے: "راگزیبی پر چبکتے ہوئے مسلسل سوال کیے گئے۔ زیبی نے دھیمی سی مسکراہٹ سے اُسے دیکھا اور بولا: "بس خیریت ہی رہی، صرف کمر میں درد ہے۔ تم گمراہ نہ بنیں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کوئی اور تکلیف تو نہیں نا۔"

"نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔"

"ڈاکٹر کے پاس لے چلوں؟"

"فردت تو نہیں۔ پھر بھی شام کو ہوائیں گے۔ تم پریشان نہ ہو۔ ٹھیک ہی ہوں شام کو چلیں گے ڈاکٹر کے پاس۔ تم جا کر کھانا کھا لو۔"

"تم نے کھالیا؟"

"نہیں۔"

"یہیں منگوالوں؟"

"میرا جی نہیں چاہ رہا۔"

"لگتا ہے، تکلیف زیادہ ہے۔"

"نہیں۔ اتنی زیادہ نہیں بس کمر دکھنے لگی ہے۔"

"اٹھو اور۔ چلو پھرو۔ شاید ٹھیک ہو جائے۔"

عمر کے کہنے پر وہ اٹھی۔ لیکن دو قدم بھی نہ چل پائی۔ درد بڑھ گیا۔ تیز تر سی لہریں اٹھنے لگیں۔ وہ جلدی سے بیٹھ گئی۔ "عمر مجھے کیا ہو رہا ہے۔ سخت درد۔ اُف۔"

زیبی درد کی ادیت سے تڑپنے لگی۔ عمر کے ہاتھ پاؤں ٹھکڑے۔ وہ سخت گھبرا گیا۔

زیبی کو اسپتال لے جانا ضروری تھا۔ اُس نے دفتر سے گاڑی منگوائی اور مشکل زیبی کو اسپتال لے گیا۔ زیبی کی حالت غیر ہوئی جا رہی تھی۔

بد قسمتی سے بڑی ڈاکٹر چھٹی پر تھی جس منظرہ اور دو تین نرسیں ہی تھیں۔ ڈاکٹر منظرہ

ہن کی طرف رجوع کیا گیا چھوٹی سی جگہ تھی۔ اسپتال میں بھی بڑے بڑے شہروں کی سی ہوتی

پھر نہ تھیں۔ جس منظرہ نے ڈاکٹر آئی تھی کچھ زیادہ تجربہ بھی نہ تھا۔ کچھ زیبی کی بد قسمتی

کا دخل تھا کہ یہ ساخرد تو عہد پذیر ہو رہی گئی۔ زیبی کی حالت بخیر نہ ہو گئی۔

صبح جب سورج طلوع ہوا تھا۔ عمار اور زیبی کی اُمیدوں کے اُجلے اندھیروں میں بدل گئے تھے۔

صد مہ تو عمر کو بھی بہت ہوا۔ لیکن زیبی کی تو دنیا ہی اندھیرا ہو گئی۔ عمار اور زیبی دونوں کی مائیں آگئیں۔ وہ تسلی اور تسخنی دینے کی بہت کوشش کتریں مگر زیبی کی پریشانی دیکھی نہ جاتی۔

”اللہ کی یہی رضا تھی۔ صبر کرو۔“

”خدا اور دے گا۔ گھبراؤ نہیں۔“

”تمہاری صحت اور زندگی ہے تو بچتے بھی ہو جائیں گے۔“

”مر سکے بچی ہو۔ ہمارے لیے یہی بہت ہے۔ خدا نے چاہا تو پھر دے دے گا۔ بچتے۔“

سب تسلیاں دیتے۔ لیکن زیبی غم سے ٹھہرا لیا تھی۔

عمر نے چھٹی لے لی۔ اور زیبی کو سب گھر لے آئے۔ چھوٹے شہر میں کوئی قابل ڈاکٹر ان کی نظریں نہ تھیں۔ اس لیے عمار اور زیبی کی ماؤں نے یہی سوچا کہ اسے گھر لے جایا جائے۔ جہاں کسی اچھی ڈاکٹر کو دکھایا جائے۔

سب چلے آئے۔ زیبی کی طبیعت سنبھلنے نہ پارہی تھی۔ بچے کی مفارقت کا صدمہ جھیلنا اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ رور و کر مبرا حال کر لیا تھا۔ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ خون تو جیسے سارا ہی پھوٹ گیا تھا۔ اُسے ذہنی اور جسمانی آرام کی سخت ضرورت تھی۔ وہ چارپائی پر پڑ گئی۔

زیبی کا کئی عرصہ بیمار رہی۔ علاج معالجہ ہوتا رہا۔ لیکن اس نے من میں جو روگ پال لیا تھا۔ اس کا علاج تو تب ہی ہوتا جب پھر اُمید کی کوئی کرن نظر آتی۔

ایک سال گزر گیا

پھر دوسرا اور اس طرح تیسرا بھی گزر گیا۔ لیکن زیبی کا دامن اُمید نہیں بھرا۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کروایا۔ ٹونے ٹونے کیے گئے۔ درباروں، مزاروں پر حاضر کیا دی گئیں حکیموں

سے رجوع کیا گیا۔ ہومیوپیتھک علاج آزمایا گیا۔ لیکن کوئی کوکھ ہری نہ ہوئی۔ لگانا کلاو جسٹ مسز جیلر جو ہڈی نے تو شردا ہی ہیں کہہ دیا تھا کہ اب زیبی کے ماں بننے کے امکانات نہیں رہے۔ یہ بات عمر جانتا تھا لیکن زیبی کو یہ بات نہیں بتائی گئی تھی۔

زیبی کے اس طرح ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار ہونے سے گھر میں زندگی بڑی متاثر ہوئی۔ وہ بہت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ ہر وقت سوگوار پڑی رہتی۔ لگتا تھا زندگی سے ساری دلچسپیاں گویا خارج ہو چکی ہیں۔ ہنسنا مسکراتا تو چھوٹ ہی گیا تھا۔ عمر کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اُس کی دلچسپی گھر میں کم ہونے لگی تھی۔ پھر بھی ایک دن اُس نے زیبی سے کہا۔ ”زیبی! کب تک سوگ مناؤ گی؟“

”عمر میں کیا کروں؟“

”میں تمہارا دکھ جانتا ہوں؟“

”میں شاید اب کبھی ماں نہیں بن سکوں گی۔“

”تو کیا ہوا۔ دنیا میں بہت سی ایسی عورتیں ہیں۔“

”عمر!“

”زیبی!“

”جی۔“

”دونے دھونے سے کچھ نہیں ہو گا۔“

زیبی کی آنکھیں ڈبڈب رہی تھیں۔ اُس نے عمر کو دیکھا اور بے اختیار نہ بولی۔ ”عمر۔“

”تم مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے؟“

”کیا؟“

”عمر شاید میرے بچے نہ ہو سکیں۔“

”تو کیا ہوا؟“

"تمہیں بچوں کی ضرورت ہوگی۔ کیا۔ کیا تم دوسری شادی کر لو گے۔؟"  
 "اوہ 'خدا'! عمر نے اتھے پر تھک مارا۔" کم صم یہی باتیں سوچتی رہتی ہو۔"  
 "ہاں۔ یہ سوچیں بھی مجھے بھی پریشان کرتی ہیں۔ ایک تو میرا بچہ ضائع ہو گیا۔  
 دوسرے تم نے ساتھ چھوڑ دیا تو؟"

"دیکھو زیبی!"

"ہاں۔" وہ گلگیا تے ہوئے بولی

"زیدی مجھے بھی بچے اچھے لگتے ہیں۔ لیکن میں اُن کے لیے تمہاری طرح پاگل نہیں ہو دوں گا۔ دوسری شادی کا خیال ہی ذہن سے نکال دو۔ تم شاید مجھے اب تک دلا پھینک سمجھتی رہیں زیبی! وہ تو عمر کے اُس دور کے مشغلے تھے۔ اب میرے لیے تم ہو۔ پہلے اور آخری غور سے بچے ساری عمر بھی نہ ہو سکیں تو پرہیز نہیں!"

"عمر۔" زیبی رو دی۔

"لیکن ایک بات یاد رکھو۔"

"کیا؟"

"تم اس طرح مجھ سے الگ تھلگ محرومی کے انداز اپناٹے گھر بار سے بے تعلق اور

مجھ سے بے پروا رہیں۔ تو پھر۔"

"پھر؟"

وہ ہنس کر اس کا چہرہ ہاتھوں کے پیلے میں بھرتے ہوئے بولا "تو پھر۔ اپنی دیکھپیوں

کا سامان ضرور پیدا کر لوں گا۔"

زیدی اُس کی بات پر مسکرا دی۔ رونی سی مسکراہٹ دیکھ کر وہ خوب ہنسا۔ پھر اُس نے زیبی کو اچھا خاصا لیکچر دے ڈالا۔ زیبی کو خوب ڈرایا۔ تسلیاں دیاں۔ زندگی کا طرف اوٹ آنے کا حوصلہ دیا۔ زیبی نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ عمر کی دیکھ بھال پہلے کی طرح کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

انہی دنوں عمر کی تبدیلی خوشاب سے سرگودھا ہو گئی۔ سارا سامان سمیٹا لیا۔ عمر نے وہاں گھرے لیا۔ نیا گھر نسبتاً اچھا تھا۔ زیبی یہاں آکر معروف ہو گئی۔ بچے اس کی کمزوری تو تھا۔ لیکن اب وہ جذباتیت کا مظاہرہ نہیں کرتی تھی۔

انہی دنوں اس علاقے میں واپڈا ٹیوب ویل لگا کر زمین کی سیم تھوڑی ختم کرنے کے منصوبے پر عمل ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ ٹیوب ویل لگا کر زمین کے اندر کا فاضل پانی باہر نکال کر زمین کو قابل کاشت بنانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ عمر کی ڈیلوٹی بھی یہیں لگی تھی۔ اس سلسلے میں اُسے فیلڈ میں بھی رہنا پڑتا تھا۔ کئی کئی دن وہیں رونا پڑتا۔ کبھی ٹخنوں میں رونا پڑتا۔ کبھی کسی ریسٹ ہاؤس میں ہفتہ عشرہ قیام کرنا ہوتا۔ زیبی گھر میں اکیلی ہوتی۔ اُس کا گھر میں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔

"زیدی۔ میری یہ ڈیلوٹیاں اب لگتی رہیں گی۔" ایک دن عمر نے باتوں کے دوران اس

سے کہا۔

"میں اکیلی کیسے رہوں گی۔" وہ بولی "تم تو کئی کئی دن فیلڈ ہی میں رہتے ہو۔"

اساتھ تو لے جانیں سکتا تھیں۔ تم کئی کئی دن اکیلی رہتی ہو۔ مجھے تمہاری فکر لگی رہتی ہے۔"

"ہے"

"گھر سے بلا لیں کسی کو یہاں۔"

"کون آئے گا؟"

"تماری امی۔"

"مشکل ہوگا۔ دو چار دن تو رہ لیں گی۔ لیکن یہ کام تو شاید دو تین برس کا ہے۔"

زیدی نے متفکرانہ اُسے دیکھا تو وہ بولا۔ "یوں کرو۔ تم واپس چل جاؤ۔ میں ہر ہفتے گھر

آجایا کروں گا۔ تم بھی سب لوگوں میں پہلی رہو گی۔ اور مجھے بھی فکر نہیں رہے گی۔" دونوں نے

صلاح مشورے سے یہی فیصلہ کیا۔

زیبی گھر چلی گئی۔ عمر کو جب بھی موقع ملتا یا چھٹی ہوتی وہ چکر لگاتا۔  
دن گزرنے لگے۔

یوں چھوٹا سا گھر چھوٹی سی جنت والا سلسلہ تو منقطع ہو گیا۔ لیکن زیبی واقعی بہل گئی۔  
بھرا پڑا گھر تھا۔ چھوٹی آپا بڑی آپا اور بھابی کے بچے دل بہلاوے کا سامان بن گئے۔ چھوٹی آپا کی  
تیسری بچی میں تو اس کی جان تھی۔ لگن کو تھنی سی یہ بچی ہر وقت اُس کی گود میں رہتی۔  
”پھوٹی آپا“۔ وہ اکثر اُس سے کہتی۔

”ہوں“

”یہ بچی مجھے دے دیں“

”تمہارے پاس ہی تو ہوتی ہے“

”نہیں آپا۔ اکا مرکا مجھے دے دیں“

”ہنیں زیبی۔ مندا تمہیں اپنے بچے دے دے گا“

”نہیں دے گا“

”مایوسی گناہ ہے“

”ڈاکٹر جمیرانے مجھے بتا دیا ہے پچھلی دفعہ میں چیک اپ کے لیے گئی تو اس نے صاف صاف  
کہہ دیا۔ عمر کو تو اس نے بہت پہلے بتا دیا تھا۔ عمر نے مجھ سے یہ بات چھپائے رکھی۔ اس ڈر سے  
کہ شاید یہ صدمہ میں جھیل نہ پاؤں“

”ڈاکٹر نا امید بھی نہیں“

”لیکن امید بھی نہیں دلاتے۔ اسی لیے تو کہتی ہوں یہ مجھے دے دیں“

”جب تک تم یہاں ہو۔ یہ تمہارے پاس ہی ہے“

”کوئی اپنا بچہ دینا نہیں چاہتا“

”قدرتی بات ہے زیبی“

”تو آپا“

”ہوں“

”میرے بچے نہ ہوئے اور مجھے کوئی بچہ گود لینا پڑا تو کہاں سے لوں گی؟“

”اللہ مالک ہے۔ اتنی فکر مند نہ رہا کر۔ ذہنی طور پر پریشان رہتی ہونا اس لیے بچے

نہیں ہوتے تمہارے“

زیبی فکر مند کیسے نہ رہتی۔ اب تو اُسے یہی فکر ستا رہی تھی کہ بچہ گود لینا پڑا تو کہاں سے لے گی۔  
یہ باتیں۔۔ عمر جب بھی آتا تو اس سے بھی لڑتی۔ وہ اکثر چڑ جاتا۔ اور اب اسے تسلی دلا دینے کے  
بجائے جھڑک بھی دیتا۔ اس کے جلنے کے بعد وہ اکثر رویا کرتی۔

عمر اپنے کام میں مصروف تھا۔ فیڈر کی ڈیوٹی بڑی سخت تھی۔ آٹھا آٹھ گھنٹے ٹنگے آسمان تلے  
پتلی دھوپ میں کام کرنا پڑتا۔ اجڑی ویران زمین کو بھر سے قابل کاشت بنانا تھا۔ وہ یہ کام شوق  
اور لگن سے کر رہا تھا۔

ان دنوں وہ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا ہوا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں کافی آرام تھا۔ محمد دین چوکیدار  
اور اس کی بیوی ماجاں اُس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وقت پر کھانا تیار کر دیتے۔ کپڑے دھو دیتے  
وقت بے وقت چائے کی طلب ہوتی تو بنا دیتے۔ اور جب اُسے نصرت ہوتی تو ادھر اُدھر کی باتیں  
کر کے اُسے مغلطو کرتے۔

ایک شام عمر کا اُسے واپس آیا۔ جیب سے اُتر کر اندر جا رہا تھا کہ اُسے محمد دین کے گرجنے  
برسنے کی آواز سنائی دیں۔ ماجاں بھی کچھ بول رہی تھی اور کسی کے رونے کی آواز بھی آرہی تھی۔  
وہ اندر جانے کے بجائے ادھر ہی چلا آیا۔

محمد دین سخت غصے میں تھا۔ ماجاں بھی خشنک نظروں سے اس لڑکی کو گھور رہی تھی۔ جو  
روتے ہوئے اپنے میلے سے دپٹے سے بار بار ناک پونچھ رہی تھی۔ لڑکی خوبصورت نہیں تھی لیکن  
ہوان تھی۔ میلے کیلے کپڑے پہنے تھی اور بال بے ترتیبی سے کبھوتے تھے۔ لڑکی نے روتے روتے عمر



کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے محمد دین۔ یہ کون ہے کیا ہو رہا ہے؟“ اُس نے پوچھا۔ تو محمد دین بمشکل غصیلے لہجے میں بولا۔

یہ میری بھتیجی ہے صاحب جی بھائی مرکھپ گیا۔ اس کی ماں نے دوسرا خضم کر لیا۔ وہ کتنا اس کے پیچھے پڑا ہے۔ اب یہ میرے پاس پتی آئی ہے۔ بتائیں اس کا کیا کردوں میں؟“ محمد دین لڑکی کے منتقلی اسے بنا رہا تھا۔ ماجاں بھی باتیں کرنے لگی۔ لڑکی کا کوئی والی وارث بنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ روتے روتے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی تھی۔ ”میں کیا کروں، کہاں جاؤں کس کھوہ میں ڈوب مروں؟“

پھر وہ ایک دم ہی جوش میں آکر بولی ”مر جاؤں گی لیکن سونیلے باپ کے پاس نہیں، جاؤں گی“

عمر کچھ نہیں بولا۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ تھا۔

وہ مکرے میں چلا آیا۔

محمد دین بے عمل لڑکی کو ہناہ دینے پر مجبور تھا۔ وہ پہلی بار تھوڑا ہی اٹھی تھی۔ ہر چوتھے چھٹے دینے یہی کچھ ہوتا تھا۔ لڑکی کو اپنے پاس رکھنا اس کے لیے سب سے مشکل تھا۔ ایک تو اپنی وال دینی بمشکل چلتی تھی۔ دوسرے ڈاک جنگلے میں رنگارنگ قسم کے لوگ آکر ٹھہرتے تھے۔ لڑکی پر پہرے داری کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

لڑکی خوبصورت نہیں تھی، جوان تھی اور جوانی بذاتِ خود خوبصورت ہے۔ ایسی خوبصورتی جو جوان مردوں کے لیے کھلا چیلنج بن جاتی ہے۔

عمر کے لیے بھی گوری کھلا چیلنج بن گئی۔ وہ کام پر آتے جاتے اسے دیکھتا، اکثر مذاق کرتا۔ ”ہو تو دھواں کھائی کھڑی۔ لیکن نام ہے گوری۔“

گوری ایسی لگا ہوں سے اُسے دیکھتی کہ اس کا اجمان مترنزل ہو جاتا۔ پھر مسکراہٹ لبوں

پر پھیل کر کہتی۔ ”من تو میرا گورا ہے نا صاحب جی۔“

”کیا پتہ۔“

”مجھے تو پتہ ہے۔“

ایک دن عطر بڑے موڈ میں تھا۔ بولا ”گوری، تیرا باپ تجھ پر مرنا۔ تو ہے ہی ایسی۔“

”اے صاحب۔“ گوری کو غصہ آ گیا؟ وہ میرا باپ نہیں ہے۔ بھڑیا ہے بھڑیا میری ماں

کی بوٹیاں بھی کھاتا ہے اور مجھ پر دانت بھی نکوستا ہے۔“

”جو وہ ابھی تجھے لینے آ جلتے تو؟“

”آ کے دیکھے۔“

”کیا کرو گی؟“

”سر پھاڑ ڈالوں گی اُس کا۔“

”قاتل بنو گی۔ ویسے قاتل تو تم ہو رہی۔“

”کیا صاحب جی۔“

”کچھ نہیں۔“

”صاحب جی۔“

”ہاں۔“

”ایک بات کہوں۔ ہرگز نہ مانو گے؟“

”کہو۔“

”مجھے تمہاری نظر بھی کھوٹی لگتی ہے۔“

اُجد گنوار لڑکی کے منہ سے یہ بات سن کر عمر گھبرا سا گیا۔ واقعی اُس کی نظر کھوٹی ہو رہی

تھی۔ یہ لڑکی اس کے حواس پر چھا رہی تھی۔ وہ مجھوتا جا رہا تھا کہ وہ ایک ذلتے دار شوہر ہے

مگر وہ بھٹکنے لگا تھا۔

بیوی کے حق میں یہ بات ڈاکے کے مترادف ہے۔ اس وقت تو وہ اندھا بہرا ہو چکا تھا گوری اُس کی طلب تھی۔ یہ طلب، یہ حاجت، یہ مانگ جیسے بھی ہوتا پوری ہونا چاہیے تھی۔ بیوی پوری ہو جاتی، چاہے نکاح کے بندھن باندھ کر اُسے اس بات کی فکر نہ تھی۔ محمد دین اور ماجاں کچھ کہہ نہ سکے، کہہ نہ سکے، کہا تو صرف یہی کہ گوری کی ضرورت ہے تو نکاح کے دو بول پڑھو الو۔ بھلے بیوی بنا کر نہ رکھنا۔ ساری عمر خدمتگار بنی رہے گی عمر کے سرنو جادو چڑھا تھا۔ نشہ حواس چھین چکا تھا۔ نکاح پر راضی ہو گیا۔

اُس نے دو چار ریشمی گہرے گہرے رنگوں اور بڑے بڑے پھولوں والے جوڑے گوری کے لیے خریدے۔ چاندی کی جھانجھریاں اور سونے کے آویزے لائے۔ چار آدمیوں کی موجودگی میں گوری سے نکاح کر لیا۔ گھر والوں کو تو کیا، عمر کو شاید اپنے آپ بھی پتہ نہ چلا کہ جذباتی بہکاوہ میں اگر وہ کتنا بڑا قدم اٹھا چکا ہے۔

چمک چمک چمک چمک کر تی گوری، عمر کی شعلوں کی طرح دہکتی آغوش میں آگئی۔ چند ہی دنوں میں گوری کیا سے کیا بن گئی۔ ٹوٹ کر نکمار ہوا، خاص خوش شکل اور کوشش نکل آئی۔ اس نے تو کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ اتنے بڑے صاحب کی بیگم بن جائے گی۔

”صاحب مجھے چھوڑ تو نہ دو گے۔“

”صاحب میں تمہیں اچھی لگتی ہوں نا۔“

”صاحب تم نے مجھے چھوڑ دیا تو میں جی نہ پاؤں گی۔“

”صاحب تم تو زشت ہو۔“

”صاحب تم تو میری زندگی ہو۔“

وہ بے لاگ بے ٹوک ایسی ایسی باتیں کہتی رہتی۔

ایک دن اُس نے طرے کہا ”صاحب۔ تم شہر کب چلو گے۔ میں شہر جانا چاہتی ہوں۔“

اپنے سے گھر میں رہنے کے لیے۔

”گوری۔“

”ہوں۔“

”تم نے میری نظر کو کھوٹی کیونکر کہا؟“

”میں سچی نہیں ہوں صاحب جی۔ نظر پر کھنے کا تجربہ ہے میرا۔ فٹ سے بتا دیتی ہوں۔“

”ٹھیکھی نظریں میرے بدن میں سوئیوں کی طرح چمکنے لگتی ہیں۔“

”تیرا بدن ان چھوٹا تو نہیں ہو گا۔ پھر۔“

عمر کی بات پر وہ تڑپ اُٹھی۔ ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا عمر کے مار دینے ہی کو تھی۔ آنکھوں میں

خون سا اُتر آیا۔ عمر جلدی سے پرے ہٹ گیا، ہنستے ہوئے بولا: ”میں نے تو مذاق کیا تھا۔“

”مذاق کیا ہے نا تو اب آزما کے بھی دیکھو۔“ وہ عزائی۔

”کیا مطلب؟“ وہ بھونچکا سا اُسے دیکھنے لگا۔

”شادی کرو میرے ساتھ تب پتہ چلے گا۔“

”کیا بک رہی ہے؟“

”ایسی باتیں کیوں کی ہیں تم نے؟“

”مذاق تھا سب۔“

”میرے کو اتنی گری پڑی سمجھا ہے۔“ وہ ایک دم ہی پھک پھک رو سنے لگی۔ عمر کو

اس پر سیک وقت ترس بھی آیا اور غصہ بھی۔

گوری پتہ نہیں کیوں عمر کی کمزوری بن گئی تھی۔ یہ جذبہ وقتی تھا۔ لیکن تھا بڑا اتومنا

عمر جیسا دل پھینک جوان اس کے سامنے بند نہ باندھ سکا۔ یہ بات انہونی سی ضرور تھی۔

لیکن کبھی کبھی اُن ہونی بھی ہو جاتی ہے۔

یہ اُن ہونی یہاں بھی ہو گئی۔

عمر کو یہ خیال نہ رہا کہ وہ کون ہے۔ کس خاندان کا فرد ہے۔ اس پر کتنی ذتے داری ہے۔

”شہر؟“

”ہاں یہاں کا کام ختم ہو گیا۔ تو اپنے گھر نہیں چلو گے؟“

عمر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے تو اس بات سے ایک جھٹکا سا لگا۔ یوں بھی مطلب پورا ہو چکا تھا۔ گوری اسے بار لگنے لگی تھی۔ اُس نے جو شہر جا کر بسنے کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ پریشان ہو گیا۔ اُسے شہر لے جانے کا تو اُس نے سوچا تک نہ تھا۔ وقت پورا کر کے اس نے چپکے سے چلے جانا تھا۔ کون بیوی کون شوہر! یہ تماشا تو اس نے وقتی طور پر کیا تھا اور اس کے لیے اُس نے محمد دین کو بھی پیسہ دیا تھا اور گوری پر بھی خرچ کیا تھا۔

لیکن گوری تو ایک مکمل گھریلو عورت بن گئی تھی۔ اک نفا خرا، اک مان سا بھر گیا تھا اس میں۔ وہ اپنے آپ کو شہر میں بسنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہی تھی، جتنی بھی ذہنی تھی۔ عمر کے طور احوال اپنانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”بتاؤ نا صاحب جی۔“ وہ بولی۔

”کیا؟“

”گھر کب چلیں گے؟“

”ابھی یہاں بہت کام ہے۔“

”پھٹی کے دن ہی دکھا لاؤ اپنا گھر۔“

”اچھا۔ کسی دن لے چلوں گا۔“ اس نے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔

اب وہ خاصا پریشان اور متفکر رہنے لگا تھا۔ گوری سے پیچھا چھڑانے کی سوچتا رہتا۔ بی بی سے من ہی من میں شرمندہ ہوتا رہتا۔ عجب سی ذہنی کشمکش نے اُسے تھکا دیا تھا۔ وہ چڑچڑا سا ہو گیا۔ گوری کو کوئی کئی دن اپنے کمرے میں آنے نہ دیتا۔ بات بات پر جھڑک دیتا۔ وہ بے چاری کچھ پرھیتی بھی تو اکھڑا جواب دیتا۔ ”فیلڈ میں بہت کام ہوتا ہے۔ تھک جاتا ہوں۔“

تھکاوٹ اتارنے کے لیے گوری مسکراہٹوں اور خد متوں کا تحفہ پیش کرتی۔ لیکن وہ

اور بک جاتا۔

پھر ایک دن گوری نے کہا ”صاحب جی۔ ایسے کب تک چلے گا؟“

”کیسے؟“ وہ سخت لہجے میں بولا۔

”صاحب جی۔ میں۔ میں نے۔ میں نے کسی ڈاکٹرنی۔“

”کیا ہوا ہے تمہیں“

وہ بڑے شرمیلے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی ”چاچی کہتی ہے۔ میں۔ میں ماں بننے والی ہوں۔“

”کیا؟“ وہ چیخا اور اس کے اندر کا عمو دھڑام سے گر پڑا۔ یہ بات تو اُس کے فہم و ادراک کے قریب تک نہ پہنچی تھی۔

”صاحب جی۔ یہ تو۔ ہونا ہی تھا نا۔ چاچی کہتی ہے ڈاکٹرنی کو دکھا کر کوئی طاقت کی دوائیاں کھاؤں۔“

”گوری۔“

”کیا ہوا صاحب جی۔“

جو ہوا تھا صاحب جی اُسے کیسے بتاتے۔ وہ تو گوری سے بھی جھوٹا سچا بند من باندھے

تھا بچے کا یہ نیا بند من۔ اُف اُس کا دماغ چکر لگ گیا۔ وہ کئی دن متوحش اور پریشان پریشان رہا۔

بھٹکارا رہا۔ سوچتا رہا۔ گوری سے پیچھا چھڑانے کے منصوبوں اور پلانوں کے بارے میں سوچتا رہا۔

پھر ابھی وہاں کام زوروں پہ تھا۔ لیکن وہ واپس جانے کا پروگرام بنانے لگا۔ اس نے دوکڑ

سیکشن میں تبدیلی کروالی۔ سب کچھ چپ چاپ ہی ہو گیا اور ایک دن بوریہ بستر سمیٹ کر

واپس جانے لگا۔ تو گوری گھبرا گئی۔ پریشان ہو کر اس سے ہٹ گئی۔

”مجھے کیوں چھوڑ کر جا رہے ہو صاحب جی؟“ وہ رونے لگی۔

”پھوڑ کر نہیں جا رہا تمہیں۔“ عمر نے اسے جھوٹی تسلی دی۔

سے زیادتی کی جو مجرمہ شدت تھی وہ کسی حد تک کم ہو گئی۔ اس نے سوچا وہ ہر ماہ کچھ رقم گوری کو بھیج دیا کرے گا تاکہ اور اس کا ہونے والا بچہ کسی مشکل میں نہ پڑیں۔ اُس نے اپنے آپ کو ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی پھر بھی کبھی کبھی وہ بڑا مضطرب، بڑا بے چین اور بڑا پریشان ہو جاتا۔ گوری کو اس نے خط لکھا نہ بدیہ بھیجا۔ وہ شاید اس سے رابطے کی کوئی کڑی استوار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وقت گزرنا لگا۔ زیبی کے خطوط باقاعدگی سے آتے تھے وہ بھی لکھتا تھا۔ روپے بھیجتا تھا۔ تسلیاں دیتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے گوری کا خیال بھی آتا۔ جانے وہ کس حال میں ہوگی، کیسے گزر رہی ہوگی لیکن یہ خیال خیال ہی رہتا۔

ساتویں مہینے زیبی بھی اس کے پاس آگئی۔ وقت نے اس کی پریشانی کو بہت کم کر دیا تھا۔ اب گوری یاد دہانی تھی۔ جو کبھی ذہن میں پہلے چاڑھتی۔ ہاں، اُس کا ہونے والا بچہ اکثر سوال بن جاتا۔

زیبی سے اولاد کی امید نہیں رہی تھی۔ یہاں بھی بڑے بڑے ڈاکٹروں کو دکھایا گیا۔ کچھ نہ بنا۔ اگلے سال پینے کی چھٹی عمراد زیبی نے لندن جا کر گزارنے کا پروگرام بنایا۔ وہاں بھی مقصد اچھے اور بڑے گاؤں کالجوں سے رجوع مقصود تھا۔

لیکن زیبی باجھ ہو گئی تھی۔ خشک اور خنجر کوکھ آباد ہونے کی کوئی امید نہ بندھی۔ جوں جوں زیبی کی طرف سے مایوسی ہو رہی تھی عمر کے ضمیر کی خلش بڑھ رہی تھی۔ وہ سوچتا گوری نے اُس کے بچے کو جنم دے دیا ہوگا۔ اس کا اپنا بچہ، اپنا خون۔ ان دیکھے چھوٹے بچے کا پیار دل میں درد بن کر اٹھنے لگتا۔ وہ اُسے دیکھنے اور پلنے کے لیے بے چین ہو جاتا۔

کبھی کبھی تو جی میں آتا کہ زیبی سے سب کچھ کہہ دے۔ لیکن اس کے کہنے سے جو نتائج برآمد ہو سکتے تھے انھیں مزاح کر ہی وہ خوف زدہ ہو جاتا۔

ڈیموٹیشن کے تیسرے سال کے اوائل ہی میں انھیں پاکستان آنا پڑا۔ عمر کے آلو کی اچانک

”کو پھر۔“ وہ روتے روتے بولی۔ ”یہ سامان کیوں سیٹ لیا ہے؟“  
”گھر جا رہا ہوں۔ اپنے والدین کو تمہارے متعلق بتانے۔ جلد ہی تمہیں آکر لے جاؤں گا۔“  
گھبرانا بالکل نہیں۔ جلدی آؤں گا۔  
یہی بات اُس نے محمد دین اور ماجاں سے بھی کہی۔

ماجاں بولی ”صاحب جی۔ بھول نہ جانا۔ گوری آپ کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اسے آپ کی ضرورت ہے۔“

”بالکل بے فکر ہو۔ مجھے خود اس سہ ہے۔ میں جلد ہی اسے آکر لے جاؤں گا۔“  
”اپنا آنا پتا تو دیتے جاؤ۔“ اس کی تسلیوں کے جھانے میں آکر گوری نے کہا۔  
”اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں دو چار دن میں خود ہی آجاؤں گا۔ مجھ پر اعتماد کرو گوری۔“  
”مجھے تمہارا ادراپہ ہونے والے بچے کا خیال نہیں کیا؟“

اُس نے میٹھی میٹھی باتوں سے گوری کو تسلی دی۔ آنے کا وعدہ کیا۔ خوشگوار اور چمکتے دیکھتے مستقبل کی جھلک دکھائی۔ گوری کو بہلا بھسلا کر وہ چلا آیا۔  
کئی دن وہ پریشان رہا۔ ضمیر کی آواز دہلائی رہی۔ اپنی زیادتی اور گوری کی بیگناہی سے خوف زدہ رہا۔ زیبی سے بھی نگاہیں چڑھنا رہا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔

انہی دنوں اس کی ڈیموٹیشن آگئی۔ اس کا تبادلہ ایم سی پی میں ہو گیا۔ اس کمپنی نے ان دنوں بغداد میں پلوں کا ٹھیکہ لیا تھا۔ عمر کو بھی وہاں جانا پڑا۔ باہر جانے کا چارم تو سب کو ہوتا ہے۔ بہت بڑی تنخواہ تمام تر سہولتوں کے ساتھ ملتی ہے۔ لیکن عمر کو تو یہ قرار کا اچھا موقع ملا تھا۔ گوری تو اب اُس کی دھول بھی نہ پاسکتی تھی۔ زیبی کو بھی فی الحال یہیں رہنا تھا۔ تنہائی اور کیسوی اس کی پریشانی کا دوا کر سکتی تھی۔

وہ اگلے ماہ پرواز کر گیا۔ زیبی کو اُس نے بلا لینے کا وعدہ کیا۔ فیملی رکھنے کی سہولت اُسے میسر تھی۔ نئی جگہ، نئے لوگ، نیا کام وہ ان میں سا ہو گیا۔ اس کا ذہن ان میں الجھ گیا اور گوری

ہی وفات ہو گئی تھی۔

عمر پاکستان آیا تو بے اختیار جی چاہا کہ گوری کی جا کر خبر لے لیکن حالات ایسے تھے کہ وہ جا نہ سکا۔ اب تو کی وفات نے کسی مسئلے کو طے کر دیئے تھے۔ انہیں ہی پٹانا رہا۔ ہاں اس نے اتنا ضرور کیا کہ کچھ روپے اپنے واپلا کے پرانے چوکیدار کے ہاتھ محمد دین کے ہاں بھجوائے۔ بچہ اس وقت یقیناً سو اوڑھ سال کا ہو گیا ہو گا۔ اس نے اس کے لئے بھی کچھ کپڑے بھیجے تھے۔

کپڑے اور پیسے ان لوگوں کو ملے یا نہیں، اُسے پتہ نہ چل سکا۔ کیونکہ چوکیدار کی واپسی سے پہلے ہی اس کی چھٹی ختم ہو گئی تھی۔ اور وہ زیبی کے ساتھ واپس چلا گیا تھا۔ وہ آتے ہی کام میں لگ گیا۔ گوری اور بچہ پھر وقت کی دھولوں سے دب گئے۔

وہ شاید دبے ہی رہتے۔

لیکن۔

زیبی بنا جانے ہی انہیں دھولوں سے نکالنے کے عمل پر کاربند تھی۔

بچہ اُس کی کمزوری تھا۔

بچے اس کی جان تھے۔

بچوں سے وہ محروم تھی۔

بچے اُس کی کوکھ سے جنم نہیں لے سکتے تھے۔

ان دنوں وہ سنجیدگی سے کسی بچے کو گولینے کا سوچ رہی تھی۔

”عمر۔ ہم کوئی بچہ گودے میں لیں۔“

”دیکھا جائے گا۔“

”نہیں عمر۔ مجھے بچہ چاہیئے۔ اُس کے لیے میں ہر قربانی دے سکتی ہوں۔ بڑی سے بڑی

قربانی۔“

عمر نے اُسے غور سے دیکھا اور کچھ سوچنے ہوئے بولا: ”جو کچھ کہہ رہی ہو۔ سوچ کر کہہ

رہی ہو؟“

”ہاں۔“

”مطلب جانتی ہو اس کا؟“

”ہاں۔ میں تمہیں بچوں کے لیے دوسری شادی کی اجازت بھی دے سکتی ہوں۔“

”مجھے شیئر کرنے کی ہمت ہے کسی دوسری عورت کے ساتھ۔“ وہ اُسے آزمانے

کو پوچھتا۔

وہ مایوسی سے عمر کو دیکھ کر کہتی: ”ہمت بالکل نہیں عمر لیکن مجھے بچے چاہئیں۔ اگر۔

تم چاہو تو کوئی بچہ گودے میں لیں۔“

”پاکستان جاؤ گے تو دیکھیں گے۔“ وہ گہری سانس چھوڑتے ہوئے سوچوں میں گم ہو جاتا۔

سال کے آخر میں وہ پاکستان واپس آگئے۔ اب مالی طور پر وہ بہت مستحکم تھے۔ زیبی نے

وہاں سے خوب شاہپنگ کی تھی، اسونا موتی خرید لیا تھا۔ گاڑی لی تھی اور خاصا بینک بیلنس لے کر

واپس آئے تھے۔

زندگی کی ہر سہولت انہیں ملی تھی۔ لیکن اندر سے دونوں بے سکون تھے۔ زیبی بچوں

کے لیے مری جا رہی تھی اور عمر بچے کا باپ بھتے ہوئے بھی بے اولادی کا زہر پی رہا تھا۔

”عمر تم نے کہا تھا نا کہ پاکستان جا کر بچہ گودے میں لیں گے۔“ ایک دن زیبی اس کے پہلو

میں لیٹے لیٹے بولی۔

”ہاں۔“

”اب تو ہم آگئے ہیں۔ سینٹیل بھی ہو گئے ہیں۔ کوٹھی بھی عنقریب مکمل ہو جائے گی۔

اچھا یہی ہوا جو پچھلے سال بنوانا شروع کر دئے تھے۔“

”پھر؟“

”اب صرف ایک ہی کمی ہے۔“

”وہ بھی خدا پوری کرے گا۔“

”عمر! ہلا دوں پر جیتا نہیں جا سکتا۔ یا تو دوسری شادی کرو۔ یا بچہ گود لے لو۔“

میرے لیے اب انتظار ممکن نہیں رہا۔

عمر چپ ہو گیا۔ سوچنے لگا۔ کیا زیبی کو گوری اور بچے کے بارے میں بتا دے۔ شاید آج وہ یہ ہمت کر ہی بیٹھتا۔

لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہی ملازم لڑکے نے بتایا کہ کوئی اُسے ملنے آیا ہے۔

وہ اٹھا۔ پاؤں میں چپل پہنے قمیص کے مٹن بند کیے اور بالوں میں انگلیاں پھیرتا کرے سے نکل آیا۔ باہر پورچ میں آئے والا منظر کھڑا تھا۔

عمر اُدھر آیا۔ تو آنے والے نے ہنسے مود بانہ انداز میں سلام کیا کھڑی بالوں اور اڑھی والا ڈبلا پتلا رحمت علی کھڑا تھا۔ عمر کو ہند لٹے اُسے شناخت کرنے میں لگے۔

یہ وہی جو کیدار تھا جس کے ہاتھ پھلے سال اُس نے پیسے اور کپڑے گوری کو بھیجے تھے۔

”اور رحمت علی؟“ عمر باہر لان میں چلا آیا۔ اور کرسی اُسے پیش کی۔ حال احوال پوچھتے

ہوئے کہا ”بیٹھو۔“

رحمت علی نے ہاتھ اشارہ کیا اور گھاس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”آپ بیٹھو صاحب۔“

”کیسے آئے؟“ عمر کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”جی وہ۔۔ پچھلے سال جب آپ آئے تھے نا؟“

”ہاں ہاں؟“

”آپ نے اس ڈاک بنگلے کے۔“

”ہاں میں نے پیسے اور کپڑے بھیجے تھے۔ تم نے واپس آکر اطلاع ہی نہ دی کوئی۔ کیسے ہیں

وہ سب لوگ؟“ عمر بے تاب سی بولا۔

رحمت علی نے اپنی مٹل کی بے رنگ سی بگڑی اُٹا کر گود میں رکھی اور چوڑی مار کر بیٹھتے

ہوئے بولا۔ ”صاحب جی، میں آیا تھا پر سب جا چکے تھے واپس۔“

”کیا خبر لائے تھے؟“

”جی آپ کی امانت پہنچا دی تھی انہیں۔“

”وہ۔ وہ۔ بچہ؟“

”بچہ تو صاحب جی ٹھیک ٹھاک تھا۔ پر محمد دین بے چارہ۔“

”کیوں کیا ہوا اُسے۔“

”جی وہ بچے کی ماں مر گئی تھی نا۔ بے چارے کو بچہ۔“

”کیا؟“

عمر کا دماغ گھوم گیا۔ چھٹی بھٹی سی نظروں سے رحمت علی کو دیکھنے لگا۔ جو ساری کتھا کہانی

سُنا رہا تھا۔ گوری بچے کی پیدائش سے پہلے ہی بیمار پڑ گئی تھی۔ بچہ پیدا ہوا تو چند دن بھی نہ جی پائی۔

محمد دین کی بیوی کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ اب بے چارے کو اکیلے بچے کو پالنا پڑ رہا تھا۔ جو بہت

مشکل تھا۔ رحمت نے ساری روداد سُنا ڈالی۔

عمر کی حالت دیدنی تھی۔ دکھ پریشانی اور ندامت نے نڈھال کر دیا۔ وہ کچھ دیر وہیں

بیٹھا رہا۔ پھر رحمت علی کو کچھ پیسے دے کر بولا۔ ”میں چائے بھجواتا ہوں، چائے پی کر جانا۔“

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اُٹھ کر اندر گیا۔

عمر بے حد پریشان تھا۔ زیبی نے پوچھا تو گول مول سا جواب دے دیا۔ دو تین دن

یونہی گزر گئے۔

اُس دن زیبی نے پھر بچہ گود لینے کی بات چھڑی تو اُسے اپنے بچے کا خیال آ گیا۔ وہ چپل

ساپڑا۔ ذہن نے فوراً ہی اک کہانی گھڑ لی۔ اور وہ زیبی سے بولا: تمہاری دُعا خدا نے

سُن لی۔“

”جی۔ کیا۔ کیسے؟“

”تم بچہ گود لینا چاہتی ہو نا!“

”ہاں ہاں!“

”اس دن جو آدمی آیا تھا نا۔ اُس نے ایک بچے کے متعلق بتایا ہے۔“

”ہج۔ کس کا ہے کہاں ہے۔ کیا ہم اُسے گود دے سکیں گے۔“

”سکون سے رہو زیبی۔ میں ساری معلومات اکٹھی کر لوں گا۔ بچہ ضرور مل جائے گا۔“

”ہاں۔“

”خدا یا۔ بچہ ضرور مل جائے گا ہمیں۔ بچہ ضرور مل جائے گا ہمیں۔“

”زیبی پُر سکون رہو۔ اتنی جذباتی نہ ہو۔“

”کس کا بچہ ہے۔؟“

”انسان کا۔“

”ہائے عمر تم مذاق کر رہے ہو۔ دیکھو امید دلا کر مجھے مایوس نہ کرنا!“

”نہیں کروں گا۔“

”بچے کے والدین اُسی ہو جائیں گے؟“

”اس کی ماں نہیں ہے۔“

”باپ ہے؟“

”ہاں!“

”وہ دے دے گا اپنا بچہ؟“

”یہ تو جا کر پتہ چلے گا۔ میں کل ہی ان لوگوں کے پاس جاؤں گا۔“

”کتنّا بڑا ہے؟“

”اُس۔“

”عمر نے جلدی جلدی حساب لگاتے ہوئے کہا: کوئی سوادو سال کا ہو گا۔“

”دو سال چار مہینے کا ہو شاید۔“

”ہائے اللہ۔ میں اپنے آپ کو کتنا خوش قسمت سمجھوں گی عمر۔ تم کہتے اچھے ہو۔ میں تمہاری اچھائی کا مول نہیں دے سکتی عمر۔ تم۔ تم بچہ گود لینے پر آمادہ ہو گئے ہو۔ حالانکہ — تمہارے بچے۔۔۔“

”بس بس زیبی۔ اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیئے۔ میں کل ہی جا کر پتہ کر دوں گا۔“

”دونوں بچان بننے لگے۔ عمر بہت کچھ سوچ رہا تھا۔

عمر دوسرے دن سرگودھے جا رہا تھا۔ زیبی نے بھی ساتھ جانے پر اصرار کیا۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس صورت حال کا اُسے پتہ چلے۔ اب گوری کا وجود تو تھا نہیں۔ بچہ اُسے مل جاتا تھا۔ گوری نے مکرر سارے مسئلے حل کر دیئے تھے۔ گودل کے کسی گوشے میں اس معاملے میں چٹین مژور ہوتی تھی۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ اپنا خون اپنا گوشت پوست اپنا بچہ اس کے پاس ہو گا۔ اور زیبی کے گود لینے کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔

بچہ خوب موٹا تازہ تھا۔ نہیں نقش ماں کے سے تھے۔ لیکن رنگ خوب گورا تھا۔ محمد دین خاصا کمزور ہو چکا تھا گوری اور بیوی کی مفارقت نے اُسے وقت سے پہلے مار ڈالا تھا۔

عمر کو بچے پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ بچہ اس وقت میٹل کچیلے ادھورے سے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ منہ ہاتھ مٹی سے اُٹے ہوئے تھے۔ ناک بہہ رہی تھی۔ بال بنا دھلی ریتوں کی طرح ہو رہے تھے۔ پھر بھی وہ اُسے اتنا پیارا لگ رہا تھا کہ بار بار اُس کا منہ چوم رہا تھا۔ سینے سے لگا رہا تھا۔ بے حد جذباتی ہو گیا تھا وہ۔

محمد دین نے اپنی دکھ بھری کہانی اُسے سنائی۔ عمر نے بھی کئی جھوٹ بولے۔ اُن کبھی پٹھنیوں کے بارے میں پوچھا۔ اپنی مجبوریاں بڑھا چڑھا کر بتائیں۔ گوری کے مرنے پر افسوس کا اظہار کیا۔

بچہ اس کا تھا۔ ویسے بھی اب محمد دین اس کے بوجھ کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے رکاوٹ ڈالنے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ تو خوش تھا کہ بچہ اپنے اصلی وارث کے پاس اس کے جیتے جی پہنچ گیا۔

خواہش نے بڑا موعوب کیا۔ وہ اُسے بازوؤں میں بھر کر جلدی سے بولا۔ "مبارک ہو زیبی۔ مبارک ہو۔ مذاق کر رہا تھا میں تو مبارک ہو!"

"کیا؟"۔ وہ اس کے بازوؤں پر اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے بولی۔ "کیا۔ بچہ؟"

"بچہ مل گیا؟" وہ پرجوش انداز میں بولا۔  
"ہاں"۔ وہ دیوانہ وار گاڑی کی طرف بڑھی۔  
"ہاں؟" عمر نے کہا۔

"کہاں ہے؟ تم اُسے ساتھ نہیں لاتے۔ بتاؤ نا"۔ زیبی پر سخت گھبراہٹ اور بے چینی طاری تھی۔

عمر نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ گنڈا بچہ بے خبری سے سو رہا تھا۔  
زیبی جھکی۔ پھر آگے بڑھی۔ چند لمحے یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں مبتلا رہی۔  
بچے کو ایک ٹک ٹکے گئی۔

"اٹھا لو۔ نکالو اسے باہر۔ بہت پیارا بچہ ہے"۔ عمر بڑے چاؤ اور پیار سے بولا۔  
زیبی نے بے صبری اور بے تابی کا جو مظاہرہ کیا۔ وہ عمر کے لیے سکون اور اطمینان کا باعث تھا۔

زیبی نے بچے کو گود میں بھر کر اس کا چہرہ دیکھا۔ میلا چمکا ہوا بچہ، کچھ شام کا دھند لگا اُسے بچہ بد صورت سا لگا۔ ایک دم ہی وہ اُسے پیار نہ کر سکی۔ عمر اُس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہا تھا۔ اس نے شاید چاہا تھا کہ اس کی طرح زیبی بھی بچے کو دیکھتے ہی ٹوٹ کر پیار کرنے لگتی وہ بچے کو اٹھائے اندر آگئی۔ بچہ اٹھ بیٹھا تھا۔ اور حیران حیران نظروں سے زیبی، عمر اور لازم لڑکے کو تنک رہا تھا۔ زیبی اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اُسے گود میں لیے لیے لاؤنچ میں صوفے پر بیٹھ گئی۔

بچہ اجنبی لوگوں کو دیکھ کر رونے لگا۔ "بابا۔ بابا۔" وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے

محمد دین کو اُس نے بہت سارے پیسے دیئے اور آئندہ بھی مدد کرنے کا وعدہ کیا شکر یہ کے طور پر وہ اُس کے سامنے بچھ گیا۔

محمد دین نے بچے کو سوادو سال تک پالا تھا۔ جلد کرتے وقت دل خون خون ہو گیا۔ خوب لپٹا کر اُسے پیار کیا۔ پھر آنکھیں کندھے پر پڑے رومال سے پونچھتے ہوئے بچے کو عمر کے حوالے کر دیا۔

"اس کا نام کیا رکھا ہے؟" عمر نے بچے کو چھاتی سے لگاتے ہوئے پوچھا۔  
"ظہری"۔ دیے گوری جتنے دن جی پائی، اسے بلبو ہی کہتی تھی۔ ہم بھی اُسے بلبو ہی کہتے ہیں۔ ظہر تو اس کا نام ہے پر بولتا بلبو کے ناک پر ہی ہے۔ بڑا ہوشیار ہے جی۔ بڑی پیاری پیاری توتلی توتلی زبان میں باتیں کرنے لگا ہے اب تو"۔

محمد دین نے روتی آنکھوں سے انہیں رخصت کیا، عمر، بلبو کو لے کر گاڑی میں اُبلٹھا۔  
گاڑی چلی تو بلبو نے بابا کو دیکھا، ہاتھ پھیلا دیئے اور چپٹے لگا۔ "بابا۔ بابا؟"  
عمر نے اسے پیار کیا۔ گود میں ہٹھا کر کتنی دیر ڈراٹو کرتا رہا۔ بچہ سو گیا۔ تو سیٹ پر لٹا دیا۔  
عمر کے دل میں خوشی کے سوتے چھوٹ رہے تھے۔ بچے پر تو اُسے ٹوٹ کر پیار آرہا تھا۔  
ہاں گوری بھی ذہن میں موجود تھی۔ اُس کا دل اس کے لیے دکھ بھی رہا تھا۔ لیکن خیر۔ وہ خوش تھا۔

شام جب آئی تھی۔ اندھیرے اجالوں سے الجھ رہے تھے۔ عمر اپنے بنگلے کے گیٹ میں داخل ہوا۔ تو زیبی پلک پلک گاڑی کی طرف آئی۔ عمر کے انتظار میں وہ تو بوکھلائی پھر رہی تھی۔  
"کہو کیا خبر لائے؟" اس نے بغیر کسی تمہید کے پوچھا۔

عمر نے جان بوجھ کر منہ بنایا اور جلدی سے گاڑی سے نکل کر بولا: "سوری زیبی۔ تمہاری خواہش پوری نہ ہو سکی۔"

"عمر"۔ زیبی سر زگر کرنے کو تھی۔ عمر کو اُس کی انتہائے شوق اور بچہ پانے کے لیے پاپا



رنگ نکھر آیا تھا۔ صحت اچھی ہو گئی تھی۔ اُس کا سارا وقت بچے کی دیکھ بھال اور اس کے چھوٹے موٹے کام کرتے گزرتا۔ بلبوب بہل گیا تھا۔ عمدہ لباس پہنتا تھا۔ رنگارنگ قیمتی کھلونوں سے کھیلتا تھا۔ خوراک اچھی تھی۔ ان چیزوں کے علاوہ بھرپور پیار مل رہا تھا۔ یہ پیار بچے کی بنیادی ضرورت تھی۔ اب وہ بابا کے لیے سچ پیرج کر دیتا بھی نہیں تھا۔ ہاں کبھی کبھی سونے میں ضرور بابا بابا کہہ کر چھینے لگتا۔

عمر اب سرور و مطمئن تھا۔ اُس کا اپنا بچہ صحیح جگر پر گیا تھا۔ اپنا خون تھا۔ وہ بہت سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ شاید لا شعوری طور پر بلبوب کی ماں سے کی گئی زیادتی کا علاوہ کر رہا تھا وہ دفتر جانے سے پہلے اور آنے کے بعد بلبوب ہی سے کھیلتا رہتا باتیں کرتا رہتا۔ چھاتی پر لٹ کر بھینچ لیتا۔ زیبی اُس کے والہانہ انداز سے بڑی متاثر تھی۔

اُس دن بھی جب وہ بلبوب کو چھاتی پر لٹائے اُسے بار بار جوم رہا تھا۔ زیبی میڈروم میں آئی۔ وہ کتنی ہی دیر دروازے میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ عمر بلبوب میں اتنا مگن تھا کہ اُسے زیبی کے آنے کا پتہ ہی نہ چلا۔ کئی لمحوں بعد زیبی نے مسکراتے ہوئے کھنکھارا۔ تو عمر نے چونک کر ادھر دیکھا۔ ایک لمبے کودہ کچھ گھبرا گیا۔ ”اؤ زیبی آؤ۔۔۔ وہ بلبوب کو پہلو میں لٹاتے ہوئے بولا۔

”ماما۔۔۔ بلبوب نے ہاتھ پھیلا دیئے۔

”لو صاحبزادے۔ ماما آگئی تو ہم سے نظریں بدل لیں۔“ عمر نے بلبوب کے گال پر ہونے سے چپٹ لگائی۔ زیبی نے آگے بڑھ کر بلبوب کو اٹھالیا۔

”بیٹو! عمر نے بچے کے ہاتھ اٹھتے ہوئے کہا۔

”عمر“

”ہوں“

”تمہیں بلبوب سے بہت پیار ہے؟“

زور زور سے پکار رہا تھا۔ زیبی اسے پیار کرنے لگی۔ وہ چپ نہ ہوا تو عمر نے اسے اٹھالیا بھلایا پھلایا۔ بچہ اس کے بازوؤں میں آکر چپ ہو گیا۔

”واہ جی۔ آپ کے پاس آکر چپ ہو گیا؟“ زیبی مسکرائی۔

”تم نے پیار جو نہیں کیا اسے۔ بچہ اور جانور پیار کو خوب سمجھتے ہیں۔ ممتا کے دعوے تو بہت تھے، تمہیں تو اس بچے پر ٹوٹ پڑنا چاہیے تھا۔“

”چلو ہٹو۔“ زیبی نے بچے کو اس کے بازوؤں سے نکال لیا۔ دیکھتے جاؤ کتنا پیار کرتی ہوں اسے۔“

زیبی بچے کو پیار کرنے لگی۔ وہ چپ ہو گیا۔ اس نے اُسے دو دو اور بکٹ کھائے ڈالنا دوس ہوا تو وہ اٹھا کر کمرے میں لے گئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ اُسے واپس لائی تو بلبوب پیچا نا نہیں جا رہا تھا۔ زیبی نے اسے ہنسا دھلا کرنے کے پکڑے پہناتے تھے۔ کپڑے اُس نے اُسی دن خرید لیے تھے۔ ویسے بھی وہ باہر سے ڈھیریوں کھلونے اور کپڑے لے کر آتی تھی۔ اس اُس پر کہ جب کبھی اپنا بچہ ہچکا استعمال کرے گی۔ نہ ہوا تو گود لیے بچے کو پہناتے گی۔

زیبی بہت خوش تھی۔ چند دنوں ہی میں بچہ اس سے مانوس ہو گیا۔

زیبی کے اصرار پر عمر نے بچے کو قانونی طور پر گود لے کر اپنا وارث بنایا۔ یہ کارروائی زیبی کی خاطر اس نے کی تھی۔ ورنہ وہ جانتا تو تھا کہ اس کا وارث بلبوب ہی ہے۔

ان دنوں زیبی اور عمر لاہور ہی میں تھے۔ یہیں تبدیل ہو کر آگئے تھے۔ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہونے والے تھے۔ بچے کو گود لینے کی انہوں نے بہت خوشی کی۔ بہت بڑی پارٹی دی۔ اپنے نئے گھر میں یہ اُن کی پہلی خوشی تھی۔

دن گزرنے لگے۔ زیبی کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ گول مٹول اور پیار سا بچہ اُس کی بے کیف زندگی میں مسرتوں کے رنگ بھر رہا تھا۔ وہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش رہنے لگی تھی۔

کو بتا دینا چاہیے۔ کیا اعتراف حقیقت کر لینا چاہیے؟ راز از خود افشا ہوتے سے پہلے ہی فاش کر دینا کیا اس کے لیے اچھا نہیں تھا۔

جب سے وہ ببلو کو لایا تھا۔ یہ سوچیں اس کے ذہن کا احاطہ کیے رہتیں ضمیر پر بوجھ سا محسوس ہوتا۔ ببلو کی اصل حیثیت پر پردہ ڈال کر وہ اپنے آپ کو گود کا زیادہ ہی گناہ گار سمجھنے لگا تھا۔

لیکن۔

کیا زیبی سے سب کچھ کہہ دینا مناسب تھا؟ وہ اُس کی لغزش کو معاف کر سکے گی؟ گھر کی خوشگوار اور خوشیوں سے بھرپور فضا متاثر نہ ہوگی؟ وقت اسی ادھیڑ میں گزرتا جا رہا تھا۔ زیبی لاعلم تھی۔

ببلو کو کسے تین چار ماہ ہو چکے تھے۔ زیبی نے اپنا سارا پیار اس پر سمجھا دیا تھا، ساری ممتا لٹائی تھی۔ وہ اُسے ایک پل کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیتی، اسی لیے کبھی بھی گھبرا بھی جاتی۔

”عمر۔ ببلو ہمیشہ میرے پاس ہی رہے گا؟ چلا تو نہیں جائے گا کہیں۔“

”تم نے اس کے باپ سے ہمیشہ ہی کے لیے اسے لے لیا ہے نا۔“

”کبھی بچے کے پیار سے مجبور ہو کر وہ اُسے لیے آگیا تو۔ عمر میں ببلو کی جدائی برداشت زک سکوں گی!“

”اس سے لکھو الیا تھا نا؟ پکے کاغذ پر لکھو الیا تھا؟“

”اُسے پیسے دے دیا تھا نا؟ وہ اب اس پر حق تو نہیں جاسکتا نا؟“

وہ اکثر گھبرا کر پریشان ہو کر ایسی باتیں کرنے لگتی۔ عمر اُسے تسلی دلا سادے دیتا۔ بچہ ہمیشہ اُس کے پاس رہے گا۔ وہ اسے پورا اطمینان دلاتا۔

زیبی کا یہ دھم اور دھڑکا عمر کی سوچوں کے تانے بانے اُلجھا دیتا۔ وہ اتنی وہمی ہو گئی تھی

”ہاں۔ کیا نہیں ہونا چاہیے؟“

”کیوں نہیں ہونا چاہیے؟ وہ پٹی پر بیٹھتے ہوئے برلی۔ ببلو اُس کی گود سے اُتر کر کمرے کے کونے میں چڑی ڈکیوں سے کھیلنے لگا۔“

”تو پھر۔“ عمر نے زیبی کی طرف کچھ نہ سمجھتے ہوئے دیکھا۔

”یہ بات میرے لیے بڑی تسکین والی ہے۔“

عمر نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے مسکرا کر اسے دیکھا۔

زیبی بولی: تمہارا پیار دیکھ کر لگتا ہے تمہیں بھی بچوں کی زبردست خواہش تھی۔ لیکن۔ لیکن تم نے کبھی اس بات کا احساس نہیں دلایا تھا۔ تم کتنے اچھے ہو عمر۔“

عمر ہنس پڑا۔ ”اچھا تو میں ہوں ہی۔“

”میں سمجھ گئی کہ کہہ رہی ہوں عمر۔ بچہ گود لینے سے پہلے مجھے دھڑکا ہی لگا رہتا تھا کہ کسی غیر بچے کو اپنا نہ سکوسکے۔ باپ کا پیار نہ دے سکے۔ میری محبوبی سے مجبور ہو کر سمجھوتا کر دے سکے۔ لیکن اب میں دیکھتی ہوں تو لگتا ہے شاید مجھ سے بھی زیادہ نہیں بچے کی خواہش تھی جسے تو ببلو سے اتنا پیار کرنے لگے ہو۔“

”ہاں زیبی شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔ لیکن اب۔“ وہ چند لمحے کور کا۔ پھر زیبی کو پیار سے گھومتے ہوئے بولا۔ ”اب یہ سارے کھٹکے وٹکے ذہن سے نکال دو۔ خدا نے ہمیں بچے جیسی نعمت سے نوازا ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ ببلو تمہیں عزیز ہے تو مجھے بھی بہت پیارا ہے۔ زندگی ہے میری۔ زیبی کے چہرے پر سکون و اطمینان کی لہریں دوڑ گئیں، وہ اٹھی اور ببلو کی انگلی پکڑ کر کمرے سے باہر نکلی۔

عمر کھلی باندھے چھت کو تنکے لگا۔ وہ واقعی ببلو سے بہت پیار کرنے لگا تھا۔ اتنا پیار شاید دیکھنے والوں کو خیر فطری لگتا تھا۔ کسی پڑائے بچے سے کوئی اس طرح ٹوٹ کر پیار کر سکتا تھا؟

عمر کے ذہن میں سوچوں کے غبار اٹھنے لگے۔ وہ گھبرانے لگا۔ سوچنے لگا۔ کیا اُسے زیبی

روٹی آنکھوں سے مسکرائی: ”میں تو سمجھی اس کا باپ آگیا کہیں ہے۔“  
 ”اس کا باپ کہیں سے نہیں آئے گا زہبی۔ کیونکہ اس کا باپ یہیں ہے۔“ عمر نے شاید حقیقت کا اعتراف کرنے کی نیت کر لی تھی۔ زہبی کو آگاہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زہبی کے دوسو سال، خدشوں اور کھٹکوں کے پیش نظر اُسے ایسا کرنا ہی تھا۔  
 ”یہیں ہے:“ زہبی بچے کو چھپانے کے لیے جھپٹی۔  
 عمر نے ببلو کو ساتھ لگا کر زہبی سے کہا: ”تسلی رکھو۔ اس کا باپ بچے کو تم سے نہیں چھینے گا۔“

زہبی بے یقین حیرانی سے اُسے تنکے لگی۔ پھر بولی: ”تمہیں پورا یقین ہے نا؟“  
 ”ہاں۔ اس لیے کہ اس بچے کا باپ کوئی اور نہیں، میں ہوں۔“ عمر نے ببلو کا منہ چوم لیا۔  
 ”میں اس کے اصلی باپ سے ڈرتی ہوں عمر۔“ زہبی اُس کی بات نہ سمجھتے ہوئے بولی۔  
 ”کہہ دینا، امت ڈرو۔ اس کا اصلی باپ میں ہی ہوں،“ وہ جھٹ سے بولا۔  
 ”ت۔ تم۔“ وہ بے یقین نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولی۔  
 ”ہاں!“ عمر کا لہجہ سنجیدہ اور آواز مستحکم تھی۔  
 ”ذائقہ کر رہے ہو؟“ وہ اب بھی بے یقین تھی۔  
 ”نہیں۔ سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔“ وہ بچے کو بیڈ سے اتار کر سیدھا ہو کر بیٹھنے ہوئے بولا۔

”عمر؟“ وہ حیرت زدہ تھی۔ عمر اُسے غور سے تنکے لگا۔ چند لمحے نگار رہا پھر اس کے کندھے پر اپنا مضبوط ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔  
 ”زہبی، حوصلہ رکھو۔ ببلو کے متعلق میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ یہ میرا بچہ ہے۔ میرا اپنا بچہ۔ اس لیے تم سارے دہم اور دوسو سے اپنے دل سے نکال دو۔ اسے تمہاری گود سے کوئی نہیں چھینے گا۔ کوئی نہیں۔“

کہ بچے کو چند منٹ ادھر ادھر مہوتے دیکھتی تو پانچوں کی طرح آوازیں دینے لگتی۔ بچہ اور وہ لازم و ملزوم تھے۔ اس کے بغیر وہ اب شاید سانس بھی نہ لے سکتی تھی۔ پیار جتنا گہیرا ہو رہا تھا اس کا وہم بھی آنا ہی تو نمونہ ہوتا جلد ہا تھا۔  
 اب ایسی اسٹیج آگئی تھی کہ عمر سوچتا تھا، زہبی پر حقیقت آشکار کر ہی دے، اُسے بتا ہی دے کہ ببلو اُس کا اور صرف اُس کا بیٹا ہے۔

اس دن بھی، ببلو کچھ دیر کے لئے گیسٹ روم کے بیڈ تیلے گھسا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ زہبی کی آوازیں پر سہی باہر نہ نکلا۔ وہ اُسے ہر کمرے میں دیکھ آئی کہیں نہ ملا۔ تو بے اختیار نہ پریشان اُٹھی۔ حواس باختہ سی بھاگی آئی۔ ”ببلو۔ ببلو کو کوئی لے گیا عمر۔ ببلو کو کوئی لے گیا۔“ وہ بیڈ روم میں آئے ہی دھڑاٹ سے بیڈ پر گر پڑی۔  
 ”کیا؟“ عمر آرام سے لیٹا میگزین دیکھ رہا تھا، گھبرا کر رسالہ پھینکتے ہوئے زہبی کو دیکھا۔  
 وہ پسینے سے شرابور تھی۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ رنگ پیل پڑ گیا تھا۔ بے ہوشا ہونے کے قریب تھی۔

”ببلو نہیں ہے عمر۔ اُسے اُس کا باپ۔“ زہبی ہانپتے ہوئے سینے پر ہاتھ مار رہی تھی لیکن ابھی بات پوری بھی نہ کی تھی کہ لازم ڈر کا ببلو کو اٹھائے ادھر آگیا۔  
 ”یہ میں ببلو بابا۔“ وہ بولا۔ ”پلنگ کے نیچے گھسے کھیل رہے۔ گیسٹ روم میں۔“  
 ”اوہ خدایا۔“ زہبی تیر کی سی تیزی سے ببلو کی طرف گئی۔ اُسے بازوؤں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیا۔ پھر بے اختیار رو کر رونے لگی۔ ”ببلو کہاں چلے جاتے ہو تم۔“  
 عمر اُس کا والہانہ پیار دیکھ کر بہت متاثر ہوا۔

زہبی اُسے بازوؤں میں بھرے بھرے بیڈ کے کنارے پر لٹائی۔ ببلو اُس کی گود سے نکل کر عمر کے پاس آگیا۔  
 ”اُن کتنا پریشانی کی اس نے۔“ زہبی پیار سے اس کے گال پر چٹکی بھرتے ہوئے

جائے گا۔ وہ اسے معاف کر دے گی۔ وہ اُس کے سامنے اپنے جرم کی سزا پانے کے لیے اور بھی جھکنے کو تیار تھا۔ اُس کے پاؤں پڑ کر معافی مانگنے پر آمادہ تھا۔ قصور وار تھا۔ اعتراف کر لیا تھا تو اب سزا بھی بھگتنے کو تیار تھا۔ لیکن اعتماد کی شکست معمول بات نہیں ہوتی۔ زیبی تو ٹوٹ کر کبھر گئی۔ کئی دن ذہنی کشمکش نے نیم دیوانہ کیے رکھا۔ کبھی بالکل پتھر کی مورت بن جاتی۔ کبھی چیخنے پھلانے لگتی۔ ہڈیاں کی کیفیت طاری ہونے لگتی۔ ہاتھ پاؤں مڑ جاتے، دانت بند ہو جاتے وہ عمر کی شکل نہ دیکھنا چاہتی، بے عزتی کرتی۔ بڑا بھلا کہتی۔ گالیاں بکتی۔

عمر نے بڑے صبر و تحمل سے یہ سب کچھ جھیلنا۔ قصور وار تھا۔ اس لیے زیبی کی زیادتیوں کو چپکے سے پی لیا۔

کئی دن گزر گئے۔ زیبی بچے سے بھی غافل ہو گئی۔ عمر کی بھی شکل دیکھنے کی روادار نہیں رہی۔ لیکن بالآخر اسے اپنے آپ پر قابو کرنا پڑا۔ نارمل ہونا پڑا۔ عمر کی معافیوں اور ان کی سزا سے چپ ہو جانا پڑا۔ زندگی گزارنے کے لیے حالات سے سمجھنا کرنا ضروری تھا۔

یہ سب کچھ تو ہو گیا۔ پر وہ بھلو کو اپنا لے پاک تسلیم نہ کر سکی۔ بھلو اُس کی سوتن کا بچہ تھا اور سوتن کے بچے کیلئے اُس کے من میں ذہری زہر بھر گیا تھا۔ محبت کا وہ بیج جو دل میں گود لیے بچے کیلئے بویا تھا وہ اچانک ہی نفرت کا پودا بن کر پھیلنے لگا تھا۔ اس کی محنت کے سامنے جذبہ جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ سوتیلے پن کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس آگ میں نفرت اور انتقام کی آگ میں۔ ننھا سا وجود معصوم سا بچہ مقدس سا پیکر پیارا پیارا گل گوتھنا سا بھلو جلنے لگا تھا۔

زیبی پر جب وحشت مسلط ہو جاتی تو وہ بے گناہ معصوم بچے پر اتنے ظلم ڈھاتی کہ انسانیت بھی سزا بردار نہ ہو جاتی۔ وہ اس کے کان مروڑ ڈالتی۔ بال نوح لیتی۔ اتنے نور نور سے تھپڑ لگاتی کہ اس کے پھول ایسے گالوں پر نشان پڑ جاتے، کھڑے کھڑے کو دھکا دے کر گرا دیتی۔ اُس کے منہ سے خون نکلنے لگتا۔ دانتوں سے زبان کٹ جاتی۔ اُس کا سارا جسم نیل

زیبی حیران، ہراساں اور بے تکلیفی سی نظروں سے اُسے تنکے لگی۔

عمر نے جلدی جلدی ساری حقیقت اس پر منکشف کر دی۔ وہ زیبی کے تاثرات اور جذبات کو نظر انداز کرنے سے ہونے باتیں کہنے لگا۔ اُس کا من ہلکا ہوتا گیا۔ ضمیر سے بوجھ اترتا گیا۔ گوری کے بچے کو زیبی کے سامنے اپنا مان کر اس نے گوری کا قرض بھی چکا دیا۔ اب وہ مطمئن تھا۔ پُر سکون تھا۔ لیکن زیبی۔

زیبی بُت بنی ششدر سب کچھ گئے گئی۔ اُسے تو عمر کی باتوں پر یقین ہی نہ آ رہا تھا۔ وہ کتنی ہی دیر سہا رہی۔ عمر اپنے جرم کی اُس سے معافیاں مانگتا رہا۔ اپنی لغزش پر نادم بھی ہوا، بہت سا وقت گزر گیا۔

”تو۔ تو بھلو۔ تمہارا بیٹا ہے؟“ اس نے پھٹی پھٹی نظروں سے عمر اور بھلو کو دیکھا۔ ”ہاں زیبی۔ اب یہ میرا نہیں تمہارا بھی بیٹا ہے۔ ہم دونوں کا ہے۔ تم اس کے متعلق ہر دھڑکا ہوا دم دل سے نکال دو۔ میں حقیقت تم پر منکشف کر چکا ہوں۔ میرے ضمیر سے بڑا بوجھ تھا۔ گودی سے بولسا ہے لیکن سچ آخر بول ہی دیا ہے؟“

زیبی ٹکڑ ٹکڑ دونوں کو تنکے لگتی۔

”ماما۔“ بھلو باپ کے پہلو سے اٹھ کر زیبی کی طرف بڑھا۔ لیکن زیبی نے اُسے اٹھایا نہیں۔ اُس کے منے سے ہاتھ جھٹک کر وہاں سے اٹھ گئی۔ بھلو گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔ عمر بچکا سا رہ گیا۔ اُسے بہت صدمہ پہنچا تھا۔ عمر کو اس کا حال تھا۔ اس لیے وہ رونے سے روکتے بھلو کو وہیں چھوڑ کر زیبی کے پیچھے لپکا۔ زیبی نے دوسرے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ عمر دروازہ پیٹتے ہوئے اُسے آوازیں دینے لگا۔

اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ ہاں، اُس کے پیچ پیچ کر رونے کی آوازیں آتی ہیں۔

عمر میں کھڑا رہا۔ زیبی کا یہ رد عمل یقینی تھا۔ رو دھو کر دل کی بھڑاس نکال لینا ضروری تھا۔ عمر نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ زیبی کا غصہ فرو ہو

اتنی بے درد اور ایسی ظالم عورت۔ جسے عورت کہنا شاید نسوانیت کی توہین تھی۔

عمر حیران ہو ہو کر سوچ رہا تھا کہ بچہ تو آخر بچہ ہی تھا نا۔

وہ تو پیدا نشی ماں تھی۔ ببلو کے متعلق اُسے جب تک پتہ نہیں تھا۔ وہ ایک غیر کا بچہ تھا تو زیبی ممتا کی پھوڑا اُس پر بربسا رہی تھی۔ لیکن یہی بچہ۔ جب اُسے پتہ چلا کہ اس کے شوہر کا اپنا بچہ ہے۔ تو وہ۔۔۔ ماں سے ڈائن بن گئی۔ کیوں؟

بچے کا کیا قصور تھا۔

وہ تو معصوم تھا۔

مقدس تھا۔ اور زیبی کی کمزوری تھا۔ پھر۔۔۔ وہ کیوں اس طرح بدل گئی تھی؟

ببلو اس کے قریب ہی گھڑی سے کھیل رہا تھا۔ عمر آنکھیں بند کیے پڑا دکھ اور کرب سے سوچ رہا تھا۔ اس کیوں کا جواب پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن سوچنے کے باوجود وہ اس کوشش میں ناکام تھا۔

عورت کی غیبات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

بالکل بھی نہیں آرہی تھی۔

نیل نیل رہتا۔ چھری، جوتی، لوہا، کلتری، جو چیز بھی ہاتھ میں آتی اس سے پیٹ ڈالتی۔ آج بھی اُس نے معصوم وجود کو گرم چمچے سے داغ داغ کیا تھا۔

عمر بچے کے اک اک داغ پر ہونٹ رکھ رہا تھا۔

اس کا دل کٹ رہا تھا۔

زیبی پر بے طرح غصہ آ رہا تھا۔ وہ اتنی جنگلی، اتنی وحشی اور ایسی درندہ بن جاتی تھی۔

اسے اپنا غصہ عمر پر نکالنا چاہیے تھا۔ اس بے ماں کے بچے پر اتنا ظلم دیکھ کر تو آسمان بھی کانپ جاتا تھا۔

وہ یلٹے یلٹے سوتح رہا تھا۔

بچے کی وجہ سے دونوں میں کئی بار لڑائی جھگڑا ہو چکا تھا۔ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چیلنے والے میاں بیوی بعض اوقات تو جانی دشمن نظر آتے تھے۔ عمر سے زیبی کی زیادتی اور ظلم ہے نہ جاتے تھے۔ اُس نے تو بچے ہی کو نشانہ بنالیا تھا۔

بچہ وہی تھا۔

جس کے لیے زیبی کے من میں پیار کا ٹھکانا بھلا ملا نہ سمندر تھا۔

جیسے پاکر وہ خوشی سے دیوانی ہو گئی تھی۔ جس کے لیے اُس نے اپنا دنوں کا چین اور راتوں کا آرام تھج دیا تھا۔ جو بچے کی ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی تھی۔ جو جاگتا تھا تو اُس کی ہانپوں کے ہنڈولوں میں جھولتا تھا اور سوتا تھا تو وہ اُسے بہروں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی تھی۔ اسے اپنے ہاتھوں سے ہنلاتی تھی بھلاتی تھی۔ نوریاں سُناتی تھی۔ نظروں سے اوجھل ہوتا تو پاگلوں کی طرح آوازیں دینے لگتی۔ تلاش کرنے لگتی تھی۔

لیکن۔

اب۔

سب کچھ بدل گیا تھا۔ وہ ماں سے ڈائن بن گئی تھی۔ عورت بھی نہیں رہی تھی۔

## نفرتیں کیسی

بقول کسے، وہ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تھا تو سونا بن جاتی تھی۔  
بڑے خوش پوش علانے میں اُس نے گھر خریدا تھا۔ ایکڑوں زمین اس خوبصورت دلاکو گھیرے  
تھی۔ بینظیر لان اس حسین دلاکی سجاوٹ اور خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے۔ امریکہ جیسی جگہ میں ایسے  
گھر صرف کروڑ پتی لوگوں ہی کے مقدر کا حصہ تھے۔

کئی پاکستانی اور ہندوستانی لڑکیوں کے علاوہ امریکن لڑکیاں اس کے ارد گرد منڈلاتی رہتی  
تھیں۔ اُس کی سیکریٹری اس کی محبت کا دم بھرتی تھی۔ لیکن طارق نے کبھی اس بارے میں شاید سوچا  
بھی نہیں تھا۔ فلرٹ کرنا اس کی عادت نہیں تھی۔ اور شادی وہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں کر  
سکتا تھا۔

شادی تو اُس کو وطن آکر کرنا تھی۔

اور اب وہ وطن آ رہا تھا۔ شادی کرنے کے لیے۔

طیارہ جانب منزل رواں دواں تھا اور وہ اپنی آرام دہ سیٹ پر بیٹھا بڑی ہی بے آرامی کی کیفیت  
سے گزر رہا تھا۔ بیٹیا باتوں کی تپتی سلاخیں اُس کے ذہن کو کرب و اذیت سے داغ رہی تھیں۔

وہ اپنے آپ پر قابو پالنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ پھر بھی اندرونی کیفیات اُس کی  
بہ بین حرکتوں سے عیاں تھیں۔ کبھی کبھی تو اُس کے خوبصورت چہرے پر اتنا تناؤ آ جاتا کہ اُسے جلد میں  
تکلیف کا احساس ہونے لگتا۔ اُس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھے اسٹریلوی سیاح کی نظریں اس تناؤ  
کو محسوس کر چکی تھیں۔ اُس نے ایک دوبار اُس سے بات بھی کی تھی۔ لیکن وہ جواباً مسکرا کر رہ گیا تھا۔  
ایئر ہوسٹس بھی اُس کے پاس دو تین بار آ چکی تھی۔ اپنی حسین مسکراہٹوں کی نرم پھوار برساتے  
ہوئے اُس نے پوچھا تھا۔ "سر آپ کچھ ڈسٹرب ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔ کوئی پرابلم۔" اُس  
نے پھر سے پر خوبصورت مسکراہٹوں کا نول بجا لیا تھا۔ سر کے اشارے سے اُس کی ہر بات کی نفی کر  
دی تھی۔

وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ایئر ہوسٹس سے ایک رسالہ لے لیا تھا۔ اور اس کی ورق گردانی کر رہا تھا

طیارہ فضا میں تیزی سے پرواز کر رہا تھا۔ اور اس سے کہیں زیادہ تیزی سے طارق کے خیالات ماضی کی  
سمت محور ہو رہے تھے۔ وہ اپنے آپ میں گم تھا۔ کبھی کبھی اس کی نگاہ طیارے میں بیٹھے مسافروں پر پڑتی۔  
سب لوگ سفر کر رہے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ جارہے تھے۔ کوئی اپنوں سے بچھڑ کر جا رہا تھا۔ کوئی  
اپنوں سے ملنے جا رہا تھا۔ مفرود ہیں بھی لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں  
طارق بھی اپنے وطن جا رہا تھا۔ سواچھ سال کے عرصے کے بعد ویاہر غیر میں یہ مدت گزار کر۔ سواچھ  
سال پہلے جب وہ آیا تھا تو اکانومی کلاس میں تھا۔ اور اب فٹ کلاس میں بیٹھا تھا۔ اکانومی سے فٹ کلاس  
میں وہ ایک محبت میں پہنچا تھا۔ اُس نے پورے سواچھ سال سفر میں گزارے تھے۔ نیچے سے اوپر جانے  
کے سفر میں۔ اس سفر میں کرب کے راستے بھی تھے۔ صعوبتوں کی راہیں بھی۔ لیکن ایک عزم لیے اس نے ان  
راستوں پر قدم رکھا تھا۔ ان صعوبتوں سے نمٹنے کے لیے اُس نے دل دماغ اور ذہن کی ساری ہمتیں  
اور صلاحیتیں صرف کر دی تھیں۔

اُس نے قیمت سے مانگا نہیں تھا۔ چھین لیا تھا اور اتنا چھینا تھا کہ شاید اب اس کے دامن  
میں بھرنے کی گنجائش بھی نہیں رہی تھی۔ اُس نے دل میں عہد بھی تو یہ کیا تھا کہ جب دامن میں سیٹھنے  
کی گنجائش نہ رہے گی تب ہی وطن لوٹے گا۔

وہ ان دنوں امریکہ کے شہر نیویارک میں مقیم تھا۔ اُس کا بزنس بہت پھیل چکا تھا۔ اُس کے  
اکس میں کچھ پاکستانیوں کے ساتھ عزیز ملکی بھی ملازم تھے۔ دولت کی دیوی اُس کے گھر کی باندی تھی۔

لیکن وہ تو سفر پر رواں تھا۔ ماضی کے سفر پر پیچھے لوٹ جانے کے سفر پر۔ پھر بھلا کیونکر سال سے نباہ کر پاتا۔

اُس نے سیٹ پیچھے کی اور اس کی پشت پر سر ٹکا کر نیم دراز ہوتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں گرد و پیش سے فرار کا کتنا مفید طریق تھا یہ۔

لیکن ان لوگوں سے تو فرار مقصود ہی نہ تھا۔ کچھ مسافر تھے، کچھ عملے کے لوگ۔ سب غیر۔ سب اجنبی۔ سب محدود وقت کے ساتھی۔ فرار کا سکون تو جب حاصل ہوتا۔ جو وہ اپنے آپ سے پیچھا چھڑا سکتا۔ اپنے غمی کے دیروچوں کو بند کر سکتا۔

وہ ایسا نہیں کر سکا۔

وہ ایسا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ پیچھے لوٹ گیا تھا۔

پیچھے۔ جہاں اُس کی زندگی کے اُنٹیں ہیں برس بکھرے پڑے تھے۔

کچھ حسین

کچھ سنگین

کچھ پھولوں کی طرح ہلکتے ہوئے۔

کچھ کانٹوں کی خراشوں سے زخمی۔

زخمی اور ہولناک

وہ اپنی ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ماں کا۔ کیونکہ باپ کو تو اس نے دیکھا ہی نہیں تھا۔ دیکھا بھی

تھا۔ تو یادوں کی پرت میں اس کی شبیہ محفوظ تھی۔ بیتی کا داغ اس نے اڑھا ہی تین برس کی

عمر میں پایا تھا۔ اس کی ماں صابرہ، صرف نام ہی کی صابرہ نہیں تھی۔ دراصل صبر مجسم تھی۔ نوعمری

کی بیوگی کا بار جس تخت اور بردباری سے اس نے اٹھایا تھا۔ وہ ایک مثال تھی۔

زاہد چند دن بیمار رہ کر چل بسا تھا۔ صابرہ پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ اپنے سسرالی گھر

میں رہ رہی تھی۔ میکہ لاہور میں تھا۔ جلال پور جٹاں میں بیاہ کر آئی تھی۔ میکے اور سسرال کے طرزِ رہائش میں بہت فرق تھا۔ لیکن اس نے اس گھر کو اپنا اول و آخر جانا تھا۔ خود کو ہر طرح سے ڈھانے کی کوشش کی تھی۔ زاہد تو اس سے بہت خوش تھا۔ لیکن سسرال والوں نے اسے بہو ہی جانا تھا۔ بہو جو ان پڑھ لوگوں میں پڑھی لکھی تھی۔ جو دیہاتی قسم کے لوگوں میں لاہور کی تہذیب یافتہ لڑکی تھی۔ اس نندوں نے انہی باتوں کو موضوع بنایا تھا۔ روایتی رشتے ہی کی روایت قائم کی تھی۔

لیکن صابرہ نے ہر حال میں نباہ کرنے کی ٹھانی تھی۔ اس کی وجہ زاہد کی شخصیت اور محبت بھی تھی۔ وہ اس پر پروانہ دار تھا۔ دونوں بہت خوش تھے۔ بہت۔ بہت خوش۔ اتنے خوش گراں کی خوش اہل خانہ کو کھٹکتی تھی۔ لیکن دونوں ہی ایک دوسرے میں مست تھے۔ انہیں کسی کی پروا کب نہ تھی۔

اُن کی خوشیاں بڑھ رہی تھیں پھیل رہی تھیں اور جب ننھے شے سے طارق نے صابرہ کی گود ہری کی، تو دونوں ہلکے ہلکے گئے۔ یہ پیارا ساجیتا جاگنا کھلونے اُن کے لیے ایک عجوبہ ہی تو تھا۔ زاہد اُسے گود میں بھر کر پیار کرتے ہوئے اکثر کہتا: ”بچے تو بہت دیکھے ہیں۔ لیکن یہ کوئی انوکھی ہی چیز ہے“

صابرہ ہنس کر کہتی ”اپنا ہے نا۔ بالکل اپنا۔“

”کتنا خوبصورت ہے“

”مجھ پر گیا ہے“

”واہ جی۔ مجھ پر گیا ہے۔ دیکھ لینا ذرا بڑا ہوگا تو ہو بہو میری تصویر ہوگا۔“

”جی نہیں میری شبیہ ہوگی۔“

”اول ہوں۔“

”تو کیا میں خوبصورت نہیں بد صورت ہوں؟“

”بھئی صابرہ تم جو کچھ بھی ہو، اُس سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو۔ یہ توجہ کا پھول

ہے۔ شگفتہ۔ مہکتا۔ بہلانا۔

”بیٹا تو میرا ہی ہے نا۔ غز تو میں ہی کر سکتی ہوں اس پر۔ اتنی حسین اور پیاری شے تمہیں میں نے دی ہے۔ اپنی جان پر کھیل کر۔“

”واقعی صابرہ واقعی۔ میں تمہارا احسان مند ہوں۔“

زاہد سر جھکائے عقیدت سے ہاتھ ماتھے تک لے جانا۔ اور پھر دونوں کھلی کھلا کرتہیں دیتے۔ ان کی ہنسی سانس نندوں کو کہاں اچھی لگتی تھی۔ زاہد تو شادی کر کے ہی صابرہ کا متوالا ہو گیا تھا۔ اب بچے کی وجہ سے تو جیسے اُسے کسی سے تعلق و سرکاری نہ رہا تھا۔

ماں یہ ہنستی سنتی تو منہ بنا کر کہتی: ”اُن کے انوکھا ہی بیٹا ہوا ہے۔“

نزد جل جہنم کو رُسائی۔ اپنے تو اوپر نسلے تین بیٹے ہوئے۔ شوہر نے بیکہ نہیں کیا۔ ناز برداریاں ہی ختم نہیں ہو رہی ہیں۔ بیگم صاحبہ کی۔

بھٹیانی جس کی اوپر نسلے تین بیٹیاں ہو چکی تھیں، احمد سے کہتی: ”اُس نے کہیں دوسری دفعہ بھی بیٹا پیدا کر لیا تو عرش پر اڑتی پھرے گی۔“

لیکن دوسرے بیٹے کی نوبت ہی نہ آئی۔

زاہد صابرہ اور طارق کو بے سہارا چھوڑ کر چند دن کی بیماری کے بعد اللہ کو بیارا ہو گیا۔

صابرہ پر قیامت نہ ٹوٹتی تو اور کیا ہوتا۔

وہ تو پاگل سی ہو گئی۔ کئی ماہ تو اُسے اپنا ہوش بہانہ بچے کا۔ وہ تو لاہور سے اچھٹی تھیں۔

... جنھوں نے بچے کو بھی سینے سے لگایا اور صابرہ کو بھی۔

صدرے بڑی سفاکی سے ٹوٹتے ہیں۔

لیکن

انٹنے سفاک نہیں ہوتے کر ایک ہی جگہ جم کر رک جائیں۔ سفاکی کا عمل اچانک ہوتا

ہے۔ لیکن اس میں ٹھہراؤ عام طور پر نہیں ہوتا۔ بڑی دھیمی اور مدھم رفتار سے چلتا جاتا ہے اور اسی

دھیمے پن میں اس کی شدت کم ہوتی جاتی ہے۔ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہ عمل اس طرح نہ ہوتا۔ تو زندگی رک جاتی ہے ختم ہو جاتی۔ مسلسل نہ رہتی۔

چند ماہ بعد جب صابرہ کچھ سنبھلی تو لاہور سے آبا آگئے جوان جہان بی بیہ ہو گئی تھی۔ دیور جیٹھوں اور نندوئیوں والا گھر تھلا انہوں نے مناسب ہی سمجھا کر صابرہ کو لاہور اپنے ہاں لے آئیں۔ وہ اس قابل تھے کہ صابرہ اور اس کے بچے کا بار اٹھا سکتے۔ چار ہی تو بچے تھے۔ بڑا بیٹا عابد اپنے بال نہ کوئی سمیت برس برس ہا برس سے کویت میں تھا۔ دوسرے چوتھے سال چند دنوں کے لیے آتا تھا۔ ویسے یابپ کی مالی مدد میں کبھی تاخیر نہ کی تھی۔

صابرہ تیوں بہنوں میں تھی۔ اس سے دو سال چھوٹی عامرہ کی شادی ایک متمول خاندان میں ہو چکی تھی۔ تیسری بیٹی شاکرہ کی بھی زاہد کے فوت ہونے سے چند ماہ پہلے شادی ہو چکی تھی۔ گھر میں اب ماں باپ یوں بھی لکھتے تھے۔ صابرہ کے اُبڑنے کا دکھ تو تھا۔ لیکن اسے پاس رکھ کر تسکین کا سامان ہو سکتا تھا۔

صابرہ کے اُبڑنے دھندلائی آنکھوں اور بھرائی آواز میں اُس کی سانس سے کہا: ”بہن آپ اہمازت دیں تو ہم صابرہ کو اور طارق کو لاہور لے جائیں۔“

”کیوں؟“ سانس نے سبکی محسوس کی۔ ”کیا ہم اُن کا بار نہیں اٹھا سکتے؟“

”اٹھا سکتے ہیں بہن۔“ صابرہ کی اُمی نے روتی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔

”تو پھر آپ لوگوں نے یہ بات ہی کیوں کی۔“ سانس تنک کر بولی۔ پھر وہ اپنے بیٹے کو یاد کر کے بین کرنے لگی۔ جگر گوشے کے پچھڑنے کا غم اُسے بھی تو تھا۔

صابرہ کے ابو نصیر احمد جہان دیدہ آدمی تھے۔ اس موقع پر بات بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ خاموش ہو گئے۔

”صابرہ آپ کی بیٹی ہے۔“ سانس نے کہا۔ ”لیکن میرے زاہد کی امانت ہے۔ جب تک میں جیوں گی اُسے سینے سے لگا کر رکھوں گی۔ ہاں اگر جوان بیٹی کے لیے آپ کے کوئی اور لالہ ہے ہوں تو۔“



لیکن یہاں کچھ فرق ضرور پڑا۔ دل بہلا تو نہیں ہاں علم کا بار قدر سے ہلکا ضرور ہو گیا۔ دونوں بہنیں لاہور ہی میں تھیں۔ کبھی وہ آجائیں کبھی صابرہ ان کے ہاں چلی جاتی۔ انھی دنوں عامرہ کی ڈیویری کا مرحلہ پیش آیا۔ اس کی ساس اپنے بیٹے کے پاس لندن گئی ہوئی تھیں۔ عامرہ چونکہ اکیلی تھی۔ گھر بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ اس لیے اس نے امی کو بلا بھیجا۔ اس کا شوہر کامران پیسے والا آدمی تھا۔ طبیعت میں گھمنڈ تھا۔ سسرال والوں سے زیادہ بن نہ پاتی تھی بڑا لے دے ہا کرتا تھا لیکن اس وقت اپنی ضرورت تھی۔ اس لیے چلا آیا۔

امی کی کچھ طبیعت خراب تھی۔ اس لیے انہوں نے صابرہ سے کہا: "بیٹی تم چلی جاؤ بہن کے پاس" "ٹھیک ہے امی" صابرہ نے کہا۔ "میں چلی جاتی ہوں" "لیکن آپ اپنے بچے کو سنبھالیں گی یا عامرہ کو؟ کامران نے کہا: "طارق بھی تو چھوٹا ہے" صابرہ بولی: "کامران بھائی فکر نہ کریں۔ سب کو سنبھال لوں گی۔ طارق بالکل تنگ نہیں کرتا۔ مہرچند دنوں کی نو بات ہے۔ امی کی طبیعت بھی تو ابھی نہیں۔" "چلیے ٹھیک ہے آپ ہی آجائیں۔"

صابرہ نے اپنے اور طارق کے چند چوڑے بیگ میں ڈلے۔ امی نے چند سو روپے دیئے۔ دل پر آدے سے چل گئے۔ لیکن صابرہ چپ رہی۔ پیسے کے لیے امی نے کہا: "ہوسپٹل میں نرسوں کو کو دینے والے کی ضرورت پڑے گی۔ ڈاکٹر اور ہوسپٹل کا خرچہ تو کامران ہی کرے گا۔ تم اپنی طرف سے..."

اس نے گھٹی آواز میں صرف "اچھا امی" کہا۔

عامرہ کے ہاں بچی پیدا ہوئی۔ بہت صحت منداں بڑی پیاری بچی تھی۔ عامرہ کو بھر دم سے کمرے میں لایا گیا۔ بچی اس وقت صابرہ کی گود میں نرس نے دے دی تھی۔ عامرہ نے بچی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ تو گلابی کبیل میں لپیٹ گول مٹل سی بچی صابرہ نے عامرہ کے قریب کرنے ہوئے ہنس کر کہا: "بالکل مانو جی ہے۔ گود میں لوگی"

ساس کی بات سمجھتے ہوئے صابرہ صبح اٹھی رونے روٹے بے حال ہو گئی۔ ایسا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی گھر میں چند سمجھ دار لوگ بھی تھے۔ انہوں نے سب کو سمجھا با بھجایا۔ صابرہ نے اپنے ماں اور باپ سے کہہ دیا "میں یہیں رہوں گی۔ یہ میرے زاہد کا گھر ہے۔ میرے بچے کا گھر ہے۔"

"ٹھیک ہے" نصیر احمد نے بے دلی سے سر ہلایا۔ تجربہ کار آدمی تھے۔ جانتے تھے۔ اس طرح یہاں رہنے سے صابرہ کی زندگی مشکلات سے دوچار ہوگی۔ سسرنا نہیں۔ دیور جیٹھ کب تک اس کا بار اٹھا سکتے تھے۔ بہر حال ساس کی چند پرس وقت انھیں چپ ہونا پڑا۔ دوسرے دن جب نصیر احمد، صابرہ کی ماں کو ساتھ لے کر واپس جانے لگے تو ساس نے ازراہ ترہم کہا: "صابرہ بیٹی، کچھ دنوں کے لیے لاہور چلی جاؤ۔" صابرہ چپ ہو گئی۔

امی نے بیٹی کو گلے سے لگا کر کہا: "چل صابرہ کچھ دنوں کے لیے چل کچھ تو فرق پڑے گا ماحول تبدیل ہونے سے۔ یہاں تو مر جائے گی غم سے۔" "مر تو میں گئی ہوں امی" صابرہ نے گہری سانس لی۔ "زاہد کے بغیر زندگی، زندگی تو نہیں نا" "خدا تیرے بچے کو سلامت رکھے بیٹی۔" "اسی کے سہارے تو جی لوں گی امی۔ زاہد نہیں تو اس کی امانت تو ہے میرے پاس۔ میرا طارق ہے جیلے کا سہارا۔"

"خدا اسے زندگی دے"

جھٹھانی اور نندوں نے بھی لاہور جانے کی رائے دی۔ یوں بھی جدت پوری ہو چکی تھی۔ چلے جانے میں ہرج نہیں تھا۔

صابرہ 'امی اور ابو کے ساتھ لاہور آگئی۔ غمزدہ وہاں بھی تھی۔ یہاں بھی۔ اپنا آپ وہیں تو نہیں چھوڑ آئی تھی نا۔

گڑیا سے بہت مانوس ہو گیا۔ وہ اُسے بہت پیار کرتا۔ خدا کر کے گود میں اٹھانا اور پھر اسے سنبھال کر بیٹھنا جیسے نازک سے آگینے کو کوئی بڑا ہی محتاط انسان سنبھال کر رکھے۔  
اس دن کچھ عزیز عامرہ کی احوال پڑی کو آئے تھے۔ شاکرہ اور احمد بھی تھے۔ رسماً بچی کو پیسے بھی دے رہے تھے۔

طارق کچھ دیر کو کھڑا کھڑا رہا۔ بچی کبھی ایک ہاتھ میں جاتی تھی۔ کبھی دوسرے میں سب ہی اسے پیار کر رہے تھے۔ جنہیں یہ ٹھانی ٹھانی گڑیا اچھی لگی تھی۔ اُسے چھو کر دیکھ رہے تھے۔ اپنی ماؤں سے اس کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

”یہ کون ہے؟“

”کہاں سے آگئی؟“

”ہسپتال سے آپ بھی لے آئیں نا ایسی گڑیا۔“

”اما ہمیں بھی لادیں بہن۔“

”بی بی لے چلتے ہیں ہسپتال اور سارے آئیں گی۔“

بچوں کی معصومانہ باتوں کا مائیں ہنس ہنس کر جواب دے رہی تھیں۔ مسز ثمنینہ راشد کا بیٹا تو جیسے بچی پر مفتون ہی تھا۔ ماں کی گود سے کھینچ کھینچ کر اپنی گود میں لینا چاہ رہا تھا۔ اور ساتھ ہی کہے جا رہا تھا۔

”اما یہ ہماری ہے نا۔ ہم گھر لے جائیں گے اسے۔“

”یہ ہماری ہے۔ اچھل کر طارق، ثمنینہ کے بچے کی طرف آیا۔ زور سے اُسے دھکا دیا اور کہنے لگا۔“

زور سے مانو بلی کو ثمنینہ کی گود سے چھین لیا۔ اس چھینا جھپٹی میں پھر زمین پر گر پڑا۔

سب ہنس پڑے۔ ثمنینہ اپنے روتے بچے کو زمین سے اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے ہنس کر بولی۔ ”اب نا کہ لینا اس کا۔ یہ سب کی ہے بیٹے۔“

سب ہنس پڑے۔ عامرہ بھی ہنس پڑی۔ لیکن صابرہ نے طارق کو ڈانٹا۔ اس طرح

وہ نقاہت سے بولی۔ ”ابھی نہیں۔ آپ ہی رکھیں ابھی۔“

صابرہ ہنس کر بولی۔ ”میں نے رکھی تو بس میری ہی ہو گئی۔ ویسے میرا طارق تیری بیٹی سے زیادہ غریب صورت ہے۔“

عامرہ ہنس پڑی۔ اور کوئی بات نہ ہو سکی۔ کامران اور عامرہ کے امی اب تو کچھ دوسرے عزیزوں کے ساتھ آگئے تھے۔ طارق بھی نانی اماں کے ساتھ آیا۔

احوال پڑی اور مبارک سلامت کے بعد سب نے بچی دیکھی۔

چار سالہ طارق اس کھلونے کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ سب بچی کو دیکھ چکے تو صابرہ نے

بچی طارق کو دکھائی۔ ”دیکھو طارق! یہ کون ہے۔“

طارق حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا۔

”ننھی مٹی گڑیا ہے امڈ میاں نے تمہارے ساتھ کھیلنے کے لیے بھیجی ہے۔“

”میں اٹھانوں گڑیا کو۔“

”ہنس بیٹے گر جائے گی۔“

”نہیں گرے گی۔“

صابرہ نے اپنے ہاتھوں میں تھامے تھامے بچی طارق کے بازوؤں میں دے دی۔

”صابرہ باجی۔ گرانہ دے آپ کا صابرہ ہمارے گڑیا کو۔“ کامران جھٹ سے بولا۔

”نہیں بھئی۔“ صابرہ نے بچی واپس لے کر سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”اس مانو بلی کو ہم گرنے

کہاں دیں گے۔“

بچی کا نام سارہ رکھا گیا لیکن ننھیاں میں وہ مانو ہی بنی۔ طارق اُسے مانو بلی کہتا تھا۔

عامرہ ہسپتال سے امی ہی کے ہاں آئی۔ صابرہ دیکھ بھال کے لیے موجود تھی۔ عامرہ کو بہاں

آہام کرنے کا اس نے پورا پورا موقع دیا۔ بچی کو بھی وہ ہی دیکھتی۔ ہنلاتی دھنلاتی۔ کپڑے بدلتی

خوبصورت فراک پہناتی اور نئے نئے گرم کپڑوں میں پلیٹ کر بہروں گود میں لیے رہتی۔ طارق اس

سوا مہینہ عامرہ امی کے ہاں ہی رہی۔ صابرہ نے اس کی خدمت میں دن رات ایک کر دیئے۔ بچی کا تو سارا کام ہی اس کے ذمے تھا۔ بار بار میپی بدل رہی ہے۔ صاف کر رہی ہے۔ پاؤں چھڑک رہی ہے۔ دودھ کی بوتلیں صاف کر رہی ہے۔ کپڑے اتھرتی کر رہی ہے۔ اس کے سارے کام وہ خوش سے کرتی تھی۔ بہت پیاری لگتی تھی اسے مانو۔

”عامرہ - مجھے تو مانوسے جیسے عشق ہو گیا ہے“

”اتنے دنوں سے دیکھ بھال ہو کر رہی ہو باجی“

”تم گھر چلی جاؤ گی۔ تو۔ طارق تو تنگ کرے گا ہی۔ خود مجھے بھی وحشت ہوتی ہے سوچ کر۔“

”آپ آجایا کیجیے گا نا۔ ویسے وحشت تو مجھے ہو رہی ہے۔ کیسے سنبھالوں گی اسے۔ آپ نے تو سارا ذمہ ہی لے لیا تھا۔ مجھے تو عادت ہی نہیں پڑی اس کے کام کی۔“

”پڑ جائے گا۔“

کامران روز ہی بیوی اور بچی کو دیکھنے آتا تھا۔ عامرہ اس کے سامنے صابرہ کی تعریفیں کرتی جس طرح خدمت وہ کر رہی تھی اس کا احساس دلانے کے لیے بار بار کہتی۔ کامران کبھی کبھی صابرہ کا شکریہ ادا کر دیتا۔ کبھی کہتا: ”بھئی یہاں جو آتی ہو۔ ظاہر ہے خدمت ہی کروانے آئی ہونا۔ امی لڑنا نہ لگتی ہوتیں تو یہ ذمے داری وہ بخوش اٹھالیتیں۔ اب آپ کی امی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ تو ظاہر ہے صابرہ ہی کو ساری ذمے داری اٹھانا تھی نا۔“

صابرہ کے علاوہ عامرہ، طارق کی باتیں بھی کامران کو ہنس ہنس کر سناتی۔ کامران ان باتوں کو کوئی خاص غصہ نہ دیتا۔ طارق کی مانوسے سے دانستگی تو اسے بالکل نہ بھاتی۔

عامرہ اپنے گھر چلی گئی۔ جس دن کامران انھیں لے گیا طارق پورا دن روتا رہا۔ بار بار ضد کرتا کامران انکل اسے بہت برے لگے۔

دو تین دن بعد صابرہ امی کے ساتھ عامرہ کو دیکھنے گئی۔ دیکھنے کیا جانا تھا۔ وہ تو طارق

بدتمیزی نہیں کرتے۔ مانوسب کی بہن ہے۔“

”سب کی نہیں میری ہے۔“ طارق خوشخوار بچے میں عزتاً۔ شاکرہ نے مذاق سے کہا۔ ”لو جی“ طارق تو ابھی سے اس کا پورا پورا مالک بن بیٹھا۔

”خار زاد ہے بھی اس کا حق دوسروں سے زیادہ ہی ہے۔“ نبیہہ مسکراتی۔

”بات تو ٹھیک کہی تم نے“ صابرہ بچی کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ”طارق کو کیا خود مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ یہ ہماری ہے۔“

”اس کے باپ کا پتا ہے باجی“ شاکرہ نے صابرہ کی سنجیدگی پر ہنس کر کہا۔ ”بڑا اکڑنا ہے“ صابرہ کے چہرے کی روشنی بجھ سی گئی۔ ایک گھبرسا اندھیرا چھا گیا۔ لیکن اس لحاظ کی کیفیت پر جلد ہی قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”بیٹیاں اکڑ خانی توڑ دیتی ہیں شاکرہ۔ میرا بیٹا لائق ہو گیا نا۔ تو۔۔۔۔۔“

”بھئی تم لوگ کس ثقیل موضوع پر بات کرنے لگیں۔ کیا خبر قسمت میں کیا لکھا ہے۔ جب جوان ہوں گے دیکھا جائے گا۔“ ارشد بولی۔

”یہ بات تو ہے۔“ صابرہ نے کہا۔

”ابھاباجی۔ کوئی چائے وائے ملے گی یا باتیں ہی ہوتی رہیں گی“ شاکرہ نے صابرہ سے کہا۔ عامرہ بیڈ پر تکیوں کے سہارے بیٹھی تھی۔ صابرہ سے بولی۔ ”باجی چلے کے لوازمات میری طرف سے۔“

”اوہو!“ شاکرہ بولی۔ ”دن رات تو اب لو کا خرچ کر دار ہی ہیں مختصر مہ، اب چائے کے لوازمات اپنی طرف سے۔“ کامطلب؟“

”نہ تو نہ سہی“ عامرہ نے مسکرا کر کہا۔

سب باتیں کرنے لگیں۔ صابرہ چائے کے پے کپن میں چلی گئی۔ طارق بچی کو گود میں لے کر صوفے پر بیٹھا رہا۔

بازوؤں میں بھرے وہ اُسے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔

اُس کے دروازے میں داخل ہوتے ہی عامرہ اور کامران چلائے۔ صابرہ جلدی سے اٹھی پک کڑی کو چھینا اور ایک زوردار پتھر طارق کے نگاتے ہوئے غصے سے بولی "بدتمیز کہیں گرا دیتا تو۔"

"اُسے کیوں مارتی ہو پتھر ہی تو ہے۔" ماں نے روتے ہوئے طارق کو بیسنے سے لگایا۔ کامران اور عامرہ نے بھی صابرہ سے کہا "پتھر ہی ہے۔ پھر کوئی گرا تو نہیں دیا تھا جو آپ نے بے جا اسے کو تھپڑ مارا۔"

صابرہ کچھ بولی نہیں۔

پھر جتنی دیر بھی وہ وہاں رہی کبھی خاموش خاموش۔ چپ چپ رہی۔

وقت گزرتا چلا گیا۔

صابرہ کے حالات بد سے بدتر ہوتے گئے، سسر کے فوت ہونے کے بعد سسرالی گھر میں اُس کا بار اٹھانے والا کوئی نہ رہا، ہر چند کہ سس نے اُسے ساتھ رکھنا چاہا، لیکن وہ تو اب خود میٹوں کے رحم و کرم پر تھی، بیٹے اُس کا ہی بار نہ اٹھایا تھے، صابرہ اور اس کے بیٹے کا بوجھ اٹھانا تو تھا ہی گراں، صابرہ کا دل بے بھی زیادہ وقت میکے ہی میں گزرتا تھا، اب ان حالات میں تو اُسے مسئلہ ہی میکے اٹھانا پڑا۔

سسرال سے رشتہ توڑا تو نہیں جتنا، خوشی غمی کے موقع پر آنا جانا لگا ہی رہا تھا، لیکن اب وہ ماں کے ہاں تھی۔

ماں جو بیماری کو اتنی سنجیدگی سے گلے لگا بیٹھی تھی کہ گھسٹ گھسٹ کر چند سال گزارے پھر وہ بھی انڈا کو بیماری ہو گئی۔

صابرہ تو اب اسی گھر کی ہو گئی، ساری ذقے دریاں اب اُس کے مرتعیں، آب کی دیکھو جہاں۔

اُسے گئے کی خاطر تواضع، چھوٹی بہنوں اور بہنوئیوں کی خاطر دریاں سمی اُس کے ذقے تھیں، وہ سارے فرائض بڑی لگن اور تندہی سے ادا کرتی، لیکن کبھی کبھی دل بے طرح اُٹا اُس ہو جانے طبیعت اچانک اُٹا ہونے لگتی۔ اُسے یوں لگتا جیسے یہ سب کچھ بڑی اپنائیت سے کرتے کے باوجود وہ اس گھر، اس فضا اور اس ماحول میں بیگانہ سی ہے۔ بے گانہ بے ٹھکانہ۔ بے وقعت اور بے مہار۔ جس پر سبھی غیب

کی ضد تھی، جو پوری کرنا تھی۔ دو تین دنوں میں چہرہ کھل گیا تھا، ماں تھی نا، ایک اکلوتے بچے کا امرا تھا یا ضد بہ طور اسے پورا کرنا ہی تھی۔

کامران بھی گھر پہ تھا، سارہ سوئی ہوئی تھی۔ سب ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے، احوال پرسی ہوئی، سب باتیں کرنے لگے۔

"مانو بتی کہاں ہے امی؟" طارق نے پوچھا۔

صابرہ ہنس کر بولی "سورہی ہے بیٹے۔"

"اللہ، اس بچے نے جس دن سے تم آئی ہو تاؤ سے زبان نہیں لگائی" امی نے ہنس کر کہا

"مانو بتی کی رٹ لگنے رکھی۔"

"بچہ ہے نا، پھر اتنے دن رہی سارہ دہان۔ عادی سا ہو گیا ہے۔" عامرہ بولی۔

صابرہ نے ہنس کر کہا "تیری بیٹی ہی کا دیوانہ ہے، چچاؤں، چھوپڑوں سب کے بچے ہیں کبھی کسی سے مانوس نہیں ہوا اتنا۔"

کامران بولا "صابرہ باجی، بچے کی باتوں کو اس طرح اہمیت دے کر بیان نہ کیا کریں، اس کے ذہن میں کوئی ایسی ویسی بات نہیں بیٹھنی چاہیے۔"

"اے ہے۔" صابرہ کو بُلا لگا تو اس کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر عامرہ نے کامران سے کہا "بچوں کی باتیں ہیں آپ تو اس طرح سنجیدہ ہو گئے جیسے...."

"ٹھیک کہتے ہیں کامران۔" عامرہ کی بات صابرہ نے کاٹ دی۔ "طارق یتیم بچہ ہے اس کا حال ہے نہ مستقبل۔ اس کے ذہن میں مانو کی انصاف جگہ پائی تو بُرا ہی ہو گا اس کے لیے۔"

دُکھے طنز کی چٹھن ماں اور عامرہ نے بری طرح محسوس کی۔ کامران نے منہ بنایا۔ بات کچھ سنجیدہ ہو گئی جیسے دور کرتے کے لیے عامرہ نے موسم کی باتیں شروع کر دیں۔

ان سب کو باتوں میں مصروف پاکر طارق پچکے سے مانو بتی کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ وہ عامرہ آنٹی کے کمرے میں گھسا اور ننھی مٹی لگایا کو کوٹ میں سے گھسیٹ کر اٹھا لیا، بڑا سنبھل سنبھل کر

ڈال سکتے ہیں جس سے سبھی کام لے سکتے ہیں۔ موقع لگے تو بڑا سبلا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کے حساس ذہن میں ایسے کئی چھین کے کانٹے تھے۔ عامرہ نے، کامران نے، شاکر نے، احمد نے شعوری اور لاشعوری طور پر اُسے یہ چھین دی تھیں۔ اور وہ اسے تو لگہ نہ تھا۔ لیکن ان سے تھوڑی دیر کے لیے شاکر ضرور ہو جاتی شاکر ہوتی بھی تو کیا کر لیتی تھی۔ یہی ناکر جی بھرا آیا تو چھپ کر رو لیا گیا رو نہ سکی تو طارق پر برس پڑی اُسے کوس لیا۔ تقدیر کے بے رحمی پر کڑھ لیا۔

لیکن اپنے آپ کو سنبھالا بھی تو دینا آگیا تھا۔ جب بھی ایسی کیفیات سے دوچار ہوتی۔ بعد میں پچھتاوا آتا۔ تو بہ کرتی۔ خدا سے معافی مانگتی۔ اس کی رضا پر راضی رہنے کا عہد کرتی پھر طارق کو سینے سے لگا کر ہمت اور توانائی کی لہریں سینے میں اٹھتی محسوس ہوتیں۔

خدا نے اُسے ایک انتہائی خوبصورت اور ذہین شخص سے نوازا تھا۔ یہ بھی نہ ہوتا تو وہ کیا کرتی۔ امجدوں کا سہارا تو تھا نا۔

طارق بڑا ذہین لیکن بڑا ہی حساس بچہ تھا۔ وہ ماں کے چہرے پر ذرہ بھر بھی ٹھکڑے کے سامنے دیکھتا تو گلے میں بانہیں ڈال کر اشکال کا گاجم لیتا

”امی۔ ہنسی کیوں نہیں ہو۔“

”رونا آیا تھا۔“

”امی میں اب کسی چیز کے لیے ضد نہیں کروں گا۔“

”مجھے پتا ہے میرے ابو نہیں ہیں۔ ضد تو وہ کرتے ہیں جن کے ابو ہوتے ہیں۔“

اس کی باتوں سے صابرہ کا دل کٹ جاتا۔ لیکن اُسے لپٹا کر اتنا پیار کرتی کہ طارق چل کر بازوؤں سے نکلنے کی کوشش کرتا۔

طارق واقعی عمر سے پہلے ہی میخور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کسی بے جا ضد نہ کرتا۔ نہ ہی کھلنے کی تہ ہی پہننے

کی۔ ہاں ایک ضد تھی جس پر وہ شاید قادر نہ تھا

ہر ہفتے وہ امی سے عامرہ آئی کے ہاں جانے کی ضد ضرور کرتا۔

”امی آج چھٹی ہے چلے نا۔“

”بھئی تم بھی عجیب لڑکے ہو۔ ہر ہفتے ان کے ہاں جادو جھکتے ہیں، بُری بات ہے“

”تو پھر عامرہ آئی سے کہیں آجایا کریں۔“

”آئی تو ہے دوسرے چوتھے دن“

”لیکن تھوڑی دیر کے لیے آئی ہیں اور پھر مانو بلی کو بھی تو کبھی کبھی ساتھ لاتی ہیں۔“

”مانو بلی کے ساتھ اب مانو بلا جوا گیا ہے۔“

”اوہ شوکت۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

”کیوں اتنا پیارا سا ہے گول مٹول“

”اوں ہوں“

”طارق۔“

”جی۔“

”شاکرہ آئی کی پٹکی بھی تو پیار کی ہے۔ وہ اچھی نہیں لگتی تمہیں!“

”لگتی ہے۔“

”پھر ہر ہفتے مانو بلی ہی کے لیے کیوں جانا چاہتے ہو!“

”بس جاؤں گا۔“

”کسی دن کامران انکل سے منہ کی کھاؤ گے۔ روز روز کا آنا انھیں اچھا نہیں لگے گا۔“

”نہ لگے۔ مجھے ان سے ڈر تو ہوا ہی لگتا ہے۔ عامرہ آئی تو پیار کرتی ہیں نا۔ مانو بلی مجھ سے

کتنا خوش ہو کر کھیلتی ہے۔“

”ہوں“

”امی۔“

”ہوں۔“

”یہ جو کامران نکل ہیں نا۔“

”ہاں“

”مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔“

”بڑی بات ہے بیٹے، ایسے نہیں کہتے!“

”کیوں نہیں کہتے۔ نہیں اچھے لگتے بس۔ میں اور مانو کھیل رہے ہوتے ہیں نا، تو بڑے غصے سے

مجھے دیکھتے ہیں۔ مانو کو بھی ڈانٹ دیتے ہیں۔“

”اسی لیے تو کہتی ہوں۔“

”احمد نکل بہت اچھے ہیں۔ میں پنکی سے کھیتا ہوں تو وہ خوش ہوتے ہیں کچھ کہتے بھی نہیں۔“

”بے وقوف بچے۔ اسی لیے تو کہتی ہوں۔ اُن کے ہاں زیادہ نہ جابا کرو۔ شاکرہ آئی کی پنکی سے

کھیلا کرو۔“

طارق نے ماں کی بات پر ہوا بغلی میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ”مانو بھی بہت اچھی ہے اُمی“

صابرہ تھہہس کر کہا ”اور پنکی۔“

طارق نے ناک سکڑی بھر کسی مدبر آدمی کی طرح بولا ”اچھی ہے۔ لیکن مانو بہت اچھی ہے“

ماں نے اسے سینے سے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا، پھر مسکراتے ہوئے بولی: ”یہ اچھی بڑی رہنے

دے ابھی۔ دھین سے پڑھا کو کسی لائق تو ہو جا پہلے۔“

”وہ تو میں ہوں“ طارق منہ پھلا کر اپنے اسکول ٹیچر کے ریکارڈس اور اپنی ماہانہ رپورٹ کا ذکر کرنے لگا

وقت گزرتا چلا گیا۔

اچھا ہوا بڑا گزری جاتا ہے اسے تقدیر بھی کہا لیتے ہیں، کوئی اچھا یوں سے سرفراز ہوتا ہے اور کوئی ہلاکتوں

کے شکنجے میں جکڑتا رہتا ہے لیکن غنیمت یہی ہے کہ آہستہ آہستہ طریتے پر مرکب رہتے ہیں، بدلے رہتے ہیں۔

عامرہ قہمت کی دھن تھی، کامران کا کاروبار دونوں ذات چوگن ترقی کر رہا تھا۔ مانو کے بعد

اوپر تلے تین بیٹے بھی خدانے دیے تھے۔ جب سے ساس فوت ہوئی تھی، گھر میں اب ایک ملکہ کی طرح

اسی کی حکمرانی تھی۔ حالانکہ ”احبابِ خوب و سیل“ تھیں، شہر کے چیدہ چیدہ لوگوں سے ملنا ملنا تھا۔ یوں وہ متوسط طبقے

سے نکل کر اوپر کے طبقے کی طرف اٹھتی جا رہی تھی۔

شاکرہ بھی اپنے گھر میں ٹھیک ٹھاک تھی، چار بچوں کی ماں بن چکی تھی، احمد کی وقت کے ساتھ ساتھ

ہمد و موشن ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ہنگامی کے دور میں صرف خواہ پر گز نہیں ہو سکتی تھی، تھوڑی بہت سائے

بروز کر رہا تھا۔ جس سے گھر کا رکھ رکھاؤ اچھا تھا۔ بچے اچھے اسکولوں میں تعلیم پا رہے تھے۔

”نینوں بہنوں میں صابرہ ہی تھی، جس کی زندگی کی گامی نکال چال چل رہی تھی۔ طارق ہی اس کی امیدوں

کا صدارت تھا۔ بھائی باہر سے کچھ نہ کچھ بھیتا رہتا تھا، بہنیں بھی دوسرے چوتھے ماہ کچھ نہ کچھ جھیلے پہلنے

دے دیتی تھیں۔ عامرہ کی تو فیرا اپنی ہی اتنی مصروف زندگی تھی کہ صابرہ کے دکھوں کو سننے سمجھنے کے لیے

وقت نکالنا مشکل تھا، ہاں شاکرہ اپنی اس عظیم بہن سے دلی ہمد و موشن رکھتی تھی، روپے پیسے سے زیادہ

مدد نہ کر سکتی تو صابرہ کے دکھوں کو محسوس کر کے سینے میں ہو کر سی ضرور محسوس کرتی۔ اپنے دکھ کا

اظہار بھی کرتی اور کہیں کہیں صابرہ کسی دکھ سے عاجز آکر افسوس پہانے پر مجبور ہو جاتی۔ تو وہ اس

کے افسوس اپنے اُنچل میں جذب کستے ہوئے خود بھی اڑ دیتی۔

بچے بڑے ہوتے گئے۔ سب بچوں کا آپس میں بہت پیار تھا، ایک دوسرے سے مل کر خوش

ہوتے جھپٹتوں میں اکثر سب نانا آبا کے گھر آجاتے، کبھی ماںیں ساتھ ہوتیں کبھی اکیلے آتے صابرہ

اُن کے لیے نانی ہی کا رول ادا کرتی۔ بہت پیار کرتی سب سے۔ سب خوب اُدھم مچاتے دھینگا شتی

مگرتے۔ توڑ پھوڑ کرتے۔ سامان اُٹ پلٹ دیتے، لیکن صابرہ نے کبھی کسی کو ڈنٹا نہیں، پیار ہی

کیا، لاڈ ہی دیکھے سب کے۔ اس لیے تو سبھی بچے اس بڑی آنٹی سے بہت پیار کرتے تھے۔

طارق کو اب بھی سب میں سے مانو جی ہی چھی لگتی تھی۔ مانو جی بھی طارق سے بہت مانوس تھی۔

پنکی بھی ان کی دوست تھی، خدا کا ٹھہ میں وہ مانو کے برابر تھی۔ حالانکہ دو سال چھوٹی تھی۔ وہ اکثر

مانو کو چھیڑتی۔ ”تم تو گنٹھی سی رہ جاؤ گی۔“

طارق اس کی طرف داری کرتا: ”تم تو بانس کی طرح لمبی ہوتی جا رہی ہو۔ سوکھی مڑی، مانو کو دیکھنا

کتنی فریب ہے۔ کون مٹول سی۔ تم سے زیادہ اچھی لگتی ہے؟

مانو اتنا جاتی۔ ”دیکھا۔“

تینوں ہنس پڑتے۔

طارق نے میٹرک کا امتحان بڑے اعزاز سے پاس کیا۔ بورڈ میں اس کی تیسری پوزیشن تھی۔ صابرہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ اس نے اس خوشی میں سب بہنوں اور عزیزوں کو ایک شاندار سی دعوت دی ”یہ میری پہلی خوشی ہے“

”خدا نے میرے بچے کو اپنی رحمتوں سے نوازا ہے۔“

”میں اسے ڈاکٹر بناؤں گی۔“

”یہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔“

”بہت لائق ہے میرا بچہ۔“

وہ خوشی سے بہک بہک کر ہر ایک سے طاق کی تعریفیں کرتی۔

اس کی پہلی خوشی تھی۔ سب نے بڑھ چڑھ کر جھڑ لیا۔ دعوت خوب شاندار رہی۔ صبر نے سب کو خوش کر دیا۔

عامرہ، طارق کے لیے ایک خوبصورت سوٹ پس لائی تھی۔ اس نے پکیٹ صابرہ کو تھمایا تو کامران نے ہولے سے کہا۔ ”ساتھ کچھ پیسے بھی دے دو۔ سلاکے گا کہاں سے۔“

صابرہ کا دل کچھ بھڑ گیا۔ سمجھ نہ پائی کہ کامران نے ہمدردی بتائی ہے یا طنز کا تیر مارا ہے۔ وہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ پھر جب تنہائی کا موقع پا کر عامرہ نے دو ہزار روپے صابرہ کو دینا چاہے۔ تو صابرہ نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پر سے کر دیا۔

”رکھ لو حاجی“ عامرہ بولی۔ طارق کو کالج میں داخلہ لینا ہے، پیسوں کی ضرورت تو پڑے گی ہی۔

”جب ضرورت پڑے گی تو مانگ لوں گی“ اس نے کہا اور وہاں سے پہلی گئی۔

اس کی ساری خوشیاں زخمی ہو گئی تھیں۔

مانو بھی طارق کے لیے تھخ لائی۔ یہ تھخ اس نے اپنی پاکٹ منی سے خریدی تھا۔

طارق کو جتنے تحائف ملے تھے۔ مانو کا یہ تھخ اُسے اُن سب سے اعلیٰ، سب سے بڑھیا اور سب

سے قیمتی لگا۔

”مانو۔ تمہارا تھخ میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی ہے۔“ اس نے مانو سے کہا۔

”نہیں بھئی۔ اتنا بھی نہیں میرے جیب خرچ سے اتنے ہی پیسے بچے تھے۔ بچکی جو پرنٹ لائی

ہے وہ تو اُس کی ماں نے لے کر دیلے۔ نا۔ سونے کا ٹائی پن ہے۔“

”لیکن میں جو کہہ رہا ہوں کہ تمہارا تھخ مجھے سب تحفوں سے زیادہ عزیز ہے۔“

”سچی۔“

”سچی۔“

اور

اس سچی سچی بات دونوں کے لاشعور سے نکل کر شعور میں آ گئی۔ طارق کو مانو بلی ٹرڈ سے اچھی لگتی تھی لیکن آج اس اچھا لگنے میں جاتے کون سا جذبہ شامل ہو گیا تھا کہ طارق کا جی چاہا اس پیاری مٹا لڑکی کو اپنے دل کے حصار میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت سارہ نے بھی اپنے اندر پائی تو اس کی کم عمری اُسے اس کیفیت کا مفہوم نہ سمجھا سکی۔ پھر سچی اُسے یوں لگا جیسے... طارق وہ طارق نہیں جو اب تک تھا۔ وہ کوئی اور ہی ہے کوئی اور لیکن جسے نیا نام دینا اس کے ذہن کی سوچ سے شاید دور تھا

شب درود کا چکر چلتا رہا۔

طارق نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ اسکول اور کالج کی زندگی میں جو فرق ہے وہ طارق نے بھی محسوس کیا۔ کالج میں اپنے اور امیر گھرانوں کے لڑکے سمیٹے جن کا مقصد تعلیم حاصل کرنے سے زیادہ وقت گزاری تھا۔ خوبصورت لباسوں اور اسکوٹروں، گاڑیوں میں کالج آتے تھے۔ اتفاق سے دوستی بھی چند ایسے ہی امیر زادوں سے ہو گئی۔ کم مائیگی کا احساس آہستہ آہستہ اُس کی شخصیت پر اثر انداز

صابرہ اس کی ذہنی کیفیت سے بے خبر اپنے حالات اور حالات کی نزاکت کا اُسے احساس دلاتی رہی۔ ابھی تم کچھ بھی نہیں ہو طارق۔ تمہیں کچھ بننا ہے بن کے دکھانا ہے۔ اپنے وقار اپنی انا کی حفاظت کر لے۔ تم کیا جانو باپ اور بھائی کے ٹکڑوں پر جینا مجھے کتنا گھٹا ہے۔ کتنی اذیت ہوتی ہے۔ جب کوئی مدد کے لیے بند مٹھی میری مٹھی میں دے دیتا ہے لیکن کیا کروں۔ ذلت کے احساس کے ساتھ بھی صرف اس لیے جی رہی ہوں کہ تم کچھ بن سکو۔ سب ہم پر رحم کھانے ہیں۔ اس لیے کہ ہم بے سہارا ہیں۔ مجھے سب کے رحم کھانے کا احساس ہے لیکن یقین جانو مجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا میں اس رحم کو اپنی خدمات کے عوض لیتی ہوں۔ ہر ایک کی خدمت۔ سب کی تابعداری۔ کیا تم اب بھی بچے ہو کہ یہ سب کچھ نہیں سمجھتے۔

”امی طارق نے صابرہ کے گلے میں بائیں ڈال دیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ دکھ کا تیر انداز ہی اندر اترتا چلا گیا۔ رشتہ داروں کے رویتے چھیننے لگے۔ آج تک واقعی اس کی اور امی کی کسی نے دل سے عزت نہیں کی تھی۔ ہمیشہ رحم کھایا تھا۔ تڑس کھایا تھا۔ رحم اور تڑس۔ طارق کے ذہن میں ان جذبوں کے لیے نفرت پھوٹ پڑی۔ ماں نے اسے خوب پیار کیا۔ تسلی دی۔ سمجھا با۔ لیکن!

طارق کے اندر جو احساس متحرک ہو گیا تھا۔ اُسے وہ ٹھہرا نہ سکی۔

اس دن سے وہ گم صم رہنے لگا۔ اس کی خوش مزاجی نے بھی.... تصنع کا بادیہ اوڑھ لیا۔ اس کے ذہن میں غیر محسوس سی جلن ہوتی رہتی۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا۔ کیا؟ یہ وہ خود بھی شاید جان نہیں پایا تھا۔

اب وہ ہر عزیز ہر رشتہ دار کا رویہ اور نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی امی تو کیا وہ خود بھی سب کی خدمت گزاری کے لیے مامور ہے۔ اب تک وہ سب کے کام بخوشی اور دودھ دڑ کر کرتا تھا۔ لیکن اب اُس نے محسوس کیا کہ کام کرنے کو صرف اُسے ہی کہا جاتا ہے۔ شوکت ہوا رشتی ہو۔ فاضل ہو۔ کوئی بھی لڑکا ہو۔ اُن کی موجودگی میں کام ہمیشہ اُس سے لیا جاتا ہے۔

ہونے لگا۔ اور اس کے ساتھ ہی رکھ رکھاؤ بناؤ سنگار پرائس کی توجہ بڑھنے لگی۔ اُسے بھی اچھے اچھے فیشن ایبل لباسوں اور قیمتی قیمتی جوتوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

”امی مجھے فلاں جینز چاہیے۔“

”فلاں کپڑا۔“

”فلاں جیکٹ۔“

”جینز لے دیں۔“

صابرہ بے چاری جہاں تک بن پڑتا اس کی فرمائشیں پوری کرتی۔ لیکن ایک۔ تو کا لچ کا خرچہ کافی تھا۔ اُس پر یہ سارے اخراجات۔ طارق جب بھی کوئی فرمائش کرتا۔ صابرہ کا چہرہ اتر جاتا۔ اُس دن وہ منہ بسور سے بیٹھا تھا۔ جاگزیں کی فرمائش تھی۔

”تمہارے پاس ہیں جاگزیں“ صابرہ نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”وہ پہننے کے قابل نہیں۔ پھر مجھے وائٹ چاہئیں۔ میں نے گیمز کے لیے جانا ہوتا ہے سب لڑکے وائٹ جاگزیں پہنتے ہیں۔“

”طارق بیٹے۔“ صابرہ نے ایک گہری سانس چھوڑتے ہوئے۔ اُسے دیکھا۔ ”فرد پہننے ہوں گے سب لڑکے۔ لیکن تم۔ اُن جیسے نہیں ہو۔ تمہیں اپنے حالات دیکھنا چاہئیں۔ دوسروں کے رحم و کرم پر پڑے لوگوں کو احساس ہونا چاہیے۔“

”کیا۔۔!“

”تم ایک یتیم بچے ہو بیٹے۔ تمہارے پاس وافر پیسہ نہیں۔ ماموں اور نانا سرپرستی نہ کریں تو شاید تم کالج....“ صابرہ نے اپنی اور اس کی حیثیت واضح کی۔

”امی“ طارق سر تپا تپا کر گیا۔ یوں لگا جیسے کوئی تلخ حقیقت آج پہلی بار اس پر آشکار ہوئی ہے۔ اُسے دکھ ہوا۔ آج سے پہلے اس نے اس حقیقت کو کیوں نہیں جانا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔



”اوہ نہیں مانو۔“

”تو سمجھ۔“

”یونہی۔ طبیعت کچھ پریشان بہنے لگی ہے۔“

”آخر کیوں؟“

”بس۔“

”نہیں بتاؤ گے؟ کوئی خاص بات ہوئی ہے؟“

”خاص بات۔ ہونہ۔ اب تو نہیں ہوئی۔ مجھے احساس اب ہوا ہے۔“

”کیسا احساس طارق۔؟“

”کہ میں ایک یتیم بچہ ہوں۔ بے سہارا۔ دوسروں کے رحم و کرم پر پڑا ہوا۔“

”طارق۔“

”ہاں مانو۔ یہ ایک حقیقت ہے۔“

”پاگل ہو تم۔“

”وہ سنیں پڑا۔ دکھ سے۔ کرب سے۔ مانو سمجھ نہ پائی کہ اسے کیونکر تسلی دے ہاں اس طرح

ہنسنے پر اسے رونا ضرور آگیا۔“

طارق کی طبیعت اچھا رہنے لگی۔ وہ جو بورڈ میں اچھی پوزیشن لے کر میٹرک میں پاس ہوا تھا

ایف اے میں اتنے نمبر نہ لے سکا کہ میڈیکل میں داخلہ مل سکے۔ امی کو بہت دکھ ہوا۔ لیکن اسے دکھ نہیں

تھا۔ وہ تو کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ ڈاکٹر بننے کے لیے پانچ چھ سال کی طویل مدت درکار تھی اور ان پانچ

چھ سالوں کے ٹھیکے ٹھوکوں کو دھکیلنے کے لیے اسے یا اس کی امی کو جانے کس کس کام نہ دیکھنا پڑتا۔ کس کس

کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑتا۔ کس کس خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خدمت گزار یوں کا بوجھ بساط سے

بڑھ کر اٹھانا پڑتا۔ صدم اور ترس کے تازیانے جانے کتنی سمتوں سے کھانے اور پہننے پڑتے۔

صابرہ نے دکھ سے کہا: ”تو نے میرے خواب بکھیر دیئے طارق۔ کتنی خواہش تھی۔ کتنا یقین تھا

”اے طارق، ذرا پانی تو پلا دو۔“

”بھاگ کے جانا چائے کی پتی ختم ہے اے آؤ۔“

”دھو بی سے کپڑے تو استری کر دلاؤ۔“

”سگریٹ تو پکڑ لاؤ۔“

”ذرا جوتے تو چمکا دو۔“

یہ جھوٹے موٹے کام تھے جو گھر میں آنے والا ہر فرد اس سے لیتا تھا۔ اور وہ دوردور کرا چھانٹنے چھا

کہلانے کے لیے کرتا تھا۔ سب سے زیادہ کامران اکل اس سے ایسے کام لیتے تھے ان کا روقہ کبھی بھی

مشفقانہ نہیں ہوتا تھا۔ حکم کا پہلو ہوتا تھا ہر بات میں۔ اسے یہ بات بڑی بھی لگتی تھی۔ لیکن مانو کی

خاطروہ کبھی اظہار نہیں کرتا تھا۔

لیکن،

اس کی باتوں نے کئی پردے اس کی آنکھوں سے اٹھا دیے تھے۔ اسے کئی تلخ اور کربناک

حقیقتوں کا احساس دلایا تھا۔

حس اس وہ شروع ہوا سے تھا۔ وہ حیران تھا کہ اب تک حساس جذبے کیوں سوئے پڑے تھے

اس کا رویہ بدل گیا۔ زندگی سے رویہ بدل گیا۔

مانو اسے بہت عزیز تھی، بہت پیاری تھی۔ اس کی زندگی تھی۔ لیکن اب وہ اس کی طرف سے

کچھ مایوس ہو گیا۔ مانو وہی تھی۔

”تم بدلتے کیوں جا رہے ہو طارق؟“ اس نے اس کی سر دھری سے گھبرا کر پوچھا۔

”نہیں تو۔“

”میں جانتی نہیں جیسے۔“

”کیا جانتی ہو؟“

”کالچ لائف۔“

”ہوسکتا تو۔“

”کیا مطلب۔ تعلیم اور دھوری چھوڑنے کا ارادہ ہے؟“

”فرق کیا پڑتا ہے؟“

”کیوں نہیں پڑتا۔“

”کیسے۔ سمجھاؤ گی؟“

طارق نے اپنی آنکھیں مانو کی آنکھوں میں ڈال کر بڑی سچائی سے سوال کیا۔ وہ کونسی جہاندیدہ لڑکی تھی، چودہ پندرہ سالہ لڑکی اپنی سمجھ کے مطابق بولی۔ سب کہتے ہیں لڑکیوں کی نوکوں بات نہیں، نوکوں کو ضرور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہیئے۔ اب تو کوٹواکڑ اور انجینئر لڑکے بہت پسند ہیں۔

”مانو۔“

”ہوں۔“

”ہیں ڈاکٹر یا انجینئر بن بھی جاتا نا۔ تو بھی تمہارے ابو مجھے پسند نہ کر سکتے۔“

طارق کے لہجے کی دسوزی سے مانو نے تڑپ محسوس کی جلدی سے بولی۔ ”کیوں؟“

”وہ مجھے شروء ہی سے ناپسند کرتے ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔ اٹا حیاں ذہن میڈیٹھالیا۔ امی تمہیں کتنا پیار کرتی ہیں۔“

”میں تمہارے ابو کی بات کر رہا ہوں۔ کامران انکل کی۔ بہت بڑے بزنس مین کی۔“

”طارق میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔ میرے بابا کے بارے میں تمہارے ذہن میں کتنی غلط باتیں بیٹھی ہیں۔ وہ ایسا کیوں کر سنے لگے۔“

”کرنے لگے نہیں، کرتے ہیں مانو۔ اس لیے کہ۔ کہ میں ایک یتیم، غریب بے سہارا اور دوسروں

کے رحم و کرم پر پڑا انسان ہوں۔ میرا کوئی ماضی تھا، نہ حال ہے اور نہ شاید مستقبل۔“

”مستقبل بنا کے دکھاؤ نا۔ کم ہمتوں اور بزدلوں کی سی باتیں کیوں کرتے ہو۔“ مانو بڑے

جذب سے بولی۔

کہ تم ڈاکٹر بن جاؤ گے۔“

وہ زہر خند لہجے میں بولا ”اس کے لیے کتنی لمبی مدت درکار ہوتی ماں۔“

”گٹ ہی جاتی۔“

”لیکن اب میں اس طرح کاٹنے پر تیار نہیں، کر میری ماں، بہنوں اور بھائیوں کے سامنے ہاتھ

پھیلاتی پھرے۔ میرے تعلیمی اخراجات کے لیے جھولی میں ترس اور رحم کی دین ڈولتی رہے۔“

صابرہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ”یہ ہماری تقدیر ہے بیٹے۔ تم کسی قابل ہو جاؤ گے تو سب قرضے

پکا دوں گی لیکن تم نے تو ابھی سے ہمت ہار دی۔“

”نہیں ماں ہمت نہیں ہاری، ہمت باندھی ہے۔“

”کیا کرو گے۔؟“

”فی الحال بی لے میں داخلہ لوں گا۔ ساتھ ساتھ کچھ کام بھی کروں گا۔ کم از کم اپنا بار ضرور

اٹھاؤں گا۔“

اُس نے بی اے میں داخلہ لے لیا۔

مانو کو بھی اُس کے میڈیکل میں داخلہ ملنے کا افسوس تھا۔ اس دن وہ ان کے یہاں آئی تو طارق

سے کہا: اس دفعہ کیا ہو گیا تھا جناب کو۔ کالج کی فضا اتنی راس آئی کہ اپنا نصب العین ہی بھول گئے۔“

”بعض دفعہ انسان مصلحتاً ایسا کرتا ہے۔“

”یعنی غیر کم لیتا ہے کہ میڈیکل میں داخلہ ہی نہ مل سکے۔“

”شاید۔“

”پاگل ہو تسم۔“

”شاید۔“

مانو ہنس پڑی۔ وہ چپ رہا۔

”اب بی اے کرو گے۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی۔

سر پر اتر رہی تھی۔ جب رشتہ بنی ہوئی، جہاں گاڑیوں، وگینوں اور بسوں میں سامنے لگے، دہن کی سچی سجائی گاڑی کے پیچھے آٹھ دس گاڑیوں کی قطار تھی۔ خاندان کے لوگ، عورتیں، لڑکیاں، اور بچے جہاں جگہ مل رہی تھی گھسا جا رہا تھا۔

ایک گاڑی میں فرنٹ سیٹ خالی پا کر طارق بھی آ بیٹھا۔ پچھلی سیٹ پر چند رشتے دار عورتیں اور بچے تھے۔ اسے پتا نہیں تھا کہ گاڑی کون ڈرائیو کرے گا۔

”ہائے جی جلدی سے بلاؤ نا کسی کو۔ کون لے جائے گا یہ گاڑی تھک گئے ہم تو یا پچھے بیٹھی خاتون نے کہا۔

”جی پتا نہیں!“ طارق بولا۔ ”ابھی کوئی آجائے گا۔ اگلی گاڑیاں تو چلی پڑی ہیں۔ یہ بھی۔“ اُس کی بات پوری بھی نہ سہجائی کہ کامران الکل اور ان کے دوست رشید اور سلیم آگئے۔

”تم یہاں کیوں آ بیٹھے؟ کامران، طارق کو دیکھتے ہی ملتے پرشکنیں ڈالتے ہوئے بولا۔

”جی۔“ طارق کچھ بولا گیا۔ آج کامران الکل صبح ہی سے اس پر گھسوا رہی تھی لگا ہی ڈال رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ مالو کے ساتھ گپ شپ لگاتا رہا تھا۔ زیادہ وقت اسی کے قریب رہا تھا۔

”کسی بس یا وگین میں نہیں بیٹھ سکتے تو اب صاحب!“ دل چیرہ دینے والے تفسیر لہجے میں کامران نے کہا تو رشید اور سلیم زیر لب مسکراتے ہوئے ہوئے۔

”بھئی ہم ادھر چلے جاتے ہیں۔ بیٹھ چکا ہے تو اب بیٹھنے دو۔“

”اٹھو۔“ دروازہ کھول کر کامران نے اس کا کالر پکڑ کر باہر کی طرف اُسے کھینچا۔ لہجہ فرعون کی تھا۔

”معززہ! ہمارے کھڑے ہیں اور جناب ڈسٹ کے بیٹھے ہیں۔ اتنی تمیز بھی نہیں۔ نکل یہاں سے۔ بس میں بیٹھ جا کر۔ بڑا آیا گاڑی میں بیٹھنے والا۔ باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی۔ ہونو۔“

طارق کا دماغ ہی کیا پوری کائنات ہی چکر لگتی۔ ذلت اور بے عزتی کے احساس نے اُسے کچل ڈالا

اس کے کانوں میں قیامت کا شور گونج رہا تھا۔

”باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی!“

”اچھا مستقبل بنا کے دکھا دوں۔ تو وہ مجھے پسند کرتے لگیں گے۔“

”ظاہر ہے۔“

”ہوں۔“ وہ ہنس پڑا۔ اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ مانو نے اُسے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا دیا۔

”کیا ہے تمہیں؟“

”پتا نہیں۔“

”بے وقوف نہ بنو۔“

”مانو۔ میرے اندر بڑی طوفانی بلبل چلی رہتی ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔ ان لمحات کا

قرض کیسے چکاؤں جو میری گزری ہوئی زندگی کو دبائے ہوئے ہیں۔ مجھے کچھ کرنا ہے میں کچھ کروں گا۔“

اس کے جوش و جذبے کو نظر انداز کرتے ہوئے مانو نے بڑے پیار سے کہا: ”کر لینا۔ پہلے اپنی

تعلیم کی طرف پوری توجہ سے دھیان دو۔ ڈاکٹر تو نہیں بنے۔ کچھ اور بننے کی کوشش کرنا۔ مقابلے کا امتحان

دے سکتے ہو۔“

وہ اُسے سمجھاتی رہی۔ وہ خاموشی سے سُنتا رہا۔ بی اے کے بعد ہی وہ کچھ فیصلہ کر سکتا تھا۔ بی اے

بھی اُس نے سائنڈ ڈویژن میں پاس کیا۔ دوسالوں میں پڑھائی کے ساتھ اس نے کئی چھوٹے موٹے

کام بھی کیے تھے۔ اپنا کیا اچھا خاصا امی کا خرچہ بھی نکالا تھا۔ اب وہ ایم اے میں داخلہ لے رہا تھا۔ اس

کے بعد سی ایس ایس یا سی ایس پی کرنے کا پختہ ارادہ تھا۔

لیکن،

انہی دنوں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے اس کے سارے منصوبے، سارے پلان بالکل ہی پلٹ

دیئے۔

بڑے ماموں کے بیٹے کی شادی تھی۔ وہ ایک ماہ پہلے کویت سے آگئے تھے۔ بڑی دھوم دھام سے

شادی ہو رہی تھی۔ رشتہ بھی اونچے می لوگوں میں ہوا تھا۔ بارات بڑی شان سے گئی۔ کئی موٹریں، وگینیں

اور بیس باراتیوں کو لے کر گئیں۔

”باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی۔“

”باپ نے بھی۔“

”باپ نے بھی۔“

اُسے لگ رہا تھا اس کے دل و دماغ کے پرچے اڑ رہے ہیں۔ وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا کچھ نہیں سمجھ سکتا اور کچھ نہیں بول سکتا۔ ایک اندھیرا گہرا کنواں ہے جس میں تیز گھاؤ کے ساتھ نیچے ہی نیچے چلا جا رہا ہے۔

اس گاڑی میں کامران نے رشید اور سلیم کو بٹھایا۔ پھر بے حس و حرکت کھڑے طارق پر ایک قہر مانی نگاہ ڈالتے دوسری گاڑیوں کی طرف چلا گیا۔

بعض چوٹیں ایسی ہوتی ہیں جو نظر نہیں آتیں۔ لیکن نظر آنے والی چوٹوں سے کہیں زیادہ اذیت دہا کہیں زیادہ خطرناک اور بالکل ناقابل برداشت ہوتی ہیں۔ وہ جب لگتی ہیں تو سہاری نہیں جاسکتیں اور اس سہارے نہ جاسکتے ہی ہیں زندگی منہموم بدلیتی ہے۔ اہم فیصلے ہو جاتے ہیں۔ وہیں بدل جاتی ہیں۔ قدم نئے اور اجنبی راستوں پر اڑنود اٹھ جاتے ہیں۔

طارق نے تقریباً انھیال ہی میں ہوش سنبھالا تھا۔ جب تک شعور کو نہیں پہنچا تھا تب تک ذہنی چوٹیں لا شعور ہی میں دب رہی تھیں۔ لیکن جب سے شعور ہوا تھا۔ اپنے ارد گرد غیر محسوس سا مرقم اور مہرودی کا حصار محسوس کیا تھا۔ اس کی شناخت ہی رحم اور ترس کے وسیلے سے ہوتی تھی۔ کامران انکل کی طرف سے تو اس نے سرد مہری اور تنج بستہ نظرتوں کو ہمیشہ ہی محسوس کیا تھا۔ اس کے اور بھی کزن تھے۔ ماموں کے بیٹے شاکرہ انٹی کے بیٹے سبھی تھے لیکن انکل کامران کو اس سے شروع ہی سے جانے کیوں پر خاش تھی۔

اب اس پر خاش کی وجہ وہ سمجھنے لگا تھا۔

یہ اس کی مانویں غیر معمولی دلچسپی اور دوسروں کے رحم و کرم پر پڑی بے سہارا شخصیت تھی

وہ عزیز تھا نا! اس لیے۔

اس لیے۔

ہاں اس لیے۔

یہ چوٹ اتنی گہری اتنی خطرناک اور ایسی رسوا کن تھی کہ طارق اپنے آپ میں نہا سکا۔ کامران انکل کے الفاظ پیسے کی طرح اس کے کانوں میں ہر وقت اترتے رہے۔

”باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی۔“

اُسے سمجھ نہیں آتا تھا۔ کہ اس ذلت و رسوائی اور طنز کا کیا کرے۔ کیونکر جواب دے۔ جو آگ

اس بات سے اس کے اندر کھول۔ اٹھی تھی۔ اسے کیونکر کامران انکل پر اٹ دے۔

انکل احمد بھی تھے۔ شاکرہ انٹی کے میاں پنگی کے ابو۔ کتنی عزت کرتے تھے اس کی اور اس کی

امی کی۔ کتنے پیار دیتے تھے۔ یتیمی کے احساسِ محرومیت سے نکالنے کے لیے کتنی مشہت باتیں کرتے تھے

لیکن

یہ کامران انکل!

اُف!

طارق پر تو دیوانگی کا وہ لمحہ بھی آیا کہ اس کے ہاتھوں میں اینٹٹھن ہونے لگی۔ آنکھوں سے آگ

برسنے لگی۔ کامران کا گلا دبوچنے کے لیے ذہن میں شدت سے خواہش سراٹھانے لگی۔

اسی رات مانو اس کے پاس آئی جس گاڑی سے کامران نے طارق کو نکالا تھا اس میں سیمیں بھی

بیٹھی تھیں۔ اس نے مانو کو بتایا تھا کہ انکل نے طارق کی کتنی بے عزتی کی ہے۔ مانو روہانسی ہو رہی تھی۔

طارق اپنے کمرے میں کھڑا باہر گھورا اندھیروں میں جیسے کچھ کھونج رہا تھا۔

مانو نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”طارق! یہاں کیا کر رہے ہو؟“

وہ آہستہ سے ہی مڑا۔ مانو نے وہی کپڑے ابھی تک پہن رکھے تھے۔ دلہن کے آنے سے گھر میں

بڑا ہنگامہ تھا۔ لیکن وہ سیمیں سے سب کچھ سنتے ہی ادھر آگئی تھی۔ طارق چند لمحوں کے لیے مقصدی

نظروں سے نکٹا رہا۔

”طارق“ وہ جیسے رو دینے کو تھی۔

”کیوں آئی ہو۔“

”ہیں۔ میں۔ تم ادھر کہیں نظر نہیں آئے۔ سب لوگ دلہن....“

”تم بھی جاؤ۔“

”تمہیں لینے آئی ہوں۔“

”کیوں۔ کامران صاحب کے کوئی اور نشتر ابھی....“

”طارق! اس نے اس کے کندھے پر سر رکھ دیا اور آٹھ سوہری آواز میں بولی ”میں بابا کے رویے

کی معافی مانگتی ہوں طارق! سبب نے ابھی ابھی مجھے بتایا ہے۔ پتہ نہیں بابا۔“

”تمہیں پتا ہے کہ تمہارے بابا کیوں ایسا کرتے ہیں سارہ بیگم۔“

طارق کے طنز پر ہلچے پر وہ ٹھپ گئی۔

”لیکن تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم میرے بچپن کے ساتھی ہو، دوست ہو عزیز ہو۔“

”ہاں۔ تم بھی میری زندگی ہو۔“

”تو بھیر۔ اس تلخی کو ذہن سے نکال دو طارق۔ میرے لیے۔ معاف کر دو۔“

مانو نے اسے کندھے سے پکڑ کر چھوڑا۔ تودہ تلخی سے بولا۔ ”شکر کر د اس بے عتیق پر میں نے

انہیں قتل نہیں کر دیا۔“

مانو سر تاپا کانپ گئی۔ ”طارق۔“ وہ گھبرا کر بولی۔

طارق ہنزد قدم اٹھا کر کمر کی سے دوڑ ہوئے چند لمحوں کے سوچتا رہا۔

پھر بڑبڑایا۔ ”مار ڈالنے کے اور بھی طریقے ہیں۔ اور بھی۔“

”کیا کہہ رہے ہو طارق؟“ مانو سیمے انداز میں کچھ نہ سمجھ کر اس کے قریب آگئی۔

طارق نے سینے پر ہاتھ ماستے ہوئے کہا: ”میری بے بسی اور غریبی نے مجھے اس حال تک پہنچایا

ہے۔ میں اس سے ڈوں گا۔ اُسے قتل کر دوں گا۔ اسے مار ڈالوں گا۔ قسمت سے چھینوں گا۔ اتنا کچھ کہ میری اور

میرے والدین کی ذات پر لگے عزت کے دھتے مٹ جائیں۔ وہ مزہ بند ہو جائے جس نے یہ کہنے کی جرأت کی

ہے کہ تیرے باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی۔“

مانو بے چاری کچھ نہ سمجھ سکی۔ آگے بڑھ کر طارق کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولی ”طارق

تم نے بہت زیادہ اثر لیا ہے، پلیز نارمل ہونے کی کوشش کرو۔“

طارق ہنسا ”میں بالکل نارمل ہوں میری مانو۔ یہی کہہ رہا ہوں نا کہ دولت کا دُاں گا۔ قسمت سے

اپنا حق چھینوں گا۔“

مانو خاموشی سے اُسے تنکٹی رہی۔

”مانو! اس نے مانو کی ٹھوڑی انگلی کے سہارے اونچی کر کے عجیب و غریب لہجے میں کہا عجیب و

غریب جو مانو کے لیے اٹکھا اور اجنبی تھا۔

”مانو! میرا اس وقت تک انتظار کر لو گی۔ جب میں سونے جاندی گا ڈھیر بنا کر اس پر کھڑا ہو

جھاؤں اور انکل عمران کی توجہ اپنی طرف مہفت کر سکوں۔“

”پتا نہیں کیا ہو رہا ہے تمہیں۔“ مانو نے سر جھکائے ہوئے کہا۔ ”آسا اثر بھی نہیں لینا چاہیے تمہیں

بابا تمہارے باپ کی جگہ بھی تو ہیں۔ باپ بچے کو ڈانٹ بھی سکتا ہے غصے بھی ہو سکتا ہے۔ تم تو پتا نہیں

کیا سے کیا بن گئے ہو۔“

”ابھی بنا نہیں۔ بننے کی سوت رہا ہوں۔ اور بنوں گا ضرور۔ نہ بنا تو زندگی سے مر مرٹوں گا۔“

”طارق۔“ مانو روئے لگی۔

اور وہ تیز قدم اٹھاتے کمرے سے نکل گیا۔

طارق نے ایم اے میں داخلہ لینے کا خیال ترک دیا۔ اس سے ماں سے کہہ دیا۔

صابر نے حیران ہو کر پوچھا ”تو بی اے کے بعد کیا کرو گے؟ تمہارے تو نمبر بھی اتنے نہیں

کہ....“

”ماں۔ یہ سب چھوڑ دے۔ میں نے پتہ نہ لیا ہے۔ بس۔“

جس دن اس نے روانہ ہونا تھا کچھ عزیز رشتے دار اکٹھے ہو گئے تھے وہ دعائیں اور پیار سمیٹ رہا تھا۔ انکل احمد تو واقعی بڑے پیار سے سمجھا رہے تھے۔ نصیحتیں کر رہے تھے۔ شاکرہ نے بھی پیار کیا تھا۔ حامدہ نے بھی لپٹا کر دعائیں دی تھیں۔ انکل کا مرنے میں بھی ہنس کر ہاتھ ملایا تھا۔ لیکن طنز سے باز نہیں آئے۔ "تھیک ہے بھئی باہر جا کر روٹی تو کھا ہی لو گے۔ یہاں جو کچھ نہیں کر سکتا باہر جا کر خاصا کما لیتا ہے" "شکریہ انکل" اس نے انکل کا ہاتھ اک اڑدے اک عمرم کے ساتھ مضبوطی سے دبا دیا۔۔۔

"آپ کی دعائیں شامل حال رہیں تو شلیلہ روتی کما ہی لوں وہاں۔"

ایئر پورٹ پر بھی کچھ لوگ چھوڑنے آئے۔ مانو بھی آئی تھی، پنکی بھی، دوسرے کزن بھی تھے۔ مانو کی آنکھوں میں بار بار نئی تیر رہی تھی۔ بچھڑنے کا دکھ اذیت دہ تھا، طارق سب سے ملا۔ مانو سے ملا تو سارے دکھا پنے اندر اتار لئے بولا۔ "مجھے سب سے زیادہ دکھ تمہیں چھوڑ دینے کا ہے۔"

مانو جلدی سے بولی "مجھے خط لکھتے رہنا طارق۔ ہم دور ہو جائیں گے۔ لیکن ایک دوسرے کو چھوڑ تو نہیں دیں گے نا۔"

وہ سٹوئی سے ہنسنے ہوئے پنکی کی طرف مڑ گیا۔ اس کے سر پر پنکی سی چپت لگاتے ہوئے بولا "بس اور لمبی نہیں ہونا، یہ نہ ہو میں واپس آؤں اور تم چنا کی بہن بن چکی ہو۔"

"ہائے نہیں طارق بھائی۔۔۔" وہ مڑمیل ہنسی سے بولی "کل پانچ فٹ پانچ انچ تو ہوئی ہوں اب بڑھتی تھوڑا ہمارا ہوں گی۔"

طارق باری باری سب سے ملا کسی سے مذاق کسی سے ہنسی۔ ماں سے آخری مرتبہ ملا تو آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اچھے دنوں کی امید رکھنا ماں، تمہاری دعائیں چاہئیں ماں مجھے۔"

"خدا تیرا حافظ و ناصر ہو بیٹے، صابرہ آنسو پڑے پونچھتے ہوئے بولی۔

"خدا مجھے میرے مقصد میں کامیاب کرے۔"

"آمین"

"پیسہ کمانے کا بھی تو کوئی وسیلہ ہوتا ہے۔ کوئی ہنر کوئی نوکری۔"

"یہ سوچنا میرا کام ہے۔ مجھے کچھ پیسے کی ضرورت ہے اور وہ۔ میں آپ سے لوں گا میرے خیال میں آپ کے پاس تو بڑا بہت زبور ہے۔"

صابرہ ہنس کر بولی "زبور پر نظر ہے تمہاری۔ پگلے وہ تو تیری دہن کے لیے رکھا ہے میں نے مشکل سے مشکل وقت میں بھی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔"

"اس سے مشکل وقت آپ پر آیا ہی نہیں ماں۔"

"کی مطلب؟"

"میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ دیرنا حزیدنا ہے۔"

"باہر؟"

"ہاں ماں۔ باہر جا کر پیسہ کماؤں گا۔ اتنا کر سونے چاندی کے ڈھیر لگا دوں گا تیرے قدموں میں" صابرہ پہلے تو مسکرائی، پھر سنجیدگی سے بولی "باہر جا کر پیسہ کمانا ایسا آسان بھی نہیں بیٹے۔"

"آسان مشکل آپ کے سوچنے کی بات نہیں۔ مجھے پیسے چاہئیں۔ بس۔ جانا میں نے ضرور ہے۔ میں بندوبست کر رہا ہوں۔ جلد ہی لٹا دوں گا آپ کی رقم۔"

"میری اور تیری رقم میں فرق ہے۔"

"بس پھر مجھے اجازت دیں۔ ماں میں بہت پیسہ کمانا چاہتا ہوں۔ بہت۔ اتنا بہت کر میری اور تیری زندگی پر رشتے داروں عزیزوں کے احسانوں کے جوٹھے لگ چکے ہیں نا، وہ مٹ جائیں میں سب کے احسان، سب کے دم، سب کے ترس ٹوٹا دینا چاہتا ہوں ماں۔ نہ ٹوٹا سکا تو گھٹ کے مر جاؤں گا۔"

صابرہ نے انہیں سینے سے لگایا، تسلی دی۔ وعائیں دیں وہ جانتی تھی طارق بہت حال ہے۔ پھر اس نے بیٹے سے جدا ہونے کا دکھ بھیل لینے کی ہمت اپنے میں پیدا کی۔ طارق نے دنوں ہی میں سب کچھ کر لیا۔ وہ یہاں سے سیدھا سعودی عرب جا رہا تھا۔

اب تو خاندان کیا دو ستون عزیزوں میں بھی اس کی دولت کے چرچے تھے۔ صرف دولت ہی نہیں تعلیم کے بھی چرچے تھے۔ بزنس کے ساتھ ساتھ اس نے تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا تھا پچھلے ہی سال ایم اے بھی کر لیا تھا۔

احمد انکل تو غیر پیلے ہی اسے بہت چاہتے تھے۔ لیکن اب تو عمران انکل کے رویتے بھی بدل گئے تھے، اس کی دولت اور تعلیم سے مرعوب ہو ہو جلتے تھے۔ پھر وہ انہیں ہر کسے والے کے ساتھ میٹھ قیمت اور نایاب تھے بھی تو بھیجتا تھا، گن کیونکر نہ گاتے اس کے۔

ابھی پچھلے ماہ ہی اس نے انہیں جو گھڑی بھیجی تھی اس کی قیمت انہوں نے معلوم کر دئی تھی۔ پورے پینتیس ہزار کی تھی پاکستان میں ادھر صابرہ نے جو ڈائمنڈ کا سیٹ مانو کو لے اے کسے پر دیا تھا۔ وہ کوئی کم قیمت تھا، ایکسپنسیو کھل گئیں سب کی، طارق آئے دن نایاب اور خوبصورت چیزیں بھیجتا رہتا تھا۔ ماں کو اس نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ فلاں چیز فلاں کو دیدو سوائے کامران انکل کے۔ ان کے لیے وہ ایک سے ایک بڑھتی چیز بھیجتا اور پوٹ لکھتا نہ سمجھتا۔ "کامران انکل کسے لیے۔ شاید میرے نظریہ انہیں پسند آجائے!" مانو کو صابرہ خود ہی اچھے اچھے تحفے دیتی تھی۔ اس سے کون سی بات چسپی تھی۔ وہ دونوں تو بچپن

ہی سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ مانو ہی نے تو اس کی ہو بننا تھا۔ طارق کی کمائی میں سے ابھی سے اس کا حصہ نکال رہی تھی۔ اسے خوشی تھی نا۔ ویسے چھوٹے موٹے تحفے وہ خاندان کی دوسری بچیوں اور بچوں میں بھی تقسیم کرتی تھی۔ پنگی نے ایف اے پاس کیا تو اسے بھی ڈائمنڈ کانغیس سا لاکٹ دیا۔

اب تو صابرہ خاندان کی بڑی محترم اور معزز خاتون تھی۔ ساری عمر دوسروں کی خدمت گزار رہی کرنے والی صابرہ کی خدمت کرنا اب ہر کوئی فخر کی بات سمجھتا تھا۔

کامران کارویہ تو بالکل ہی بدل گیا تھا۔ کروڑ پتی بیٹے کی ماں تھی صابرہ۔ اور یہ بیٹا اس کی بیٹی کا دیوانہ تھا۔ اسے تو وہ کہہ کر مانو کے نصیب پر حیرانگی آتی۔ اتنا یاد و مقدر تھا اس کا۔ طارق کی دولت کے چرچے عام ہو رہے تھے اتنا ہی اس کا غرور و تفاخر بڑھ رہا تھا۔

مانو نے ایم اے میں داخلہ لے لیا تو کامران نے ہنس کر کہا: "بیٹے خالی ٹولی بی اے، ایم اے کرنے

یوں وہ اک مقصد، اک عزم اور نظروں کی توانائی لے کر اپنے ملک سے غیر ملک کی جانب پرواز کر گیا۔

محبت بہت بڑی قوت ہے، طاقت ہے۔ توانائی ہے۔ لیکن نفرت بھی اپنی جگہ کچھ کم توانا نہیں ہوتی۔ اس کی قوت اور طاقت کی خطرناکی کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا۔

پیلے دو سال طارق نے جن مصائب و آلام سے گزارے یہ وہی جانتا تھا۔ ان دو سالوں میں اس نے کہاں کہاں کی خاک نہیں چھانی۔ در بدر ہوا۔ نوکریاں کیں مزدوری کی۔ پتھر کو ٹٹے ٹوکری اٹھائی۔ سیل بین بنا۔ کئی کئی ماہ بیکاری کی نذر ہوئے لیکن ہمتیں جواں ہوں ارادے پختہ اور عزائم مستحکم ہوں تو تقدیر بھی سرنگوں ہو جاتی ہے۔ طارق نے دن رات ایک کر دیئے تھے۔ ناکامی نے اسے کامیابی کی راہوں پر ڈالا تھا۔ اس نے واقعی کامیابی کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ کہ وہ اس کے قدموں کی باندی بن گئی تھی۔

عرب ممالک سے وہ یورپی ممالک میں آیا۔ حالات روز بروز ترقی کرتے گئے۔ تجربہ بڑھتا گیا۔ زمانہ سازی سیکھ لی۔ اب وہ ماں کو باقاعدگی سے پیسے بھیجنے لگا۔ ہر ماہ اتنا پیسہ بھیجتا کہ کیسی جان کو سال بھر کے لیے کافی ہوتا۔ لیکن وہ ہر خط میں امر کرتا۔ "ماں، جی کھول کر خرچ کرو۔ اپنے اوپر اداں لوگوں پر جن کے احسانات تلے ہم آداب گئے تھے کہ سانس نہ لے پاتے تھے خوب تحفے تحائف دیا کرو سب کو۔"

اب اس کے پاس بہت پیسہ تھا۔ وہ یورپ سے امریکہ چلا گیا۔ جہاں اس نے اسٹور کھولا۔ یہ اسٹور چھلکا گیا۔ ڈالروں کا ہٹن برستا گیا۔ وہ ہزاروں ڈالروں کو بھجوتا۔ ماں کے لیے اس نے ایک نئی خوبصورت کوٹھی خریدی۔ نوکر رکھوائے۔ خوبصورتی سے آڑا سہ کر دیا۔ گاڑی لی۔ یہ سارے کام اس نے اپنے پاکستان جانے والے دوستوں سے کروائے۔ یہ دوست اپنی چیزوں سے زیادہ اس کی چیزیں لے کر آتے تھے۔

کا کیا فائدہ؟“

”تو بابا۔“ مانو حیرانگی سے بولی۔

”بھئی انگریزی بولنا سیکھ لو۔ فزفز کر کے۔ امریکہ جاؤ گی تو کوئی جھجک محسوس نہ ہو۔“

”بابا۔“ مانو شرما گئی۔

عامر نے بھی یہی کہا: ”بھئی ٹھیک کہتے ہیں تیرے بابا۔ مانا کرتے تھے انگلش لکھنا پڑھنا آتی ہے لیکن بولنے کی جھجک دور سوئی چلا بیٹے۔ امریکہ جا کر تمہیں محض زبان کی وجہ سے کمپلیکس نہیں ہونا چاہیئے۔“

”آتی ہے مجھے۔“ وہ اٹھلا کر بولی۔ اور پھر شرمیل نگاہیں اتنی ابو پر ڈالتے ہوئے دوسرے کمرے میں بھاگ گئی۔

طارق کے آنے کی خبر تو اک خوشگوار مہک کی طرح سب طرف پھیل گئی۔ صابرہ کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بار بار بارگاہِ الہی میں سجدہ رینہ ہو کر اس کے سلامتی سے آنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ لگتا تھا زندگی میں اسے دیکھ ہی نہ پائے گی۔

لیکن خدا اس پر مہربان تھا۔ عین تیوں اور نوازشوں کی بارش برسا رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی تیاریاں کر رہی تھی۔ طارق نے یہ بھی نوکھا تھا کہ وہ شادی کرنے آ رہا ہے

وہ کتنی دھوم دھماکے سے شادی کرنا چاہتی تھی؟

کتنے ارمان پورے کرنا تھے۔

کتنی حسرتوں کو تسکین دینا تھی۔

وہ سوچ سوچ کر ہی باؤ لی ہوئی جا رہی تھی۔ اتنی خوشیوں کا بار سمیٹے نہیں سمٹ رہا تھا۔

خاندان کے دوسرے لوگ بھی متغیر تھے۔ خوش تھے۔

لیکن صابرہ کے بعد اگر خوشی تھی تو وہ کامران، عامرہ اور مانو کو۔ عامرہ اور کامران نے

تو اپنے طور پر چپکے چپکے شادی کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں مگر چوڑا چہرہ تو چاہیئے نہیں تھا۔

صرف زیورادہ کپڑا بنوانا تھا۔ باقی نقد ہی دینے کا سوچ لیا تھا۔

مانو نے ایک خوبصورت ڈریس اس خوش قسمت دن کے لیے تیار کروایا تھا۔ جس دن اس نے طارق کو اپنے انرپوسٹ جانا تھا۔

درزی کی دکان پر وہ ڈریس دیکھ کر مین میچ نکال رہی تھی۔ ”ماسٹر یہ مٹن یہاں لگنے تھے اور پیر پچٹ یہاں آئی تھی۔ تم نے تو ڈیزائن ہی خراب کر دیا۔ اب میں کیا پہنوں گی؟“

درزی نے تسلی دی: ”بی بی یہ پانچ منٹ کا کام ہے، ابھی آپ کی مرضی کے مطابق بن جائے گا۔“

”تو بناؤ جلدی سے مجھے چاہیئے ضروری۔ آج ہی لے کر جاؤں گی۔“

”کوئی کام ہو بازار میں، تو ہو آئیے آنے تک بن جائے گا۔“

وہ بازار کا چکر لگانے چلی گئی۔ ملازم ساتھ تھی۔ کچھ دیر بعد گھوم پھر کر آئی تو دکان پر پہنکی بھی اپنے کپڑے لینے آئی تھی۔ اس نے اک سادہ سا کٹن کا جوڑا سننے کو دیا ہوا تھا۔ مانو کا ڈریس دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی: ”منگنی کے لیے بنوایا ہے؟“

”آہا۔“ وہ اٹھلائی ”تمہارا کیا خیال ہے منگنی پہ میں ایسے کپڑے پہنوں گی۔“

”ہاں بھئی۔ طارق بھائی شاید امریکہ ہی سے لے کر آئیں کوئی انوکھی چیز۔“

”شاید۔“ اس نے بڑے زلم سے آنکھیں گھما کر کہا۔

”بہت خوش ہو۔“ پنگل نے چھیڑا۔

”اولی ہوں؟“ مانو نے منہ بنایا۔

”کیوں؟“

”میں تو نادانم جوں طارق سے۔“

”کیوں؟“

”بس۔“

”پھر بھی۔“



جن میں اس کی پیاری ماں بھی ہوگی اور۔ اور۔ کامران انگل بھی۔  
مانو بھی ضرور ہوگی۔

اس نے اک جھڑی سی لی۔ اذیت کے سائے اس کے چہرے پر لہرائے۔ آنکھوں میں کرب  
ساحیل گیا۔ اک لمحے کو اسے یوں لگا جیسے وہ ڈگمگا گیا ہے۔ چھ سو اچھ سالوں کی طوالت پر پھیلے  
فیصلوں سے ہٹ گیا ہے۔

لیکن دوسرے لمحے وہ سنبھلا۔ اس کے اندر اک زور دار سٹی نہیں گونجی۔  
بالکل اسی طرح جس طرح اس کے اندر انگل کامران کی بات گونجی تھی۔  
"باپ نے بھی کبھی گاڑی دیکھی تھی؟"

وہ جو چند لمحے پہلے موم کی طرح پگھل کر بہہ جانے لگا تھا۔ اب کسی سخت دھات کے قلاب میں  
ڈھل گیا، اس کا عزم پکا تھا۔ پکا۔ جو کبھی ڈگمگا نہیں سکتا تھا۔  
ایئر پورٹ پر واقعی ہٹ سے لوگ اسے لینے آئے تھے۔ کچھ لوگ تو جیسے اسے پہچان ہی نہ سکے، کیا بھلا  
کتنا صحت مند اور کیسا خوبصورت نکلا تھا۔

صدر تو اس سے لپٹ کر بے اختیار سی ہو گئی۔ خوشی منبھل نہ پائے تو رونے سے توازن قائم ہو  
جاتا ہے۔ وہ بھی ردہ تھی۔ طارق اسے مضبوط بازوؤں میں تھامے خود بھی روہا ہوا تھا۔  
جدلی کی کتنی تنخیاں اس نے اپنی جان پر ہسی تھیں۔

کامران انگل بھی اسے ملے۔ اتنے زور سے سینے سے لگا کر بھینچا کر اسے لگا سیٹھ ہی میں سمولیں گے۔  
احمد، عامرہ، اشکرہ اور چھوٹے بڑے کسی کزن آئے تھے۔ مانو بھی تھی۔ بہت شوخ اور چپقل بن چوٹی  
تھی۔ اسے دیکھا تو شرما کر آنکھیں جھکا لیں، گالوں پر سرخیاں لہرائے گئیں۔

"اسیلو مانو۔ اب بھی مانو ہو یا سارہ بن چکی ہو۔" طارق نے اسے دیکھ کر کہا۔

کامران قریب ہی کھڑا تھا۔ ہنس کر بولا "بھئی سب کے لیے سارہ بن جائے، تمہارے لئے تو

مانو ہی رہے گی نا۔ تم نے ہی اس کا نام مانو بنی رکھا تھا۔"

"بہت خراب ہے؟"

"خیریت؟"

"چھ سات سال کے بعد آ رہا ہے؟"

"ہاں؟"

"اس عرصے میں مجھے ایک خط بھی نہیں لکھا؟"

"چل بے مشرم کہیں کی۔"

"اس میں بے شرمی کی کیا بات ہے۔ دیکھنا کتنی ٹرائی کرتی ہوں آتو لے؟"

"بھئی ایر پورٹ پر ہی نہ لڑ پڑنا۔"

"میں ایر پورٹ پر ہی نہیں جاؤں گی۔"

"چل رہنے دے۔ تو تو دو دن پہلے ہی جا بیٹھے گی ایر پورٹ پر؟"

مانو کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پھر بولی "یعنی مشکل کو وہ آ رہا ہے اور میں پر نہیں اتوار یا ہفتے

ہی کو جا بیٹھوں گی۔"

"تو اور۔۔" وہ بھی ہنس پڑی۔

مشکل کی شام چھ بجے کی فلائٹ سے وہ پہنچ رہا تھا۔

طیارے میں انڈسٹنٹ ہو رہی تھی لاہور آ رہا تھا۔ لوگوں میں پہلی سی چڑ گئی تھی۔ کچھ بیٹیوں

باندھنے لگے تھے کچھ سامان پر نگاہ ڈال رہے تھے کچھ گرد و پیش پر طائرانہ نگاہ ڈال کر یہاں اترنے

والوں کا نظارہ کر رہے تھے۔

طارق نے بھی اک لمبی گہری سانس لی، اک جھٹکے سے ماضی کے حصار سے نکلا۔ بریف کیس اور

بیگ قریب کیا، اس کے اندر بے چین سی گھبراہٹ تھی۔ اضطراب تھا، خوشی تھی اور تعاضد تھا۔

اسے یقین تھا بہت سے لوگ اسے لینے آئے ہوں گے۔

سی محسوس کی۔

طارق ہنس پڑا، پھر اس نے پنکی کو دیکھا سرو قد سی پنکی بھی بڑی پرکشش نوجوان لڑکی بن چکی تھی۔

”شکر ہے تم اور لمبی بنیں ہو گئیں۔“ طارق نے اس کے سراپا پر پُر شوق نگاہ ڈالی۔

”اتنی کی اتنی ہوں نا طارق بھائی۔“ پنکی بے تکلفی سے ہنسی۔

”اوں ہوں۔“ قد کی تواضع ہو۔ لیکن سواچھ سال بڑی ہر چکی ہو۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

رات کو صابرہ کی نئی کوٹھی میں بڑی گہما گہمی تھی۔ ایرپورٹ سے سب لوگ ادھر ہی آگئے تھے۔

طارق سے مل کر جیسے جی نہیں بھر رہا تھا۔ طارق بھی کچھڑے عزیزوں سے مل کر خوش ہو رہا تھا۔

سوال و جواب کے سلسلے تھے کہ ختم ہونے ہی میں نہ آ رہے تھے۔

چھ سواچھ سال کی رو داد سننے کو ہر کوئی بے چین تھا۔ سوالوں پر سوال پوچھے جارہے تھے۔ طارق

ابھی ایک بات کا جواب بھی نہ دے پا کر دوسری طرف سے سوال ہو جاتا چلتا ہے اور کھانے پر بھی یہی سلسلہ

رہا۔ زیادہ تر سوال اس کی بے پناہ دولت ہی کے بارے میں ہو رہے تھے۔ انکل کا مران تو جیسے الف سے

ی تک کا حساب لینا چاہ رہے تھے۔ طارق ان کی ذہنی کیفیت کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ جب انہوں نے ہنستے

ہوئے پوچھا: ”کل مالیت کتنی ہوگی تمہارے اسٹوروں کی....“

طارق نے ان کی طرف دیکھا پھر اک طنز یہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی۔ اس مسکراہٹ

پر کوئی تصنع کا بدوہ ڈالے بغیر بولا: ”کامران انکل، اللہ کا بڑا احسان ہے۔ جس کے باپ نے کبھی گاڑی

سبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ گاڑیاں تو کیا پلین بھی خریدنے کی استطاعت رکھتا ہے۔“

کامران کے ذہن پر جیسے اس نے اک کاری ضرب لگا دی۔ یہ جملہ اسے وہ سارا واقعہ یاد دلا گیا۔

بہت خفقت محسوس کرتے ہوئے چند لمحوں بعد بولا: ”بیٹے وقت دقت کی بات ہوتی ہے۔“

”بالکل انکل، وقت وہی کی بات ہوتی ہے۔“ طارق نے جواب دیا، اور پھر انکل احمد کی طرف مڑ کر

ان کی احوال پرسی کرنے لگا۔

دونوں کی گفتگو سے کوئی بھی نو کچھ سمجھ نہ پایا تھا۔ مانو وہاں تھی نہیں۔ صابرہ نے البتہ کچھ تلخی

رات جب ماں بیٹا دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تو صابرہ نے اچانک ہی پوچھ لیا: ”یہ تو نے

کامران کی بات کا اتنی ترشٹی سے کیوں جواب دیا تھا کہ باپ نے گاڑی نہیں دیکھی۔“

”اوماں! طارق نے طائیت کی راک گہری سانس لی۔ پھر بولا: ”یہ کہنے کے لیے تو میں نے چھ سات

سال جانے کس طرح صبر کیا ماں۔“

”کیا کہہ رہا ہے۔“

”ماں! انسان سب کچھ بھول سکتا ہے لیکن ذلت و رسوائی نہیں بھول سکتا۔ یہ زخم۔ یہ زخم

لگ جائیں تو ہرے ہی رہتے ہیں۔ آگ کی طرح جلتے رہتے ہیں۔ اذیت وہ اور کرب ناک۔“

”میں سمجھتی نہیں۔ ٹھیک ہے کامران کا رویہ تیرے ساتھ کچھ اچھا نہیں ہوتا تھا۔ لیکن

اب تو....“

وہ ہنسنا اور ہنستا چلا گیا۔

صابرہ پہلے تو اس کا منہ نکلتی رہی پھر قدرے سختی سے بولی: ”پاگل تو نہیں ہو گیا تو۔“

”نہیں ماں نہیں۔“ اس نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے اپنا سر ماں کی گود میں رکھ دیا۔ اور پھر۔

پھر؟

وہ واقعہ ماں کو سنایا۔ بے عزتی۔ ذلت اور رسوائی کا واقعہ۔

صابرہ بُت سی بن گئی۔

”ماں۔ میں نے اسی دن عہد کر لیا تھا۔ ارادہ باندھ لیا تھا۔ کہ دولت کا اتنا اونچا ڈھیر لگا کر

اس پر کھڑا ہوں گا کہ کامران انکل کو گردن پیچھے لے جا کر مجھے دیکھنا پڑے۔ میں حق پہ تھا سچا تھا۔

میری انا کی چوٹ گہری تھی خدا سے مجھے کامیاب کر دیا۔“

وہ بولنا چلا گیا۔

صابرہ سُن بھی رہی تھی اور نہیں بھی سُن رہی تھی اس کی سوچیں تو الجھ رہی تھیں۔

ان حالات میں ان احساسات کے ساتھ ان جملوں کو بیٹے — کیا طارق — مانو — ؟  
وہ کچھ سوچ نہ پائی ۔

طارق نے گود سے سر اٹھایا اور ماں کی آنکھوں میں اپنی آنکھیں ڈال کر بولا کہ "ماں! کامران! آنکھل  
نے تمہاری بھی تو کہیں عزت نہ کی تھی۔"

”لیکن۔“

”کیا ہاں ؟“

وہ چپ رہی ۔

طابق پھر لولا: " شاید میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو ماما۔ "

"بولو، کیا ارادہ ہے۔"

وہ مہنس کر پولا۔ "شادی کر کے آئی ہوں۔"

”کس سے کرو گے۔“

وہ چند لمحے چپ رہا۔ اس کے خوبصورت پہرے پر اُداسی پھیل گئی۔ گہری گہری آنکھوں میں تلاطم سا بچا ہو گیا۔ چند ثانیے اپنے نچلے ہونٹ کا گوشہ دانتوں تلے کاٹا رہا۔ پھر بڑے گہکھیرے میں بولا۔

”مانوسے یقیناً نہیں۔“

”طا...ر...ق“

”ہاں ماں... یہ فیصلہ میں نے بہت پہلے کر لیا تھا۔ لیکن محفوظ اس لیے رکھا تھا کہ اپنی اہانت کا بدلہ لے سکوں۔ کل آپ نے دعوت دی ہے مناسب کو۔ کل۔ کل اس دعوت میں میری منگنی کا اعلان بھی کر دینا ماں۔“

صابرہ ہنگامتا اسے تک رہی تھی

”سب کے سامنے۔ ہاں ماں سب کے سامنے ہیں... منگنی کی انگوٹھی۔“

صابرہ بے صبری سے بولی "کیسے پہتاؤ گے۔"

طارق نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "پینکی کو۔"

صبارہ پوری ہنکھیں کھولے اسے ہنسنے لگی۔ اس نے پھر ماں کی گود میں سر رکھ دیا اور آنسوؤں کی نئی گھل آواز میں بولا۔ ”آپ کل صبح شاہکارہ امی اور احمد انکل سے پنکی کے یہ بات کر لو ماں سب کچھ بہت جلد ہو جانا چاہیئے۔“

”لیکن بیٹے۔“ صابرہ کی آواز بجھ گئی۔

طاریق نے سراٹھایا۔ سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے ماں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہتی آواز میں بولا

”میں نے جو کچھ کہا ہے وہی کروں گا۔ آپ شاید جانتی ہیں کہ مانو سے مجھے کتنا پیار ہے پھر بھی میں اس کے پیار سے منہ موڑ کر سہیل کی کو قبول کر رہا ہوں، ہاں ماں۔ میں دانستہ ایسا کر رہا ہوں کچھ زخم بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ انہیں بھرا نہ جائے تو موت کا پیغام بن جاتے ہیں۔ ان کی رفوگری کی جاتی ہے۔ وہاں بھی زخم نہ بند جاتا ہے۔ لیکن....“

”ہیں کچھ نہیں سمجھی۔“ صابرہ نے تلخی سے کہا۔ جو جی میں آتا ہے کہ۔۔ میرے لیے تو جیسی مانو ویسی پنکی۔ فرق تو تجھے ہی پڑے گا۔ \*

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ بے تاب بہ تاب ہو کر بولا۔ ”ہاں مجھ ہی پڑے گا۔ لیکن تم نہیں جانتیں  
 ماں نہیں جانتیں۔ نہیں جان سکتیں۔“

وہ غیر متوازن چال میں توازن پیدا کرتا کرے سے نکل گیا۔

دو مہری شام بڑی حسین و رنگین تھی۔

بہت بڑی اور پُر تکلف دولت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جہاں آرہے تھے۔ گہا گمگی اور رونق بڑھ رہی تھی۔ فضا میں خوشی و مسرت کے فتنے گونج رہے تھے۔ جہک بگھر رہی تھی۔ خوشگوار موضوعات پر بڑے ہلکے پھلکے انداز میں باتیں ہو رہی تھیں۔ اس محفل میں عامرہ اور کارمان پیش پیش تھے۔ وہ بڑے دلفریب انداز میں محفل کی رونق بڑھا رہے تھے۔ خوش گپیوں اور جاندار قہقہوں سے ماحول کو رعنائی بخش رہے تھے۔

بہشتے مسکراتے سب طارق کے گرد جمع تھے۔ پنکی اور مانو بھی آگئی تھیں۔ کس بات پر ہنسیوں کی پھوار برس رہی تھی۔ مانو کو پتا تھا نہ پنکی کو۔  
طارق نے حسیب سے ایک خوبصورت ڈیوڈ نکالی جس میں انتہائی نفیس اور بیش قیمت انگوٹھی تھی انگوٹھی نکال کر اس نے ماں کی طرف دیکھا۔ "اجازت ہے ماں۔"  
صابرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

طارق نے انکل احمد اور شاکرہ آئی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "اجازت ہے"  
ان کی مسکراہٹ ہی اجازت تھی۔ طارق آگے بڑھا۔ اور پنکی کے عین سامنے کھڑا ہو کر ایک بار انگوٹھی کو دیکھا۔

پھر پنکی کو۔ مسکرا کر۔ نگاہوں میں شوق کی چمک لاکر۔  
پنکی ہڑبڑا گئی۔ مانو نے گھبرا کر دونوں کو دیکھا۔... کامران انکل اور عامرہ تو دم بخود ہو گئے۔  
اس نے پنکی کا ہاتھ تھما کر۔... انگوٹھی اسے پہنا دی۔ پنکی ٹرسخ ہو گئی۔ شرملا کر وہاں سے  
بھاگ جانا چاہا لیکن صابرہ نے اسے بازوؤں میں بھر لیا مبارک سلامت کا شور مچا۔ "نالیال بچائی گئیں۔  
واہ واہ کی گئی۔ کچھ لوگ متوجہ بھی ہوئے۔ ان کے خیال میں قرعہ خال تو مانو کے نام نکلتا تھا، مانو تو  
بیسے پتھر ہی گئی۔ کچھ ہی حال عامرہ کا تھا۔

طارق نے کامران کی طرف دیکھا۔ بچتے چرائ اس طرح دھواں دے رہے تھے کہ ان کی شکل  
پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ زندگی نے اس سے زیادہ شدید دھچکا شاید اسے کبھی نہ لگایا ہوگا۔  
طارق نے آج اس ذلت و رسوائی کا بدلہ لے لیا تھا۔ جو اس کے لیے سوہان روح بنی تھی جو  
وہ بچپن سے جھیلنا آیا تھا اور جس کی انتہا اس دن ہو گئی تھی۔ جس دن انکل کامران نے سب کے  
سامنے اسے کالر سے پکڑ کر گاڑی سے گھسیٹ کر نکالتے ہوئے رکیک جملہ کہا تھا۔ "باپ نے بھی کبھی  
گاڑی دیکھی تھی۔"

اتنے عرصے کے بعد طارق کو آج سکون ملا تھا۔ رستے زخم مندمل ہو گئے تھے۔

مانو نے بھی آج بہترین لباس زیب تن کیا تھا۔ اپنے طور پر ہی اس نے اپنی سہیلیوں کو بھی دعوت  
دے ڈالی تھی۔ ستاروں کے چٹھڑے میں چاند بنی اٹھلائی پھر رہی تھی۔ اپنی سہیلیوں کو طارق نے نئے  
رشتے کے سولے سے ملوانے کا ریش کی وجہ سے موقع نہیں مل رہا تھا۔ طارق کو ملنے والے چھوڑ ہی کب رہے تھے۔  
مختلف قسم کے مشروبات سے مہمانوں کی تواضع ہو چکی تو آصف نے آکر کہا۔ "صابرہ آئی کھانا لگا  
دیں؟"

طارق نے گھڑی دیکھی۔ پھر ماں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "امی پہلے رسم نہ ہو جائے؟"

"کیسی رسم؟"

"کوئی رسم؟"

ارد گرد کھڑے لوگوں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔ ان لوگوں میں کامران بھی تھا۔

"کیسی رسم بیٹے؟" کامران ہی نے بڑھ کر پھر پوچھا۔

"انکل منگنی کی رسم۔" طارق نے بڑے مستحکم لہجے میں کہا۔ صابرہ جھجک کر دوسری طرف کیپنے لگی۔

کامران کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ عامرہ کو آواز دے کر بلایا۔ طارق اس کے چہرے پر جمل

اٹھنے والے چراغوں کو دیکھ کر بید مسرور ہو رہا تھا۔

چرائ:

ہوا لگے لگے گل ہو کر دھواں دینے والے تھے۔

سب طارق کے گرد کھڑے ہو گئے۔ احمد انکل اور شاکرہ بھی آگئے۔ خوش تو دونوں بہت

تھے لیکن کچھ جمل غل بھی تھے۔ سب چمک رہے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔

"دعوت کی خوشی دوبالا کر دی تم نے"

"لطف آبلے گا"

"ایک پتھ دو کاچ۔"

"نہیں صبی، منگنی کی باقاعدہ دعوت الگ ہوگی۔ چھوڑیں گے نہیں ہم۔"

## انتظار

سب کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔

آج جمال آ رہا تھا۔ پورے تین سال بعد واپس آ رہا تھا۔ راجاں اور کملے کا تو پاؤں زمین پر نہیں آ رہا تھا۔ بیٹا تین سال کی کمائی سمیت آ رہا تھا۔ گاؤں کے بہت سے لڑکے باہر گئے ہوئے تھے۔ جمال ان کے ہاتھ اکثر تھکے تھا لطف بھیجا کرتا تھا۔ کبھی چا پانی ریشمی سوٹ، کبھی گھڑپاں تو کبھی الیکٹرک کی کوئی چیز۔ زہراں، چھوٹا اور شاہد کے لیے تو اس نے اسی طرح چیزیں بھجوا بھجوا کر کافی چیزیں جمع کر دیا تھا۔ اب تو وہ خود آ رہا تھا۔ ڈھیر ساری دلائمی چیزوں کے ساتھ۔ ہزاروں روپے کی ہینڈیاں لے کر۔ کمالے کے لیے وگین تو اس نے آنے سے پہلے ہی جگ کر دتی تھی۔

راجاں آج بہت سویرے جاگ گئی۔ رات بھر اس نے سوتے جاگتے میں جمالے ہی کے پسینے دیکھے تھے۔ اس کا ایک اکھوتا بیٹا پورے تین سال بعد آ رہا تھا خوشی اس کی رگ رگ میں تیر رہی تھی۔ منسا بیٹے پر نچا در ہونے کو تڑپ رہی تھی۔ وہ تصور کی انگلی سے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ تین سالوں میں وہ کیسا ہو گیا ہوگا۔ اب تو خوب صحت مند ہوگا۔ رنگت تو جب تین سال پہلے وہ گھرا آیا تھا میلی ہو گئی تھی۔ عرب ملکوں میں گری بھی تو بہت پڑتی ہے۔ بے شک وہ انٹرنیشنل کمرے میں رہتا ہے لیکن کام تو باہر ہی کرتا ہے نا۔ مجلس دینے والی گئی اور قیمتی ریت۔ راجاں کا دل ہول رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اب کے جمالے کو واپس جانے نہیں دے گی۔ وہ اتنا پیسہ تو لے آئے گا کہ یہیں کوئی چھوٹا موٹا کام کرے۔ لیکن اس کی سوچ رک جاتی۔ پھوٹے موٹے کام سے اب گزارا نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک دو بار تو اسے باہر جانا ہی پڑے گا۔ تینوں بنیں

گو اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ زخم مندمل ہوئے۔ لیکن نئے زخم کو بھی جہم دے گئے۔ مانو کی محبت کا لگاؤ نہٹ کر اس نے سکون کی راہ پائی... اسے ایسا کرنا پڑا۔  
کچھ پانے کے لئے، کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ خطرناک زخموں کی زخموں کی روگمری کے لیے جہم کے صحت مند جھٹے ہی سے تو نمکڑا کاٹ کر لگانا پڑتا ہے۔  
نجرت بہت بڑی قوت ہے۔ طاقت ہے۔ توانائی ہے۔

لیکن

نفرتیں بھی اپنی جگہ کچھ کم توانا نہیں ہوتیں۔ ان کی قوت اور طاقت کی خطرناکی کا توازن ذرا ہی نہیں لگایا جاسکتا۔ نہیں لگایا جاسکتا۔

بیل کی طرح بڑھتی جا رہی تھیں۔ فوراً اس کی شادی بھی کرنا تھی اور اس شہر میں زمین خرید کر مکان بھی بنوانا تھا۔ گاؤں میں تو جمال کا رہنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ پھر یہاں بھی کون سی زمین جائیداد تھی۔ لے دے کے مٹی کی کچی دیواروں والا یہ گھر دندا ہی تھا۔ اسے ادنے پونے پنج کشرہ میں زمین کی جا سکتی تھی۔

راجا نے دو ایک بار جمائی لی، کرٹ بدل دی، کھنکار کر گلا صاف کیا تو اپنی چارپائی پر چٹ بیٹا ہوا کھلا بولا۔ ”ابھی تو آدمی رات ہے۔“

”تم بھی جاگ گئے۔“

”میں تو سویا ہی نہیں۔“

”فرقے میں لے رہی تھی؟“

”بھلی لوگ، آنکھ پھٹکی ہوگی۔ پڑیند پوری طرح نہیں آئی۔“

”بیٹے کے آنے کی خوشی میں۔“

”تو بھی توجاگ رہی ہے۔“

”ہاں۔“

”چیزیں گن رہی ہوگی۔ جلالیہ لائے گا، وہ لائے گا۔ گھر بھر دے گا تیرا۔“

”گھر تو اس کے آنے سے ہی بھر جائے گا۔ صورت کو ترس گئی ہوں۔ پورے تین سال ہو گئے

اسے دیکھے۔“

”اب جی بھر کے دیکھ لینا بھلی لوگ، پورے تین ماہ کی رخصت پہ آ رہا ہے۔“

”چٹکی بجاتے گزر جائیں گے تین ماہ۔ میرا تو جی چاہتا ہے اب اسے واپس ہی نہ جانے دوں۔ بہنیری

کمانی کر لی ہے۔ ان تین سالوں میں خوب جمع کر لیا ہوگا اس نے۔ ان پسیوں سے یہاں چھوٹا موٹا کاروبار

کرے گا۔“

”ہُن۔ یہ تو کہہ رہی ہے راجاں۔“

”ہاں۔ میں ہی کہہ رہی ہوں۔“

”اور تیرے خرچے کہاں سے پورے ہوں گے؟“

”خرچے کیا ہیں؟“

”یہ جو تین کی تین برابر کی ہو گئی ہیں۔ انہیں بیاہنا نہیں ہے۔ اب تو عام شام طریقے سے انہیں

بیاہنا بھی نہیں تو نے۔ سب کے دامع عرش پر پہنچ گئے ہیں۔ اب تو تیری بیٹیاں لمبے چوڑے جہیز

کی ساؤنڈیاں ڈالتی رہتی ہیں۔“

”ہاں یہ یہ خرچے تو ہیں ہی۔ لوگوں کو بھی پتا ہے۔ بیٹا باہر گیا ہو رہا ہے۔ بڑا جہیز ملے گا اس گھر

سے، ایسے ہی تو رشتے نہیں پوچھ رہے لوگ۔ اور جو زہرا کے سسرال والے ہیں نا۔ وہ تو کئی فرمائشیں

ہولے ہولے کانوں میں ڈال جاتے ہیں۔“

”پھر تو کیسے کہہ رہی ہے کہ بجائے کو واپس نہیں جانے دے گی؟“

”اسے سہ جالا کیوں کہتے ہو۔“

”تو کیا کہوں؟“

”اب خبر سے اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ اتنا پیسہ کما رہا ہے۔ نام تو ٹھیک سے لیا کرو۔ جمال کما کرو۔ ہاں

ہنس کیوں رہے ہو۔“

”تمہاری باتوں پر۔ اسے بھاگوں۔ میں ابھی تک کھلا ہوں۔ کمال نہیں کما کسی نے کبھی۔ جائے

سے دگنی عمر ہے میری۔ تو پھر....“

”پھر کیا۔ تمہاری اور بات ہے۔ اس کی اور۔“ وہ کیسے؟“

”تو گاؤں میں رہتا ہے۔ اور کرائے کی دگین چلاتا ہے۔“ راجا نے شوخ نگاہوں سے شوہر کو دیکھ

کر کہا۔ کمالا مسکراتے ہوئے اسے تکلے لگا۔ اور کسی دن راجاں ایسی بات کہتی تو شاید وہ اسے ناز کے رکھ

دیتا۔ بہت جلد غصے میں آجایا کرتا تھا وہ لیکن آج اسے عفتہ نہیں آیا۔ راجاں کی شوخی طنز نہیں لگی خوش

ہو گیا وہ اس کی باتوں سے۔ بستر میں اٹھ کر بیٹھے ہوئے بولا۔

”تو خود تو اے جمائے کے نام سے پکارتی ہے۔ مجھے کیوں کہتی ہے جمال کما کروں۔“

”اے ہے۔ گھر میں یہ اس کے پیار کا نام ہے۔ تو تو باہر بھی اسے جلا ہی کہتا ہے۔ لوگوں کے سامنے جمال کما کر۔ ہاں۔ اب وہ کوئی گاؤں کا جاہل گنوار چھوڑ کر تو نہیں ہے نا پچھلے مینے جو تصویر بھیجی کیسا صاحب بہادر لگتا ہے۔“

”ہاں، بہت بڑھیا سوٹ پہنا ہوا ہے اور گلے میں کالے دھاگے والا وہ تعویذ بھی نہیں، ابو تو نے اسے پسنایا تھا۔“

راجاں ہنس کر غصے ہوئی: ”کالے دھاگے کی جگہ سونے کی زنجیر پہن رکھی ہے اس نے۔ تعویذ اب اس نے اس زنجیر میں سونے کی ڈبیاں ڈال کر پہن رکھا ہے۔“

”انار دیا ہو گا۔“ کمال نے راجاں کو چھیڑا: ”اب وہ کوئی پیڑ تو ہے نہیں۔ ایسا صاحب بہادر بنا ہوا ہے۔ تعویذ کہاں پہننا پسند کرے گا۔“

راجاں کے کسی جواب سے پہلے ہی برابر والی کو ٹھہری سے ٹکریوں کے ہنسنے کی آواز آئی۔ کمال بولا: ”تو وہ مر جاناں بھی جاگ اٹھی ہیں اتنی سویرے۔“

”ان کا بھائی آ رہا ہے۔ بہت خوش ہیں۔ صبح اٹھ کر سارے گھر کی پھر سے صفائی کریں گی۔ شاداں نے تو کہا تھا اماں سویرے سویرے جگادینا۔ وہ خود ہی اٹھ گئیں۔“

”صفائی تو اتنے دنوں سے کر رہی ہوں۔ اب کیا کرنا ہے۔ پرلا کرہ جمائے کے لیے ٹھیک ٹھاک کر دیا ہے۔ یہ اچھا ہی کیا۔“

”اگ کرہ تو اے چلہیٹے ہی۔ اس کے ملنے ملانے والے دوست یا راتے جانتے ہی رہیں گے۔“

”اس دفعہ شرم میں گھر خریدیں گے۔“

”خریدے گا کہاں۔ وہ تو خود اپنی مرضی کا بنوائے گا۔ بہنوں کے خطوں میں وہ لکھتا رہتا ہے۔“

”بیوی نے ہے اس کے بیوی بچوں نے۔ بنائے گا اپنی مرضی ہی کا۔“

”ہوں گے نا کبھی تو۔ اے سنو۔“

”کیا؟“

”اس دفعہ جمائے کی منگنی بھی کرنا ہے۔ اس نے زہراں کو چٹھی لکھی تھی کہ بڑی خوبصورت ہیرے کے نیگینے والی انگوٹھی لائے گا۔“

”اچھا؟“

”ہاں۔“

”ایسی باتیں مجھے تو بتاتے نہیں تم لوگ۔“

”بتاتے تو ہیں۔ تم سن کر بھول جاتے ہو۔“

”انگوٹھی کا ذکر تو کیا تھا تم نے۔ یہ کب کب کا تھا کہ ہیرے کے نیگینے والی ہے اور یہ بھی نہیں بتایا کہ کس کے لیے لائے گا انگوٹھی۔ میں تو سمجھا تھا کہ تمہارے یا زہراں کے لیے۔“

”زہراں کے لیے پچھلی دفعہ پانچ تو لے سونا نہیں لایا تھا۔ ایک لاکھ اور بٹلے بھی اسی کے لیے تھے۔ یہ انگوٹھی۔ تو وہ۔ بلو۔ کو جانتے ہونا۔“

”بلو؟“

”لے اپنی آپا عاشاں کی چھوٹی بیٹی۔“

”ہوں تو یہ بات ہے۔“

”جمالا اپنے خطوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بلو ہے بھی تو بہت پیاری۔ بالکل مانوسی ہے۔ بھولی بھالی

رج کے سونہی۔ میں بھی اسے ہی ہو بناؤں گی۔“

”آپا عاشاں سے بات ہوئی کبھی؟“

”کروں گی۔ دیے انہیں اعتراض بھی کیا ہو گا۔ اتنا سونہا۔ نیک شریف اور اتنی کمائی کرنے والا لڑکا کہاں ملے گا انہیں۔ لوگوں کی نظریں تو جمائے پر لگی ہیں۔ دو چار رشتے تو ابھی چکے ہیں۔ لیکن

میں بلو کے سوا کسی کو۔۔۔۔۔“

”وہ تو ساتھ تھوڑا ہی ہوں گی۔ بند میں آئیں گی۔ وہیں کے پہنچنے میں شاید مہینہ دو گنگ جائیں۔“  
”اچھا۔“

”تو اور کیا ساری چیزیں ہوائی جہاز میں رکھ کر لانا؟“

”اچھا میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔ اب تو پوچھت رہی ہے۔ اٹھ کے ہاتھ منہ دھو لو۔“

راجا نے چادر کی بکلی ماری۔ پاؤں میں نائیلون کے چپکلی پہنے اور بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ چائے بنانے کے لیے اس کو باہر جانا تھا۔ صحن کے دوسرے سرے پر بیچی چھت والا کچا پکا برآمدہ سا تھا۔ وہیں ایک کونے میں مٹی کے تیل کا جولا اور کھانے پینے کے برتن رکھے رہتے تھے۔ چائے کی پڑیا، چینی کا ڈبا بھی وہیں تھا۔ دودھ کی دیگی وہ کمرے میں رات کو لے آتی تھی باہر بیٹوں کو تو لا ڈرتھا۔ بیردنی چھوٹی سی مٹی کی دیوار سے اندر کو ڈالتے تھے۔

راجا اور کما کے کا تعلق کشمیری خاندان سے تھا۔ ابھی تک خون میں ملاوٹ نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے سارا خاندان گویا چٹا اور خوبصورت تھا۔ جانے کتنی صدیوں سے وہ یہاں رہ رہے تھے۔ کنبے کے بہت سے لوگ اور بھی تھے جو یہیں رہتے تھے۔ برسوں سے ایک خاندان کی طرح رہتے چلے آ رہے تھے۔ یہاں ان لوگوں کی زمینداری نہیں تھی۔ کچے پکے مکان ہی اپنے تھے جس کو جو کام ملتا تھا کر لیتا تھا۔ کچھ لوگ نو زمینداروں کے مزارعے بن گئے تھے۔ کچھ محنت مزدوری کرتے تھے۔ راج گبری کا کام اپنایا تھا۔ کچھ لوگ روزگار کی تلاش میں شہروں کا رخ کر چکے تھے کہ گاؤں میں اب پوری نہ پڑتی تھی۔ پڑھے لکھے نوجوان تو کچھ تو کیاں بھی کر رہے تھے۔ شہر یہاں سے زیادہ ددر نہیں تھا۔ اس لیے دواڑھائی مبل سائیکلوں پر آنا جانا مشکل نہ تھا اور جب سے سوز و کدیاں چلنے لگی تھیں۔ ان لوگوں کو شہر آنے جلنے میں بڑی سہولت ہو گئی تھی۔ اب تو ٹرکے چھوڑ کر کیاں بھی گاؤں کے ٹل سکول سے آٹھ چاعتیں پڑھ کر شہر کے اسکولوں میں داخلہ لینے لگی تھیں جو ہدیوں کی بیٹیاں تو کالجوں میں بھی پڑھ رہی تھیں۔

لکنا گاؤں کے دوسرے ہم عمر لوگوں کی طرح محنت مزدوری کے لیے اپنا اور بال بچوں کا پیٹ پانا تھا۔ پہلے گاؤں ہی میں راج گیری کی بھر شہر جانے لگا۔ وہاں کبھی ایک کام کیا کبھی دوسرا۔ اتنا کام لیتا کہ بال بچوں

”اچھا اچھا۔ جو جی چاہے کرنا۔ اب ذرا اٹھ جاؤ ایک پیالی چائے تو بنا لاؤ۔ بہت دیر سے جاگ رہا ہوں۔ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔“

”وہیں کیا چلانے لگے ہو۔ چائے کے رسیا بن گئے ہو۔“ راجاں اٹھتے ہوئے بولی۔

”وہیں چلانے کا ثواب مزہ آئے گا نہی نکور وگین اور اوپر سے اپنی۔ ذاتی۔ یہ سارے دن کی ڈیوٹی تو نہ ہوگی۔ پرانی چیز پرانی ہوتی ہے۔“

”بیٹے نے تمہاری یہ خواہش بھی پوری کر دی۔“

”بیٹا ہے۔ اپنا۔ پیارا دلارا۔ او جگ جگ سیے۔“

”اچھا میں اب اٹھ جاؤ تم بھی۔ میں چائے لاتی ہوں۔ آج تو تم نے شہر جلدی جانا ہوگا۔“

”نہیں، وقت ہی یہ جاؤں گا۔“

”جاملے کو اپنی وگین میں نہیں لاؤ گے؟“

”لاؤں گا۔ مالک سے میں نے بات کر لی ہے۔ صبح کا پھیرالے کر جاؤں گا۔ واپسی پر اپنے جملے

ہی کو تو لانا ہے۔ ویسے اس کی فلائٹ کا پکا پتا نہیں ہے۔“

”کراچی تو کل آگیا ہوگا۔ اب آج جس جہاز سے جگ ملی آجائے گا۔ ہوائی اڈے پر انتظار تو کریگا ہی۔“

”ہاں کرے گا۔ پہلے صبح کے جہاز سے آئے۔ چاہے دس بجے کے۔“

”ایک جہاز صبح چھ بجے آتا ہے نا۔“

”ہاں میں نے سب پتا کر لیا ہوا ہے۔ دس بجے سے پہلے میں ہوائی اڈے پر پہنچ جاؤں گا۔ تو ٹکڑ

رہ کر تیرے جملے کو گاؤں تک آنے میں کوئی تکلیف نہ ہوگی۔“

”سامان بھی تو ہو گا ساتھ۔“

”ہاں تین سال میں چھوٹا موٹا سامان تو جمع کیا ہی ہوگا۔ دد تین سوٹ کیں تو ہوں گے ہی۔ میرے لیے

کبل بھی لایا ہوگا۔ اور۔“

”ٹی وی۔ فریج اور دوسری بڑی چیزیں۔“



”ہاں آبا۔ گاؤں کے جتنے ہندے بھی باہر گئے ہوئے ہیں۔ دیکھا ہے ان کی حالت کس طرح بدل گئی ہے۔ مزاروں روپے پھینے میں کھاتے ہیں۔ کیا ٹھاٹھاٹ ہیں ان کے؟“

کمائے کی بات دل کو لگی۔ لیکن پھر بھی بولا۔ ”تو بارہ جماعتیں پاس کر لے پہلے پھر جانا باہر۔“

”جماعتیں پاس کرنے سے باہر کچھ زیادہ نہیں ملتا۔“

”تو پھر؟“

”آبا باہر جانے کے لیے کوئی ہنر دیکھنا چاہیے۔ کوئی ایسا کورس کرنا چاہیے۔ جو دہاں کام آئے“

”تو کیا سوچا ہے تو نے؟“

”میرا ایک دوست بھی یہی سوچ رہا ہے۔ اس نے پتاکر دیا ہے باہر میٹرک کینڈیڈایٹ یا انٹر کینڈیڈایٹنگ کا جس نے کورس کیا ہو۔ بہت اچھی نوکری ملتی ہے اسے۔“

”تو پھر؟“

”میں بھی انٹر کینڈیڈایٹنگ کا کورس کر لوں گا۔“

”تیری مرضی؟“

”ٹھیک ہے۔“

”لیکن بیٹے تو بارہویں جماعت میں پہنچ گیا ہے۔ میرا تو دل ہے کہ تو امتحان بھی دے دے ساتھ ساتھ اور کورس بھی کرے۔“

جیالا، ماں باپ کا بڑا فرماں بردار بیٹا تھا۔ راجاں کی بھی یہی مرضی تھی کہ وہ کم از کم بارہ جماعتیں پاس کر لے۔ پڑھی لکھی وہ خود بھی نہیں تھی لیکن پڑھائی لکھائی کی اہمیت جانتی تھی۔ جمال نے ماں باپ کی بات مان لی۔ امتحان کی تیاری بھی کی اور انٹر کینڈیڈایٹنگ کا کورس بھی کرنے لگا۔

میٹیاں کسی نئی چیز، کسی نئے کپڑے کی فرمائش کرتیں تو راجاں کبھی پیار سے اور کبھی ڈانٹ کر ان کو ہچکچا دیتی۔

”تمہیں پتا نہیں جمال کے لیے کتنا پیسہ چاہیے۔ اسے باہر بھیجنا ہے۔ اس کے لیے تو ابھی چار پیسے بھی

کا پیٹ بھر لیتا۔ گاؤں کی رہائش سادہ ہوتی تھی۔ تصنع بناوٹ ابھی دہاں تک نہیں پہنچتی تھی۔ نہ ہی معیار زندگی بلند کرنے کا خیال آیا تھا۔ گزر بسر ہوتا تھا لیکن جب اوپر تلے میں بیٹیاں آگئیں اور جمال نے اسکول جانا شروع کیا تو کوئی کم پڑنے لگی۔ کمالا خود دو تین جماعتیں ہی پڑھ سکتا تھا لیکن اسے شوق تھا کہ اپنے ایک اکلوتے بیٹے کو خوب پڑھائے۔ پڑھ لکھ کر وہ بڑا آدمی بنے۔ شہری بالوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی خواہش بڑی تیز ہوتی جا رہی تھی۔

جن دنوں جمال نے کو اس نے شہر کے ہائی اسکول میں داخل کر دیا، انہی دنوں اس نے خود ڈرائیونگ سیکھ لی۔ اس نے ایک برنس مین کے ہاں گاڑی چلانے کی نوکری کر لی۔ پھر نوکریاں بھی بدلتا رہا۔ کبھی کبھی ڈرائیونگ کی کبھی کبھی گزر بسر کے لیے پیسے کما ہی لیتا تھا۔

جمال نے دس جماعتیں پاس کر لیں۔ تو کمائے نے اسے کالج میں داخل کر دیا۔ جیالا ذہین نہیں تھا۔ بس واجبی واجبی پوزیشن لے کر ہر سال پاس ہو جاتا تھا۔ کالج میں داخلہ لینے کی اسے قطعاً خواہش نہ تھی۔

”کیا کروں گا آبا اتنا پڑھ کر؟“ وہ باپ سے کہتا۔

”میرا خواب پورا کر سہے گا بیٹے۔“

”یعنی بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا؟“

”تو اور۔“

”نہیں آبا۔“

”تو پھر کیا کرنا ہے۔ میں جراتی محنت سے پیسہ کما کر تجھے پر خرچ کر رہا ہوں۔ اس کا کچھ نہیں بنے گا۔“

”آبا، بی اے، ایم اے کر کے کون سی بڑی نوکری مل جائے گی مجھے۔ جتنی تنخواہ ملے گی نا، اتنا تو تو گاڑی سوزو کی چلا کے کما لیتا ہے۔“

”تو کیا تو بھی سوزو کی چلا کے گا کر اے کی؟“

”نہیں آبا۔ میں سوچ رہا ہوں، باہر چلا جاؤں۔“

”باہر؟“

زہرا، چھوڑو شادو تو خوشی دے جیسے پاگل ہو گئیں۔

”بھائی ڈھیر سارے پیسے ہر مہینے بھیجا کرے گا“

”جاپانی ریشمی سوٹ ہم بھی پہنا کریں گے۔ جیسے حنیف کی بہنیں پہنتی ہیں“

”میں تو اپنے لیے کلائی کی گھڑی منگواؤں گی سب سے پہلے“

”چل ہٹ سب سے پہلے بھائی کو کہیں گے کیسیٹوں والا ریڈیو بھیجے۔ خوب کالے سنائیں گے“

”ٹی وی، فریج نہیں چاہیے؟“

”وہ تو اماں کے کھاتے میں آئے گا“

”ہائے اللہ کتنا مزہ آئے گا۔ ہم بھی امیر ہو جائیں گے“

”گاؤں میں تو رہنا ہی نہیں ہم نے۔ شہر میں رہیں گے۔ خوب ٹھاٹ باٹ سے“

”پگلی۔ ٹھاٹ باٹ گاؤں میں زیادہ ہوں گے۔ شہر میں تو سارے ہی لوگوں کے ٹھاٹ باٹ

ہو سکتے ہیں۔ یہاں مزہ آئے گا ٹھاٹ باٹ سے رہنے کا۔ لوگ ہماری چیزیں تجسس اور شوق سے

دیکھنے لگائیں گے۔ ارد گرد عامرے ہی لوگ تو رہتے ہیں“

”نہ بھئی۔ ہم تو شہر میں رہیں گے۔ بھائی بھی شہر ہی میں رہنا چاہتا ہے۔ اسے تو گاؤں پسند

ہی نہیں شروع سے“

”ہاں۔ اسے تو شہر ہی پسند ہے“

”شہر میں بڑے مزے ہیں۔ گاؤں میں کیا رکھا ہے۔ گاؤں میں تو مزہ زمینوں والوں کا ہے

پتا نہیں ہمارے پردادا کتو دادا گاؤں ہی میں کیوں آئے تھے کسی شہر کا رخ کیوں نہ کیا۔ گاؤں ہی

میں آئے تھے تو کوئی مریجے دو مریجے اراضی بھی قبضے میں کی ہوتی“

”پرانی باتیں چھوڑو۔ اب ہمارا بھائی باہر جا رہا ہے۔ ساری کسریں نکل جائیں گی“

”وہ حمید ہے نا۔ تو بہ تو بہ دو سال پہلے کیا حال تھا ان کا۔ کھانے کو روٹی نہ تھی۔ سوسٹا لیا

لگی ہوئی تھیں کپڑوں میں“

جمع نہیں ہوئے۔ ابھی تو اس کی پڑھائی پر ہی غور اٹھ رہا ہے۔ تم ذرا حوصلہ اور صبر سے کام لو۔ ایک بار باہر  
چلا جائے۔ پھر تمہارے لیے یہ بھی لگا چیزیں۔ عیش کرو گی۔ اب چپ چاپ دیکھتی رہو۔ زیادہ گزر گئی ہے  
نصوڑی رہ گئی ہے۔ اللہ سن لے گا ہماری فکر نہ کرو۔ ابھی گزارا کرو گزارا“

زہرا سمجھ دار تھی۔ لیکن چھوڑو شادو بڑبڑ کرتی رہتیں۔ وہ دونوں اسکول پڑھتی تھیں۔ دوسری  
لڑکیوں کی دیکھا دیکھی۔ اچھے اچھے کپڑوں کا انہیں بھی شوق تھا۔ رنگ برنگے کپڑے، چوڑیاں اور سنہری  
پھندونوں والے پرلاندے انہیں بھی اچھے لگتے تھے۔ لیکن جب بھی وہ فرمائش کرتیں، اماں انہیں جالے  
کی باہر کی کمائی پر ٹال دیتیں۔

جمال کو باہر بھیجنے کے لیے کمالے نے ہٹے پاڑ بیٹے۔ دو ایک بوگس کمپنیوں میں پیسہ بھی  
پھنسا یا۔ خون پسینے کی کمائی برباد ہوئی۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ راجاں نے بھی دھری چوڑی  
پونجی بیٹے پر نہچا اور کرنے میں دریغ نہیں کیا۔ سونے کے ہالے اور چاندی کے کڑے بھی تھے اس  
کے پاس، دینا خریدنے سکے لیے اس بسنے یہ بھی بیچ ڈالے۔

گاؤں کے غمزدار کا بیٹا حنیف بھی مستط میں تھا۔ اس دفعہ وہ اپنے ساتھ کچھ دینے بھی  
لایا تو جمال کا کام بن گیا۔ منہ مانگی قیمت دے کر اس نے ویزا حاصل کر لیا۔

دینا حاصل کر کے سب کو خوشی بھی ہوئی اور کوفت بھی۔

”شکر کر شکر“ کمالے نے اسے سمجھایا۔ اپنے غمزدار کا بیٹا تھا۔ دینا مل گیا۔ ورنہ منہ تکتے رہتے لوگ  
کا۔ کمپنی والوں کی ٹھگ بازی تو دیکھ ہی چکی ہے تو“

”ہاں اماں۔ پیسے تو دینے پڑتے ہیں۔ کچھ زیادہ ہی لے لیے ہیں حنیف نے۔ لیکن میرے لیے  
سہولت ہو گئی ہے۔ پریس میں پہلی بار جاؤں گا۔ حنیف ہی رہبری کرے گا میری۔ بلکہ وہ تو کہہ  
رہا ہے کہ جب تک میرا صحیح ٹھکانا نہیں بن جائے گا۔ وہ مجھے اپنے پاس ہی رکھے گا اور نوکری بھی  
خوب تنگڑی تنخواہ والی دلائے گا“

”اچھا۔ راجاں کی باجپیں کھل گئیں۔

سے ہر سال اگر ملا کروں۔ لیکن میں نے بھی ہی سوچا ہے کہ ہزاروں روپے آنے جانے میں جو خرچ ہو جاتا ہے بچایا جائے۔ کیونکہ ہمیں پیسے کی ضرورت ہے۔ مجھے سب ضرورتوں کا بخوبی احساس ہے۔  
راجاں کا دل بیٹے کو دیکھنے کے لیے تڑپتا تھا۔ ماں تھی نا۔ ایک سال جب چھٹی نہ ملی تو دوسرے سال اس نے زہرا سے خط لکھوایا۔ خیر خیریت کے بعد لکھوایا۔ بیٹے اس دفعہ ضرور آکر مل جاؤ۔ کمانے کو عمر پڑی ہے۔ ضرورتیں پوری ہوتی ہیں گی۔ بس تم چھٹی لے کر آجاؤ۔  
جمال کا دل بھی پھلتا تھا لیکن اس نے ماں کو وصلہ دلایا بہت بندھائی۔ بہت پیار سے خط لکھا۔

”اماں، جی تو میرا بھی چاہتا ہے۔ پردیس میں گھر ضرورت سے زیادہ ہی یاد آتا ہے، لیکن جمہوریوں کا بھی احساس ہے، مزدوروں کو بھی جانتا ہوں۔ میری نہیں بنیں ہیں۔ ان کو مینا ہوتا ہے۔ اس کے لیے ڈھیر سلا پیسے چاہیئے۔ پھر تمہیں یہ بھی پتا ہے کہ میری خواہش ہے شہر میں گھر بنانے کی۔ اس کے لیے بھی جانتی ہو کتنا پیسہ چاہیئے، ہیں یہاں بالکل فضول خرچی نہیں کرتا، بہت سنبھل کر خرچ کر کے پیسے بچاؤں گا۔ ہاٹھ گئے سال آؤں گا تو بہت سارا پیسہ لاؤں گا۔ تیری سب میٹھیوں کے بیاہ کا خرچہ نکال کر زمین بھی خرید لوں گا۔ بس تو دعا کر، یہ وقت خیریت سے گزرتا ہے۔ ہاں تھوڑی بہت چیزیں تو میں ہر آنے جانے والے کے ہاتھ بھیج دیتا ہوں۔ اگلی بار آیا تو آتا کے لیے دینگے بھی لے کر آؤں گا۔ یہ میری دلی خواہش ہے کہ آبانے اگر کام کرنا چاہے تو اپنی دینگے چلائے بہت دیر چلائی اس نے کرائے کی دینگے۔“

جمال نے ماں اور بہنوں کی تسلی کے لیے ایسے ایسے کئی خط لکھے۔  
یوں تیسرا سال بھی گزر گیا۔

اور اب آج وہ آ رہا تھا۔ پورے تین سال بعد۔ ڈھیر دن چیزیں لے کر۔ لاکھوں روپے لیکر ان چیزوں کی سب کو خوشی تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ کمالا، راجاں اور تینوں بہنیں جمال کی صورت دیکھنے کو تڑپ رہی تھیں۔ ماں و دولت ثانوی چیز لگ رہا تھا۔ خوشی انہیں صرف اور صرف جمال

”دو بیٹے باہر گئے ہوئے ہیں۔“

”حلیہ ہی بدل گیا ہے۔“

”بھئی خدا کی دین ہے۔ ہمارا بھی حلیہ بدل جائے گا۔“

”لو اب ہم ایسے ہی فقیر تو نہیں ہیں۔“

”پھر بھی۔ دیکھنا سال دو سال میں ہمارا گھر بھی بھر جائے گا۔“

”بالکل۔ بالکل۔“

جمال حنیف کے ساتھ باہر چلا گیا۔ کمالا اسے کراچی تک چھوڑنے گیا۔ راجاں نے ہزاروں دعاؤں کے سائے میں اسے رخصت کیا۔ بچھڑتے سے سب گھر والوں اور خود جمالے کا جی بھی ٹھوڑا ہو رہا تھا لیکن مستقبل کی چکا چوند اور خوشیاں دل بڑھا رہی تھیں۔ اماں سے، بہنوں سے اور آپا سے خط لکھنے کا وعدہ کر کے ہر مہینے باقاعدگی سے پیسے بھیجنے کا کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔  
وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ دن بھر ”اور مہینے گزرتے چلے گئے۔ جمال باقاعدگی سے خط اور معقول رقم گھر بھیجتے لگا۔ ایک سال بعد وہ ایک ماہ کی چھٹی پر گھر آیا تو ڈھیروں چیزیں لے کر آیا۔  
ماں باپ خوشی سے چھوٹے زسمائے۔ بہنوں کی خوشیوں کا ٹھکانا نہیں تھا۔ جمال ہر ایک کے لیے قیمتی کپڑے، گھڑیاں، جوتے، سوٹیں لایا تھا۔ پانچ تو لے سونا، بندوں اور لاکٹ کے علاوہ زہرا کے لیے لایا تھا۔ زہرا کا رشتہ بھی اس نے اس دفعہ طے کر دیا تھا۔ شادی اگلی دفعہ اسے پر ڈال دی تھی۔

اس دفعہ وہ تین سال بعد آ رہا تھا۔ ایک دفعہ تو چھٹی نہ ملی تھی۔ دوسری دفعہ اس نے خود ہی ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

کمالے نے بھی می لکھا تھا ”بار بار آنے سے خواہ مخواہ کرائے پر ہزاروں روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہ بچت کر دو تو کام ہی آئے گی۔“

جمال نے بھی بچت ہی کا سوچا تھا۔ اس نے بھی ہی لکھا ”آبا، جی تو کرتا ہے آپ لوگوں

”تو۔ میرے خیال میں ایئر پورٹ پر ہی میرا انتظار کرے گا۔“  
 ”تم نے اسے لکھا تھا۔“  
 ”نہیں تو۔“

”پھر تو چاہیے تھا سویرے سویرے ہی ایئر پورٹ پہنچ جاتے۔ کیا خبر وہ صبح کے جہاز سے آجائے۔“

”کوئی بات نہیں۔ آج بھی گیا تو وہیں رہے گا۔ آجی سویرے سویرے یہاں تھوڑے ہی آنکے گا۔ میں دس بجے سے پہلے ہی پہنچ جاؤں گا۔ دوپہر کے کھانے تک اسے لے آؤں گا۔ ہاں آج ذرا مزے مزے کی چیزیں پکانا۔“

”شور بے دلی مرغی اور پیٹے چاول میرے بیٹے کو بہت اچھے لگتے تھے۔ ذرا ہلکیر بھی بنائی گی۔“  
 ”واہ وا۔ پھر تو ہمارے بھی مزے ہوں گے۔ بیٹے کی وجہ سے ہمیں بھی کچھ کھانے پینے کو ملے گا۔“

”آئے ہائے۔ روز تو بھوکے رہتے ہونا۔ کبھی مرغی چاول نہیں کھاتے۔ کبھی نہیں کچھ کبھی۔“  
 راجا نے تمسخر سے کہا تو کمالا چائے کا آخری گھونٹ بھر کر پیالہ واپس کرتے ہوئے بولا۔  
 تمہیں چھٹی رہا ہوں بھانگوان۔ بیٹے کے آنے کی خوشی میں جی کرتا ہے تجھے چھٹی تا ہی جاؤں؟  
 ”شوئے ہو رہے ہو۔“ وہ مسکرائی۔

”خوشی بچائی نہیں جا رہی نا۔ اپنا جلا آرہا ہے۔ اپنا بیٹا۔ سچ سچ کموں۔ جی میرا بھی نہیں چاہتا۔ کراب وہ پردیس جائے۔ صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔ تو تو اپنی اداسی کا کھل کر اظہار کر لیتی ہے نا۔ میں نے تو کبھی ایسا بھی نہیں کیا۔ تمہیں حوصلہ دلانے ہی کو یوں ظاہر کرتا رہا کہ جیسے مجھے اس سے بچھڑنے کا کوئی غم کوئی فکر نہیں۔“

راجا نے اک نگاہ کما پر ڈالی اور پھر گری سانس لے کر بولی۔ ”تو نے کبھی اظہار نہیں کیا تو کیا میں سمجھتی نہیں کہ مجھے جلا کتنا یاد آتا ہے۔ تیرے بیٹے میں اس کے لیے پیار کس طرح جھلکتا

کے آنے کی تھی۔ جلال جیسے دیکھے تین سال ہو گئے تھے۔ جس سے باتیں کیے اتنا عرصہ بیت گیا تھا جسے سینے سے لگائے اتنی مدت ہو گئی تھی۔

کمالا اور راجا تو خاص طور پر جاملے کو دیکھنے اور اسے لگا کر پیار کرنے کو تڑپ رہے تھے۔ لڑ لڑ گراں گزر رہا تھا۔ اسی لیے تو رات ٹھیک سے دونوں ہی سو نہ سکے تھے۔ اور معمول سے کہیں پہلے جاگ گئے تھے۔ جب سے جاگے تھے، جاملے ہی کی باتیں کر رہے تھے۔ جاملے ہی کی باتیں کر رہے تھے۔ کمالے نے صحن کے نل تلے ہاتھ منہ دھویا۔

راجا چائے بنانے لگی۔  
 پیالہ چائے سے بھر کر وہ اٹھی۔ کمالا اندر چلا گیا تھا۔ وہ چائے لیے اندر آگئی۔  
 ”نو“ اس نے پیالہ کمالے کو پکڑ لیا۔

ایک گھونٹ بھرتے ہوئے کمالا بولا۔ ”جمالا چائے بھی ضرور لائے گا بھلی دفعہ لایا تھا نا اس چائے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ تو بھی تو حاتم طائی کی بیٹی بن جاتی ہے۔ چائے بھی کوئی بانٹنے کی چیز تھی۔ دو پکیٹ بھی ذرکھے۔ سارے بجائی ہنوں میں بانٹ دیے۔“  
 راجا مسکرا کر بولی۔ ”اس دفعہ چھپا کے رکھ لینا تم ہی۔“  
 ”تو اور کیا میں تجھے بانٹنے دوں گا۔“

”اچھا بھئی اچھا۔“

”سگریٹ اور چائے دونوں کو کوئی ہاتھ تو لگا کر دیکھے۔ یہ دونوں چیزیں میرا بیٹا صرف میرے لیے لاتے گا۔“

راجا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ ”اچھا جی تمہارے بیٹے ہی سہی۔ یہ تو جب چیزیں لگی دیکھیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کتنے بچے جانا ہے آج۔“

”بچتے بچے روز جاتا ہوں۔“

”اور جو جمال صبح کے ہوائی جہاز سے پہنچ گیا ہوا تو۔“

”ہاں“

”تمہاری یہ سوئیڈر اب پرانی ہو گئی ہے“

”تو کیا ہوا۔ آج ہی نئی آجائے گی“

”ہاں بھائی ضرور ملے کے آئے گا۔“

”میں نے اسے چمڑے والی جیکٹ لانے کے لیے لکھا ہے۔ سوئیڈر کا تین سالوں میں یہ

حلیہ نکل آیا ہے۔ جیکٹ کافی سال چلتی ہے۔ بڑھیا سی جیکٹ لائے گا میرا بیٹا۔ دیکھنا کیسی سبے  
گی مجھ پر۔“

راجا ہنس کر بولی ”نیا جوڑا لائے گا نئی جیکٹ لائے گا۔ دولہا بن جائے گا تیرا بابا چھو“

”تو کیوں جلتی ہے۔ تیرے لیے تو مجھ سے زیادہ چیزیں آئیں گی۔ کیا خبر سونے کی چوڑیاں

کلائیوں میں بھر دے۔ ریشمی بوڑے، بوسکی کی فینے والی چادر۔“

”اچھا اچھا اب بس بھی کرو۔ ناشا کرو ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ چھوٹے رکھ دے چوک پر پر چیزیں“

”اچھا اماں“ چھوٹے پر لٹھے والا اچھا پر اور انڈرے والی پلڈٹ باپ کے سامنے رکھ دی۔

کمالے نے ناشا کیا۔ چائے کے دو کپ پیے۔ پھر صافی سے ہاتھ پونچھ کر کلائی پر بندھی

گھڑی پر نگاہ ڈالی۔

”ابا“ چھوٹو مسکرا کر بولی ”یہ گھڑی بھی تو پرانی ہو گئی ہے۔ آپ کی نئی گھڑی بھی آرہی ہے نا؟“

”نہیں سبھی۔ گھڑی سی اچھی ہے۔ تین سال تو ہوئے ہیں گل۔ جانتی ہو کتنی قیمتی ہے یہ

یہ تو تیس سال بھی خراب ہونے والی نہیں۔ جمائے کو میں نے گھڑی لانے کے لیے اسی لیے تو لکھا ہی

نہیں۔ بے بھی آیا تو زہرا کی شادی....“

”اب اٹھ بھی چکو؟“ راجا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تم نے شہر پہنچنا ہے

وہاں سے وگن کا پھیرا۔“

”سب جانتا ہوں۔ تو کیوں پریشان ہو رہی ہے۔“

ہے۔ میں سب کچھ جانتی ہوں سمجھتی ہوں۔ جب سے اس کے آنے کا خط آیا ہے میری خوشی چھپنے  
نہیں چھپتی۔ اس دن سے زونجہ پر چڑچڑاپن مسلط ہوا ہے۔ نہ ہی تو لڑا جھگڑا ہے۔ تیری نوٹی  
بھلا مجھ سے چھپی ہے“

کمالے نے مسکرا کر راجا کو دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”یہ اولاد بھی کیا چیز ہوتی ہے  
راجا۔ پاس ہوں تو پتا نہیں چلتا کہ یہ ہمیں کتنے پیارے کتنے عزیز ہیں۔ دور چلے جائیں تو  
احساں ہوتا ہے کہ یہ اپنا ہی گوشت پوست اپنا ہی خون ہیں۔ اب جمائے ہی کو دیکھو۔ یہاں  
تھا۔ تو کبھی اتنا پیار نہ کیا تھا اس پر۔ سب بات بات پر ڈانٹ ڈپٹ ہی کھاتا تھا۔ لیکن  
دور چلا گیا ہے۔ توجہ کرتا ہے، ڈر کر آجائے بیٹے سے پیٹ جائے۔ منہ سرچو متا ہی چلا جاؤ  
اس کا۔“

راجا مسکرا کر بولی ”بس کرو اب۔ تیار ہو جاؤ۔ شہر جاتے بھی وقت لگے گا۔ آج  
تم پھیرا کچھ جلدی ہی ملے جاتے تو اچھا تھا میرے بیٹے کو انتظار کی زحمت نہ اٹھانا پڑے“  
”پھیرا تو ذلت سے پہلے نہیں لے جاسکتا“ کمالا بولا۔ ”اسی لیے تو جلدی شہر جانے کی ضرورت  
نہیں۔ ہاں اسی پر پورٹ پہنچنے کی جلدی ضرور کروں گا۔“

”آئے ہائے وگن کہیں تیز نہ چلانا۔“ راجا نے کہا تو کمالا مسکرا کر بولا۔

”چل جا کے ناشا بنا۔ میں تیار ہوتا ہوں۔“

راجا کمرے سے باہر آگئی۔ تینوں بیٹیاں اٹھ آئی تھیں۔ زہرا جمائے کے کمرے کی  
بھانڈ پونچھ کر رہی تھی چھوٹا چار خانی کھیس چار پائی پر ڈال رہی تھی اور شادو کچے صحن میں لگے  
گلاب کے پودوں سے نازہ پھول تار کر گلاس میں سجا رہی تھی۔ تینوں بنیں مسلسل بولے جارہی تھیں۔  
راجا ناشا تیار کرنے لگی۔ پراٹھا بنایا۔ انڈا تالا اور تیز سی چائے بنائی۔ کمالا تیار ہو کر اوپر

kutubistan.blogspot.com

ہی آگیا۔

”ابا“ وہ بولی۔

”اور جو جمال صبح کے جہاز سے اُگیا ہوا۔ تو وہ ہوائی اڈے پر انتظار میں پریشان نہیں ہو رہا ہوگا۔

”بھئی اب اس کا علاج میرے پاس تو نہیں ہے نا۔ میں چاہے جتنی بھی جلدی چماؤں۔ وگین کا پیرل تو روز کے وقت پر ہی لگے گا۔ پیرلے کر جاؤں گا۔ پھر وہاں سے ایئر پورٹ جاسکوں گا۔ غیر۔ گھبرانے کی تو کوئی بات نہیں۔ جلال تین چار گھنٹے وہیں انتظار کرے گا۔“

”ہمیں اس سے ملنے کی جلدی ہے تو اسے بھی ہوگی۔ پل پل گن گن کر گزار رہا ہوگا۔“  
 کمالا ہنس کر راجا کو دیکھنے لگا۔ کتنی بے تاب تھی وہ بیٹے سے ملنے کو۔ بے تابی خود اسے بھی تھی لیکن اپنے کام اور وقت کا پتا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا۔ تو طلوع آفتاب سے پہلے ہی ایئر پورٹ پر جا پہنچتا۔

کمالا اٹھ کر اندر گیا۔ بٹوایے باہر آیا تو شادو کرے سے نکلتے ہوئے بولی: ابا آج شہر سے مٹھائی اور کیک ضرور لانا۔“

”اچھا پڑے آؤں گا۔ بھائی کی خاطر یہ کرنا نہیں نا۔“

”ہاں ابا جی کرتا ہے۔ ڈھیر ساری چیزیں بھائی کے کھانے پینے کو جمع کر لوں۔“

کمالے نے بٹوایہ جیب میں ڈالا اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے راجا پر نگاہ ڈالی۔  
 ”تو نے تو کچھ نہیں منگوانا شہر سے۔“

”کچھ نہیں۔ تو صرف میرا بیٹا ہے آ۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

کمالا بولا: ”وہ تو لاؤں گا ہی۔“

”جا ہی اب۔“

”جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔“

کمالا گلی میں نکل آیا۔ جان پہچان کی دو تین عورتیں گلی میں مل گئیں۔ جمالے کے آنے کی خبر انہیں بھی مل چکی تھی۔

”جالا آج آرہا ہے؟ ایک نے پوچھا۔

”ہاں اسے ہی لینے جا رہا ہوں۔ اور سونو۔ جلالا نہیں کہا کرو میرے بیٹے کو۔ اس کا نام محمد جمال ہے“  
 عورتیں ایک دوسری کو کُن آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ہنس پڑیں۔ پاس ٹروس کے دو ایک مرد بھی گلی میں جانے ہوئے ملے۔ کمالے نے خوش خوش انہیں بھی بتایا: اپنا جمال آرہا ہے آج۔“

”ہاں سنا تھا۔ کس جہاز سے آرہا ہے؟“ گلی کے ٹکڑے والے مکان میں رہنے والے نھرا لٹنے پوچھا۔  
 ”پکا پتا نہیں۔ صبح کے جہاز سے اُگیا ہے یا دس بجے پہنچے گا۔ میں وگین کا پیرلے کر جا رہا ہوں۔ ادھر ہی سے ایئر پورٹ جاؤں گا۔“

”بڑے دنوں بعد آرہا ہے۔“

”پورے تین سال بعد۔“

”بہت خوش ہو۔“

”کمالا ہمہ بھی خوش تو ہوؤں گا ہی۔ اتنی مدت بعد بیٹا آرہا ہے۔ خوب کمانی کر رہا ہے وہ تو۔“

وہ دونوں باتیں کرتے کرتے کمالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

کمالا شہر پہنچا۔ اڈے پر وگین اپنے نمبر پر کھڑی تھی۔ دو تین سواریاں بھی بیٹھ چکی تھیں۔ سواریاں بھرنے کے لیے ابھی اسے انتظار کرنا تھا۔

آج کمالے کو لاہور پہنچنے کی جتنی جلدی تھی۔ اڈے پر اتنی ہی تاخیر ہو رہی تھی۔ وہ اس تاخیر پر جھلا رہا تھا۔ پریشان بھی تھا۔ دو تین بار میٹجر کے پاس گیا۔

”باوجہ کیا ہے۔ آج وگین کو کیوں روک رکھا ہے؟“

”کچھ مزوری کام ہے۔“

لیکن میں نے لاہور جلدی پہنچنا ہے۔ میرا بیٹا آرہا ہے آج۔ میں نے واپسی کے لیے مالکوں سے وگین کی بھی بات کر لی ہے۔“

دس بچے سے پہلے پہنچنا ہے اتنی تیزی میں کہیں ہم کو اوپر ہی نہ پہنچا دینا۔  
 ”نہیں بزرگو“ کمالے نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ ”اناڑی ڈرامیور نہیں ہوں میں۔“  
 کمالے نے رفتار اور بڑھادی۔ پھر بہ رفتار بڑھتی ہی گئی۔ دو ایک جگہ بریک لگانا پڑی  
 تو پیچھے کی سواریاں اک دھچکے سے اگلی سیٹوں سے جا ٹکرائیں۔ لوگوں نے شور مچایا۔ کمالے نے  
 ہنس کر ان پر نگاہ ڈالی۔

”کچھ نہیں ہوا۔ آپ لوگ تو خواہ مخواہ ہی شور مچا رہے ہیں۔“  
 وہ گاڑی بھگائے لے گیا۔ رفتار بڑھتی گئی۔

”اسے روکو جی۔“  
 ”مار ڈالنے کا ارادہ ہے اس کا۔“  
 ”خطرناک ہے اتنی تیزی۔“  
 ”خدا نواسہ اللہ بھی سکتی ہے ویگن۔“  
 ”آہستہ کرو۔“  
 ”یہ کر کیا رہا ہے۔“  
 ”گاڑی کنٹرول میں نہ رہی تو۔“

سواریاں اس کی خطرناک تیز رفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے شور مچا رہی تھیں لیکن وہ اپنی  
 دھن میں مست تھا۔ پندرہ بیس منٹ جواڑے پر ضائع ہوئے تھے وہ کمالے نے راستے ہی  
 میں برابر کرنا تھا۔ سڑک صاف ستھری اور دروید تھی۔ اس لیے وہ پورے اعتماد سے ویگن  
 اڑائے جا رہا تھا۔ گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ رہا تھا۔ اوور ٹیک کر رہا تھا۔ دو دو اور ٹیک کرتی گاڑیوں  
 کو بھی اس نے غلط سائیڈ سے نکل کر پاس کیا۔ لوگوں کے شور کی اسے پرواہ نہ تھی۔

سیدھی صاف سڑک پر تو شاید اس کی تیز رفتاری خطرناک نہیں تھی لیکن اس نے تو اس  
 سڑک پر بھی گاڑی کی یہی رفتار رکھی جہاں مرمت کی وجہ سے دوسری سڑک بند تھی اور دونوں

”اچھا جی۔ ٹھیک ہے لیکن دس منٹ اور تمہیں یہاں ٹھہرنا ہی ہے۔ پندرہ بیس  
 منٹ لیٹ ہو جاؤ گے نا۔ اس سے کیا فرق پڑے گا۔“

کیا فرق پڑے گا؟ یہ بات بے فہم نہیں جانتا تھا۔ ایک باپ جانتا تھا جس کا بچہ بڑا بڑا  
 پورے تین سال کے بعد آ رہا ہے جوں جوں وقت قریب آ رہا تھا۔ ایک ایک لمحہ گراں ہو رہا تھا  
 ویگن کو جانے کی اجازت ملی۔ کمالے نے سکھ کا سانس لیا۔ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ کنڈیکٹر  
 ابھی باہر ہی تھا کہ اس نے گاڑی چلا دی۔ وہ پک کر دروازے سے ٹکا اور اندر بیٹھی سواریوں  
 نے اسے تھام لیا۔

”بادشاہو“ کنڈیکٹر نے کمالے سے کہا ”کیوں جان لینے لگے تھے میری۔ اپنے بیٹے کی  
 خوشی میں ہمیں پار کرنے لگے تھے۔“

”اس کا بیٹا آ رہا ہے؟“ سواریوں میں سے ایک جاننے والے نے کہا۔  
 ”ہاں جی۔“ کمالا خوشی سے لہکتا ہوا بولا ”پورے تین سال بعد آ رہا ہے۔ دس بچے سے  
 پہلے میں نے ایئر پورٹ پہنچنا ہے۔“  
 ”بھئی اس بیٹے میں گاڑی آہستہ چلاؤ۔“ پیچھے سے اک سواری بولی ”شہر سے نکل کر  
 تیز چلا لینا۔“

”ہاں بادشاہو“ کنڈیکٹر بولا ”بڑا رش ہے یہاں۔“  
 ”چپ چاپ بیٹھے رہو۔“ کمالا اپنی دھن میں بولا ”نیا گاڑی چلانے والا نہیں ہوں  
 روز میں سے جاتا آتا ہوں۔“

”روز اتنی تیزی میں سے نہیں نکالتے بادشاہو۔ آج خاص ہی تیزی ہے رفتار میں۔“  
 ”اوئے بک بک نہیں کر۔“ کمالے نے ہنستے ہوئے کنڈیکٹر کے کوٹاٹا۔ ”کہا نہیں  
 میں نے کہ دس بچے سے پہلے لاہور پہنچنا ہے مجھے۔“

اس نے رفتار اور بڑھادی۔ تو برابر والی سیٹ پر بیٹھا عمر آدمی بولا ”لاہور تو تمہیں

طرف سے ٹریفک آ جا رہی تھی۔ اس سڑک پر تو کنڈیکٹر نے بھی اسے ٹوکا۔ ایک بار سڑک سے ٹکراتے ٹکراتے وہ بال بال بچا۔ دوسری بار ایک آئل ٹینکر سے چنڈفٹ کے فاصلے پر جا بکدستی سے گاڑی موڑی۔ لوگوں کے دل ہول گئے۔ انہوں نے کہا لے کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ دو ایک نے نوٹا لیاں بھی دیں۔

لیکن وہ ان کی سن ہی کب رہا تھا۔ ہوش ہی میں نہیں تھا شاید۔ ہوش میں تو وہ اس وقت آیا۔ جب ایک زوردار دھماکا ہوا۔ ادھ دینگن سامنے سے آئے والی ٹیکسی کے پرچے اڑانی اڑھکنے کھاتی سڑک کے دوسرے سرے پر جا پٹی۔

دھماکا۔ شور مٹا رہا۔ ہیچ وپکار۔ پرچے۔ خون۔ کمالا جانے کیسے اڑھکتی دینگن کے کھل جانے والے دروازے سے دور جاگتا تھا۔ اسے کہنیوں پر معمولی سی خراشیں آئی تھیں۔ ان کی پرواہ کیسے بغیر اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دینگن اور ٹیکسی کو دیکھا۔ لوگ دھماکے کی آواز سن کر دوڑے چلے آ رہے تھے۔ حادثہ بڑا ہولناک تھا۔ ٹیکسی کا آدھا حصہ توبالکل اڑ گیا تھا۔ سڑک خون سے لال ہو رہی تھی۔ پل بھر میں لوگ سینکڑوں کی تعداد میں اکٹھے ہو گئے۔ زخمیوں اور مرنے والوں کو ٹیکسی اور دینگن کے پچکے ہوئے ڈھانچوں سے نکالنے کی کوشش کرنے لگے۔ اک کرام چگ گیا تھا۔ ہیچ وپکار سے فضا دہل رہی تھی۔ دونوں طرف ٹریفک جام ہو گئی تھی۔

جانے کتنے مرے، کتنے زخمی ہوئے اور کتنے بچے تھے۔ حادثے کا ذرے دار کمالا ہی تھا۔ خوف اور دہشت سے کمالے کا رنگ سپید پڑ گیا۔ بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ وہی مجرم تھا۔ وہی مجرم تھا۔ وہی مجرم تھا۔ کمالے کو شور و غل اور ہیچ وپکار سے ہی آواز آتی محسوس ہوئی۔ پکڑے جانے کا خوف دل دہلا گیا۔

فرار؟

خیال آتے ہی وہ جانے وار دات سے بھاگا۔ سر پیٹ دوڑتا چلا گیا۔ سڑک سے اتر کر وہ کچے راستے پر ہولیا۔ بنا پیچھے دیکھے وہ یوں بھاگ رہا تھا۔ جیسے پولیس تعاقب کر رہی ہو۔

جانے کتنا راستہ اس نے طے کیا اور کون کون سے گاؤں سے ہوتا ٹوٹی پھوٹی سڑک کے کنارے اگے سرکنڈوں میں اُن گرا۔

وہ شاید بے سدھ ہو گیا تھا۔ کیونکہ جب اس نے اپنی کہنیوں، گھٹنوں میں درد محسوس کیا اور آنکھ کھولی تو سوز و غروب ہو رہا تھا۔ اس نے ٹانگیں سمیٹیں اور مشکل اپنا وجود گھسیٹتے ہوئے اٹھا۔ سالابن پکے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ کپڑے جھاڑتے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھا، ہولناک حادثے کی دہشت ابھی تک اس پر مسلط تھی۔

سڑک کے دوسری طرف کوئی گاؤں تھا۔ اس میں چلنے کی ہمت تو نہ تھی لیکن اب اسے بھوک پیاس ستا رہی تھی۔ پیٹ کا دوزخ بھرنا تھا۔ اس نے جیب ٹٹولی ہٹا موجود تھا۔ پیسوں کی طرف سے تسلی ہوتے ہی وہ اس گاؤں کی جانب چل پڑا۔ کچھ نہ کچھ کھانے پینے کو مل جاتا تھا۔ بھوک پیاس مٹا کر ہی اس کا ذہن کچھ سوچنے کے قابل ہو سکتا تھا۔

وہ گاؤں میں پہنچا۔ لوگ گھر دلوں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ وہ گاؤں کی کچی گلیوں میں کسی نمزور کو تلاش کرتا بھاگتا گیا۔ راستہ اس نے مسجد میں بسر کرنے کے متعلق سوچ لیا تھا۔ پوچھنے پر اسے ایک شخص نے تنور کا پتا بنا دیا۔

"سیدھے چلے جاؤ۔ دائیں جانب گلی مڑ جائے گی۔ وہاں مائی بسو کا نمزور ہے۔ وال روٹی مل جائیگی۔ کمالے نے اس کا شکریہ ادا کیا اور مائی بسو کے تنور پر پہنچ گیا۔

"پر دوسی ہو، باتونی سی مائی بسو نے گرم گرم روٹی اور دال کا پیالہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر ہی روٹی کھانے لگا۔ پیتل کے گلاس میں مائی بسو کا بیٹا تنھو پانی بھرا لیا۔ مائی بسو باتیں کرتی رہی۔ وہ جوں ہاں میں جواب دیتے ہوئے روٹی کھانے لگا۔

بھوک بہت تھی لیکن وہ چند لمحے ہی زہر مار کر سکا۔ احساس جرم حلق میں پھنسا ڈال رہا تھا۔ جلنے کتنی قیمتی جانوں کا ضیاع اس کے ہاتھوں ہوا تھا۔ کتنے لوگ اس کی وجہ سے مجروح واپاچ ہو گئے تھے۔ اسے بیٹے سے بیٹے کی خوشی میں وہ اور سب کچھ بھول گیا تھا۔



”کیا بات ہے؟“ ٹرک ڈرائیور نے کھڑکی سے گردن نکال کر پوچھا۔  
 ”مجھے اسی طرف جانا ہے۔ اس وقت کوئی سواری نہیں مل رہی“ کمال نے جلدی سے کہا۔  
 ”وہ جو بس گزری ہے؟“  
 ”ڑکی نہیں۔ ہاتھ دیا تھا۔“  
 ”کوئی ڈاکو ڈاکو تو نہیں ہو؟“  
 ”غلاشی لے لو۔ میرے پاس چند روپوں کے سوا کچھ نہیں۔ صرف آبادی تک جانا ہے۔  
 جال سے سواری مل جائے؟“

ڈرائیور نے کڑھکڑ سے کچھ کہا۔ پھر انہوں نے کمال کو ساتھ بٹھا لیا۔  
 ڈرائیور اور کنڈیکٹر اس سے باتیں کرتے رہے لیکن وہ گم حضم بیٹھا رہا۔ اس نے تو گھر پہنچنا  
 تھا، تاکہ اپنے زندہ ہونے کا ثبوت، گھر والوں کو دے کر انہیں کرب و اذیت سے نکال سکے۔ اسے  
 اپنے بیٹے سے ملنے کی بھی لگن تھی۔ تین سالوں بعد وہ آیا تھا۔ اسے ملنے کے لیے وہ تڑپ رہا تھا  
 جمالے سے مل کر اور بیوی بچوں کو تسلی دے کر وہ پھر فرار ہو جائے گا۔ یا اپنے آپ کو پولیس  
 کے حوالے کر دے گا؟ اس بات کا وہ فیصلہ نہیں کر پایا۔ یہ فیصلہ اس نے حالات پر چھوڑ دیا۔  
 وہ ٹرک پر بسوں کے اڈے پر آگیا۔ اپنے گاؤں سے وہ اس وقت ایک سو پچیس میل کے  
 فاصلے پر تھا۔ بالکل مخالف سمت آچکا تھا۔

پھر بھی اس نے بہت نہیں ہاری بس پر بیٹھ گیا۔ دو جگہ بس بدلی اور شہر سے گاؤں تک  
 میل چلتا ہوا سحر کے قریب اپنے گھر کی بیرونی گلی تک پہنچ گیا۔  
 اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ سردی کے باوجود  
 پسینے آ رہے تھے۔ وہ ٹکڑے ٹکڑے آنے لگے بری طرح ہانپ رہا تھا۔  
 ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس نے اپنے گھر کی جانب دیکھا۔ گھر میں شاید رگیں جل رہی ہوں۔  
 دروازہ کھلا تھا اور کچھ لوگ اندر باہر آ جا رہے تھے۔

بیٹے کا خیال آتے ہی اس کے دل میں پیار جاگنے لگا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے وہ حادثے کو بھول کر اپنے  
 جمالے کے بارے میں سوچنے لگا۔  
 وہ گھر پہنچ گیا ہوگا۔  
 لیکن اس کے گھر پہنچتے ہی وگین کے حادثے کی خبر بھی تو پہنچ گئی ہوگی۔  
 وہ سرتاپا لرز گیا۔ ایکدم سے اٹھتے ہوئے اس نے مائی بسو سے روٹی ڈال کے پیسے پوچھے  
 بنا دو روپے بٹوے سے نکال کر اس کی چنگیر میں ڈال دیے اور اس کی کوئی بات سنے بغیر تیز  
 قدم اٹھانے لگی میں چلنے لگا۔

”اس گاؤں کا تو نہیں لگتا؟“ مائی بسو نے اس کے جانے کے بعد اپنے بیٹے سے کہا۔  
 ”ہاں دیکھا تو کبھی نہیں پہلے؟“ نتھو گلاس اٹھانے ہوئے بولا۔  
 تنہا پیر دو ایک مزدور کھانا کھانے آ بیٹھے۔ مائی بسو اور نتھو گلاس کی طرف متوجہ ہو گئے۔  
 کمال راستے کا تعین کیے بغیر قدم اٹھا کر چلا جا رہا تھا۔ دماغ تپ رہا تھا۔ ذہن الجھا ہوا  
 تھا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔  
 گھر پہ یقیناً کھرام چلا ہوگا۔ حادثے کی خبر پھیل چکی ہوگی۔ راجا سید کوئی کر رہی ہوگی۔ بیٹیاں  
 رو رو کر بے حال ہو رہی ہوں گی اور جمالا۔ بے چارے کو آتے ہی آنگر گن صدمہ سننا پڑا ہوگا۔  
 سوچتے سوچتے وہ بڑی سڑک پر آگیا۔ رات اتنی چکی تھی۔ آسمان پر ستارے ٹٹھا رہے تھے  
 دور کناروں پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے۔ ہوا بند تھی پھر بھی فضا کی خشکی بدن میں پکپی  
 پیدا کر رہی تھی۔ سوچوں میں گم وہ چلا جا رہا تھا کہ چنانک پیچھے سے ایک بس آئی مارن کی آواز پر وہ  
 چونکا خیالوں سے نکلا اور۔۔۔ اور ایکدم ہی اس نے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

اس نے بس کو روکنے کے لیے ہاتھ دیا۔

لیکن بس نکل گئی۔

وہ بس کے پیچھے آنے والے ایک ٹرک کو روکنے میں کامیاب ہو گیا۔

”مرکون کیا؟“ کماے نے جواب دیے بغیر پوچھا۔  
 ”ادکم بخنا۔ تیرا بیٹا۔ جمالا۔ تیری دہکین سے اس کی ٹیکسی کچلی گئی۔ وہ صبح کے  
 جہاز سے آگیا تھا۔ خوشی خوشی ٹیکسی میں گھر آ رہا تھا۔ اسی سے تو ملکر ہوئی۔ تو بچ گیا۔ تو بچ گیا اور“  
 ”ما۔ کماے کی آنکھوں میں اندھیرا اچھا گیا۔ وہ لہرایا۔ فیتے اور رمضان نے اسے بازوؤں  
 میں بھر کر تھام لیا۔

رمضان کہہ رہا تھا: ”رات بارہ بجے لاش پوسٹ مارٹم کے بعد پولیس نے یہاں پہنچائی“  
 فیتا بولا: ”تیری موت کی خبر بھی یہاں پہنچی ہوئی ہے۔ شکر ہے تو بچ گیا۔“  
 رمضان دوستے ہوتے ہوئے دکھی آواز میں بولا: ”اد سے یہ مرجاتا۔ وہ گبرو جوان۔ بچ جانا۔“  
 گھر سے روٹنے پیٹنے اور دل درون چھینوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ رمضان اور فیتا کماے  
 کو سہارا دے کر گھر کی طرف لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن کمالا ان کے بازوؤں سے ٹکرا کر  
 ہاتھ گھر رہا تھا۔ گھسیٹے بھی نہیں گھسیٹا جا رہا تھا۔  
 ”کماے ادکماے فیتے اور رمضان نے زور زور سے اسے آوازیں دیتے جھنجھوڑتے  
 دہیں زمین پر لٹا دیا۔

لیکن کمالا کچھ سن نہیں رہا تھا۔ کچھ سمجھ نہیں رہا تھا۔  
 وہ۔ تو ہوس و خرد کی دنیا سے بہت دور جا چکا تھا۔

اس نے اک گہرا سانس لیا۔ اسے پکا یقین ہو گیا کہ اس کے حادثے میں مرنے کی خبر گھر  
 تک پہنچ چکی ہے۔ پھر ایک دم ہی راجاں کے دل کو چیرنے والے مینوں کی آواز اس کے کانوں میں  
 اتری۔ بہت سے لوگ آہ دہکا کرنے لگے۔  
 کمالا چند لمحے ساکت سا کھڑا رہا۔  
 کیا اتنے لوگوں میں اسے گھر میں جا کر اپنے زندہ ہونے کی خبر دینی چاہیے؟ ایسا کیا تو گرفتاری  
 یقینی ہے۔

وہ ابھی ڈھنگ سے سوچ بھی نہ پایا تھا کہ دو آدمی اس کے گھر سے نکل کر گلی میں ادھر  
 ہی آنے لگے۔  
 کمالا جھٹ سے دیوار کے ساتھ لگ گیا۔ اندھیرا کافی تھا۔ وہ ان لوگوں کو نظر نہیں آیا۔ یا شاید  
 وہ باتوں میں اسے دیکھ ہی نہ پاتے۔

کماے نے سنا۔ فیتا ٹانگی، رمضان ماچھی سے کمر رہا تھا۔ ”مر جاے گی پیچاری۔ تو بہتو۔  
 کیسی تڑپ رہی ہے راجاں؟“  
 ”خاوند بھی تو ایسا ہونک ہو اسے؟“ رمضان نے کانوں کو ہاتھ لگا یا۔ ”مر تو خود ہی جائے  
 گی۔ خاوند بھی گیا اور بیٹا بھی۔ تین سال بعد آ رہا تھا تھا بچا رہا۔“  
 کماے کا دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ گھر سے اونچی آوازیں میں مینوں اور سینہ کو بی  
 کی آوازیں آرہی تھیں۔

”جماے کی لاش تو بالکل کچلی گئی“ فیتے نے کہا۔  
 ”کیا؟“ کمالا اک لمبی سی چیخ مارے ہوئے دونوں کے سامنے پک کر آگیا۔ اس کا  
 دماغ بالکل ماؤف ہو رہا تھا۔ فیتے اور رمضان کے گریبان پٹکر دہ چیخا: ”کس کی لاش کی  
 بات کر رہے ہو؟“

”ارے۔ رے۔ کماے تو۔ تو بچ گیا“ فیتے نے اسے پہچانتے ہوئے جلدی سے کہا۔

کو نسا راستہ اختیار کرے، کس راہ پر قدم رکھے۔

راہیں دونوں ہی کٹھن تھیں۔ آسان راستے نہیں تھے کہ جن پر وہ سہل پسندی سے قدم قدم چل سکتی۔ وہ اتنی انجان تو نہیں تھی۔ زندگی کی ہوش ربانگیوں کی بوباس سونگھ سکتی تھی۔

لیکن۔

زندگی تو اب بھی تلخ تھی۔ سسنان، ویران، غیر آباد اور سُونی۔

پھر؟

اُسے ایک راستہ چُن ہی لینا پڑا بیٹھے تھا۔

وہ کئی دنوں سے یہ بات سوچ رہی تھی۔ لیکن فیصلے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ بار بار اس کا دھیان اس تیسری راہ کی طرف جاتا تھا جسے نوید نے مسترد کر دیا تھا۔ اُسے نوید پر غصہ بھی آتا۔ وہ خود عرض بھی لگتا۔ کیا تھا جو وہ اس کی بات مان لیتا؟ اپنی نہ سہی اس کی خوشی کی خاطر۔

کبھی کبھی تو اسے نوید کی محبت پر بھی اعتماد نہ رہتا۔ وہ سوچتی اگر نوید اس سے بچا پیار کرتا ہوتا، اس سے محبت ہوتی، تو وہ اس کی بات مان نہ لیتا، اس کے دکھ کو سمجھ نہ لیتا، اس کے سونے پر کو ختم کرنے کے لیے تیسری راہ پر بے دھڑک قدم نہ رکھ دیتا۔

اس کی ساری کوششوں کے باوجود نوید نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ روٹی تھی، منتیں کی تھیں، محبت کے واسطے دیے تھے، ازدواجی زندگی کی خوشحالی کے ناطے سے بات کی تھی۔

لیکن،

وہ نہیں مانا تھا۔

وہ تو دوسری راہ پر چلنے کے لیے بھی آمادہ نہیں تھا۔ کسی خاص شوق اور خواہش کا

## بلا عنوان

اس کے سامنے دو راستے تھے۔ انتخاب نوید نے اس پر چھوڑ دیا تھا۔

ادھر یا ادھر۔ اس کی مرضی، سوتل اور خواہش پر منحصر تھا۔ نوید نے کھلے دل سے فیصلے کا حق اُسے دے دیا تھا۔

”تم جو بھی فیصلہ کرو۔ مجھے منظور ہے!“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔  
”لیکن...“ وہ گلگھماتی تھی۔

”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ بس دو ہی راستے ہیں۔ ایک چُن لو۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہے!“

”لیکن...“ اس نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

”کمانا لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ تم شاید کسی تیسری راہ کی بات کرنا چاہتی ہو۔ لیکن میں نہیں ایک بار نہیں، کئی بار کہہ چکا ہوں کہ تیسری راہ ممکن ہے، لیکن یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ تمہارے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ کسی ایک کا انتخاب کر لو۔ میں معترض نہیں ہوں گا۔ تمہاری خوشی ہر حال میں مجھے منظور ہے!“

نوید نے خلوص اور سنجیدگی سے آخری بار اپنا آخری فیصلہ سُنا دیا تھا۔ اس کے بعد اس کے پاس کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔

اور وہ تذبذب میں تھی، کشمکش میں تھی کہ کیا کرے،

وہ دونوں دو نہیں ایک ہی ہیں۔ نوید، تانیہ ہے اور تانیہ، نوید ہے۔ دونوں کے جذبے، نظریے، سوچ و فکر اور عمل کی راہیں جب ایک ہی سمت پہنچ گئیں تو باور کرنا ہی پڑتا ہے کہ دونوں دونوں ایک ہیں۔

شادی صرف دو جسموں، نہیں، دو رُوحوں کے اتصال کا بھی نام ہے۔ اس اتصال میں اعتماد اور پیار کے بندھن ہوتے ہیں۔ جب ایسا ہو جائے تو زندگی خوب صورتیوں کا نام بن جاتی ہے۔ چارٹو خوشبو میں پھیل رہتی ہیں۔ مہک اُٹھتی ہے اور سرشاری کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ کوئی تلخی قریب نہیں پہنچتی۔ کسی ولا راد حقیقت کا احساس نہیں ہوتا۔ زندگی کی تال پر دل جھولتے ہیں۔

”نوید؟ تانیہ کتنی“

”ہوں؟“ وہ سرشاری سے جواب دیتا۔

”ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے۔ میں نا؟“

”ہاں“

”پھر بھی لگتا ہے ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کی قریبوں کو محسوس کرتے رہے ہیں۔ کیا تم

بھی ایسا محسوس کرتے ہو؟“

”تانیہ۔ میں نے جب سے شعور کی دنیا میں قدم رکھا تھا، کچھ خوب بجا بے تھے۔ اپنا یہ تھے

اود۔ اور تمہیں پا کر لگتا ہے۔ میرا خواب تم ہی تھیں۔ میں نے تمہیں دیکھے، بنا کر محسوس کیا تھا پھٹا تھا، تم سے دل کی باتیں کی تھیں۔

”سچ؟“

”ہاں تانیہ۔ تم میرے تصورات کا پُر تو ہو؟“

”نوید میں کتنی خوش قسمت ہوں، کچھ ایسی ہی کیفیت میں بھی محسوس کرتی ہوں، بقیہ جیت

کا جو تصور میں نے انجانے پن میں پالا تھا۔ تم اس کے عین مطابق ہو گئے تم نے طے نہ تو کیا ہوتا؟“

”شادی تمہارے لیے تکلیف دہ احساس بن جاتی“

اندر بھی نہیں کیا تھا۔ تقدیر نے جن راہوں پر ڈال دیا تھا۔ وہ بڑے مطمئن انداز میں اسی پر چل رہا تھا۔ چلتے رہنا چاہتا تھا۔ وہ اکثر کہتا۔

”تانیہ! قدرت کو یہی منظور ہے، دکھ تو ہے لیکن گھر نہیں۔ شاید اسی میں کوئی بہتری تھی۔

اسے جان کا روگ نہ بناؤ۔ میں جو ہوں۔ زندگی اور بھی بہت کچھ ہے۔ خوشیاں پھیلی پڑی ہیں۔

انہیں چُنا تمہارے اختیار میں ہے۔“

لیکن وہ نوید کی باتوں پر کبھی دھیان نہ دیتی۔ کبھی خوش نہ ہوتی۔ بانجھ دھرتی کا دکھ اور

روگ اپنی جگہ نہ تھا۔ وہ بانجھ دھرتی بھی تو نہ تھی۔ اس میں ایک بار روئیدگی پھوٹی تھی۔ وہ ان

روئیدگی کے جن سے آگاہ ہوئی تھی لیکن بد قسمتی سے وہ اس جن کو پلوں میں اٹھا کر آنکھوں میں

اتار پڑی تھی کہ خزان نے جھوٹے بزمے کو روند ڈالا تھا۔ آشنا ہو کر نا آشنا ہونے سے بڑا دکھ شاید

اور کوئی نہیں۔

یہی دکھ اس کی ساری ہستی کو اپنی پیٹ میں لیے ہوئے تھا اور وہ زندگی کی ہر سہولت،

ہر آسائش اور ہر آرام کے ہونے ہوئے بھی اُسے سُونا، دیران، سنان اور غیر آباد محسوس کرتی تھی۔

کوئی چار سال پہلے وہ اور نوید رشتہ از دواج میں منسلک ہوئے تھے۔ یہ کوئی محبت کی

شادی نہیں تھی۔ نہ ہی دونوں کی ایک دوسرے سے پہلے جان پہچان تھی۔ تین رشتوں میں سے

والدین نے نوید کو چُنا تھا۔ اور تانیہ نے ان کے انتخاب پر سر جھکا دیا تھا۔ بی اے کے امتحان سے

فارغ ہوتے ہی شادی ہو گئی تھی۔ نتیجے کا انتظار بھی ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔ نوید اعلیٰ تعلیم یافتہ

اچھے اور کھانے پینے گھرانے کا برسرِ روزگار ڈاک تھا۔ تانیہ کے لیے ہر طرح سے موزوں تھا۔ وہ خود

بھی ایک خوشحال گھرانے کی تعلیم یافتہ اور سلیبی ہوئی شائستہ سی لڑکی تھی۔ دونوں کی بڑی مثالی تھی۔

نوید خوب صورت اور باوقار نوجوان تھا۔ اخلاق و کردار بھی اچھا تھا۔ سوچ و فکر بھی عامیانا نہیں

تھی۔ تانیہ اُسے پا کر اپنے آپ کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی تھی۔ خود نوید بھی اسے سرمایہ

حیات تصور کرتا تھا۔ دونوں اپنی اپنی شخصیتوں کا سچ بھلا کر اس جھوٹ پر یقین کرنے لگے تھے کہ

”اُف“ وہ اس کے گلے میں باہیں ڈال کر آنکھیں بند کر لیتی اور نوید اس پر محبتوں کی پھول برسالتے ہوئے اس کے وجود کو اس پھول میں بھگو دیتا۔

زندگی کی شاہراہ پر پھول ہی پھول بکھرے تھے۔ نرم و نازک رنگارنگ پھول۔ جن کی ہلک جاندارتھی۔ تانیہ اور نوید اس شاہراہ پر ایک دوسرے کو تھامے سہل سہل قدم رکھتے چلے جا رہے تھے۔ انہیں تو چلنے سے زیادہ اڑنے کا احساس ہوتا تھا۔ گلتا تھا مسکتی ہواؤں کے سبک پروں پر اڑتے چلے جا رہے ہیں۔

ہر فوجوان جوڑا اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز دھنک رنگ خوابوں اور لہلہاتے مسکاتے تصورات کی تحریک ہی سے کرتا ہے۔ بسا اوقات تو انسان ان خوشیوں کے وجود کو تسلیم کرتے ہوئے خود فریبی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ یہ ہواؤں کی طرح سرسراتی خوشیاں اتنی اپنی اور ایسی دائمی لگتی ہیں کہ ان کے نہ ہونے کا تصور ہی نہ رہتا۔ جائزہ اور اصلی حق کی طرح ان پر انحصار کیا جاتا ہے۔ دکھ غم اور رنج و فکر تو لگتا ہے، دوسروں کے لیے ہیں۔ اپنا تو ان سے دُکھ کا واسطہ بھی نہیں لگتا۔

”تانیہ اور نوید نے بھی خوشیوں، بے بہا خوشیوں کے سنگ سنگ جینے کا آغاز کیا تھا، دونوں واقعی لگتا تھا، ایک ہیں۔ پسند ایک، سوچ ایک، جینے کے انداز ایک۔

بھٹیاں گزار کے نوید دفتر جانے لگا۔ تو تانیہ جو فرتوں کی عادی ہو چکی تھی، اکیلے میں گھبرا گئی۔ یہ چند گھنٹوں کی جدائی برداشت نہ ہوا پاتی۔ اسے لگتا جیسے درونا آشنا زندگی دکھوں کے قریب ہو گئی ہے۔ سارا دن وہ بے قراری اور بے صبری سے گزارتی اور جب نوید آتا تو کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اس کی طرف بڑھتی۔

”اوہ نوید۔ میں تو یہ چند گھنٹے بھی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی“

نوید مسکرا کر اس کے کانوں میں شہدا لگیں ہجے میں سرگوشی کرتا۔ ”میں کون سا تمہارے بغیر

رہ سکتا ہوں؟“

”اک ایک ہی طرح گزارتا ہے وہ میں ہی جانتی ہوں“

”میں بھی جانتا ہوں“

”نوید ایسے کیسے چلے گا۔ کہیں ہم دونوں زندگی کا مفلوج انگ بن کر نہ رہ جائیں“

”مفلوج نہیں، مصروف انگ بننا ہے“

”وہ کیسے؟“

”یہ کر میں دفتر جازم اور تم گھر کی دیکھ بھال کرو۔ اسے سجاؤ بناؤ“

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ وقت گزاری کے لیے ایسا کرنا ہی پڑے گا اپنی اس چھوٹی سی جنت

کو اور دھریب بنانے کے لیے جس ایک ایک لمحہ صرف کر دوں گی۔“

”میں دفتری اوقات میں اس جنت میں واپس آنے کا بے صبری سے انتظار کروں گا“

”پرچ نوید؟“

”ہاں“

تانیہ نے خود کو مصروف کر لیا۔ تین بیڈ روم کا خوبصورت گھر اس کی تو جہ سے اور خوبصورت

ہو گیا۔ اس نے سارے کمروں کی ترتیب بدل ڈالی۔

”اب کیسا لگتا ہے یہ گھر؟“ وہ اتر کر نوید سے پوچھتی۔

”ایک دم جنت۔“

”واقعی؟“

”بالکل“

”کمروں کی نئی ترتیب پسند آئی؟“

”میری تمہاری پسند ایک ہے تانیہ، مجھے تمہاری کسی بات، کسی رائے سے اختلاف نہیں“

تانیہ نے باورچی خانے کا کام بھی اپنے ذمے لے لیا۔ اس نے پہلے دن اپنی پسند کا کھانا بنایا،

میز لگائی، اور نوید آیا تو بڑی خوشی اور غر سے بنایا۔ ”آج میں نے اپنی من پسند چیزیں خود بنائی ہیں

دیکھتے ہیں کھانے پینے میں بھی ہماری پسند مشترک ہے یا نہیں“

کو خوش کرنے، خوش دیکھنے کے لیے اپنی پسند کو مٹا کر دوسرے کی پسند کا بادہ اوڑھ لیتے تھے۔  
دونوں میں اتنا پتلا اور خالص پیار تھا کہ ہلکی سی دلازاری بھی نہ کرتے تھے ایک دوسرے کی۔  
وقت پر نگاہ کرنا چلا جا رہا تھا، لیکن یہ اڑنے لگے جیسے تانیہ اور نوید کی گرفت میں تھے۔  
وہ ہر لمحے سے اپنی خوشیوں کا حصہ کشید رہے تھے۔  
بہت خوش تھے دونوں۔  
بہت خوش۔

اور

خوشی خوشی ایک دوسرے کے لیے جی رہے تھے۔  
لیکن

عجیب سی بات ہے کہ زندگی میں تغیر و تبدل نہ ہو تو یکساہت کا شکار ہو کر ایک دم پور گینے  
لگتی ہے۔ ایک ہی عمل بار بار دہرائے سے گھس پڑ جاتا ہے اور انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ  
وہ تنوع کی پسند ہے۔ زندگی ٹھہراؤ کا نہیں چلنے جانے کا نام ہے۔ یہ کسی ایک نقطے پر رُک  
نہیں سکتی۔ رُک جائے تو زندگی کا نام بدل جاتا ہے۔ جمود بھی تو زندگی کی موت کا نام ہے۔  
نوید کا وقت تو گھر سے باہر بھی گزرتا تھا۔ دفتری کام، دوستوں سے گپ شپ، ادھر ادھر  
کی باتیں زندگی جمود کے قریب نہیں آتی تھی۔ لیکن تانیہ گھر کی چار دیواری میں رہ رہ کر کچھ  
یکساہت کا شکار ہو رہی تھی۔ وہی صبح طلوع ہوتی، معمولات شروع ہو جاتے، دن ڈھلتا اور  
رات اُتر آتی۔ نوید کا پیار۔ چاؤ پونچھے باتیں سب ویسی ہی ہوتیں، جیسی ہمینوں پہلے تھیں  
کوئی نئی بات نہیں ہوتی تھی۔  
نئی بات۔

جس کا دل متقاضی تھا۔ جو سن کی حرورت تھی۔ جو تشنہ رُوح کی سیرابی تھی۔  
تانیہ بچوں کی دیوانی تھی۔ چھوٹا ایسے پیارے بچے اس کی سدل سے کمزوری سے

”تانیہ میں نے کئی بار کہا ہے نا کہ تمہاری پسند میری پسند ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہم دونوں  
اختلاف کے لفظ سے آشنا ہوں۔ زندگی فقلل کرتے چشمے کی طرح بہتی رہے۔ بس۔“  
”چلو کھانا کھا کر تو دیکھو۔“  
”کھاتے بغیر ہی کہہ سکتا ہوں کہ سب چیزیں میری پسند کی ہوں گی۔ تم میری پسند سے الگ  
ہو نہیں سکتیں۔“

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ تانیہ نے بڑی محنت سے ہر ڈش تیار کی تھی۔ وہ ایک ایک لقمے  
پر نوید سے پوچھتی۔

”کیسا ہے؟“

”کیسا لگا؟“

نوید لقمہ لقمہ حلق سے اُتارتے کہہ رہا تھا: ”میں نہ کہتا تھا کہ تم میری پسند سے الگ ہو ہی  
نہیں سکتیں۔ یقین مانو ہر ڈش میری مرغوب غذا ہے۔“

”میں نے تو اپنی مرغوبہ ڈشیں بنائی تھیں۔ ڈر رہی تھی کہ کہیں....“

”یہ تمہارے کمزور اعتماد کی نشانی ہے۔ ورنہ تمہیں تو اس یقین کے ساتھ ڈشیں بنانا چاہیے  
تھیں کہ جو تمہیں پسند ہے وہ میری پسند کے معیار پر بھی پورا اُترے گا۔“

”ایک بات کہوں نوید؟“

”کہو۔“

”یہ حقیقت ہے کہ کھانا میں نے اسی احساس کے ساتھ بنایا تھا کہ میری پسندیدہ چیزیں ہی  
تمہاری پسند ہوں گی۔“

نوید اُسے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر مُسکرائے لگا۔

لباس اور رنگوں میں بھی ان کی پسند ایک تھی۔ کبھی کسی کپڑے پر دونوں میں اختلاف رائے  
نہیں ہوا تھا۔ بات عجیب ہی تھی۔ لیکن یہی حقیقت۔ ویسے یہ بھی ہو سکتا تھا کہ دونوں ایک دوسرے

”چھ سات مہینے گزر گئے شادی کو۔“

”کوئی خوشخبری؟“

”فیملی پلاننگ شروع میں نہیں کرنا چاہیے۔ ایک دو بچوں کے بعد ٹھیک رہتی ہے۔“

”تم تو بچوں کی دیوانی تھیں۔ بھلا دیا نوید نے سب کچھ؟“

”بھئی دیر نہیں ہونی چاہیے۔ بچے ازدواجی زندگی کی خوشیوں کے ضامن ہوتے ہیں۔“

”بچو، میاں بیوی کو اکٹھا رکھنے کی سب سے مضبوط کڑی ہے۔“

”بچوں کے بغیر گھر سونا ہوتا ہے۔“

”بچہ عورت کو تحفظ دیتا ہے۔“

”فیملی پلاننگ شروع میں کی جائے تو کئی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔“

”بعض اوقات بچے کی پیدائش ہی مشکوک ہو جاتی ہے۔“

”اتنے مہینے عیش و آرام لوٹ لیا۔ اب آجاؤ راہ پیہ۔“

”میاں بیوی کے رشتے کو بچہ اٹوٹ بنا دیتا ہے۔“

”اب بچہ ہو جانا چاہیے۔“

”اچھے بیٹھے تانیہ کو یہ باتیں سننا پڑتیں۔ بچے کے لیے وہ خود بھی بے تاب تھی۔ ان باتوں

سے اس کی بے تابی کو تحریک ملتی۔ وہ چاہتی یہ باتیں نوید سے بھی کہہ دے۔ لیکن جیسا مانع ہوتی

وہ کچھ کہنا چاہتی لیکن کہہ نہ پاتی۔

چند مہینے اور گزر گئے۔

تانیہ کے ذہن میں اب سوائے بچے کے اور کوئی بات نہ ہوتی۔ نوید نے کبھی بھول کر

بھی بچے کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ تو خوش تھا، مطمئن تھا اور پرسکون تھا۔

”نوید! ایک دن تانیہ کے دل کی بات بولیں تک آہی گئی۔“

”ہوں۔“

تھے۔ وہ جب بہت چھوٹی تھی تب بھی بچوں سے پیار کرتی تھی۔ کسی کا بھی بچہ دیکھ لیتی تو اسے زبردستی ماں کی گود سے لے کر کھلاتی پھرتی۔ بڑی ہوئی تب بھی بچوں کے لیے مرنی۔ کسی کا بھی بچہ ہوتا تھا یعنی، پیار کرتی۔ گھر میں برتن مانگنے والی نذیراں کا بچہ تو جب تک وہ کام کرتی، اس کی گود میں رہتا تھا۔ اماں لاکھ اشارے کرتیں آنکھیں دکھاتیں، گندے مندرے بچے کو اٹھانے سے منع کرتیں۔ لیکن تانیہ کے من میں قدرت نے ممتا کے جذبات اتنے وافر بھر رکھے تھے کہ انھیں لٹا سنے بنا چارہ ہی نہیں تھا۔

بھابھیاں اپنے اپنے گھروں میں تھیں۔ بڑی آپا اپنے سسرال میں، ہر وقت ان کے بچوں تک تانیہ کی رسائی ممکن نہ تھی۔ لیکن جب بھی وہ آتیں یا تانیہ وہاں جاتی تو بچوں کی ڈنٹے داری اپنے اوپر لے لیتی۔ کتنی خوشی ملتی تھی اسے۔ یہ وہی جانتی تھی۔

بھابھیاں اکثر چھیڑا کرتیں۔ ”تانیہ سارا پیار ساری ممتا دوسرے بچوں پر ہی لٹا دے گی کچھ اپنے لیے بھی بچا کر رکھ۔“

آپا کہتی، ”اپنا وقت آئے گا تو سارے شوق ختم ہو جائیں گے۔ دُور بھاگے گی بچوں سے۔“ وہ ان کی باتیں سننے اور بچوں کو اچھلنے پیار کرنے سے روکتی رہتی تھی۔

”اپنے بچے! وہ تصویر ہی تصویر میں نہ گھل گئے تو تھننے بچوں سے لپٹ لپٹ جاتی اسے بھابیوں اور آپا سے اختلاف تھا کہ بچے دو ہی اچھے۔ وہ تو بہت سارے بچوں کی خواہش رکھتی تھی۔ اس نے صرف دو بچوں کے بارے میں تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ اس بچے کی طرح تھی جو ڈھیر سارے کھلونوں کی خواہش رکھتا ہے۔ بچے بھی تو کھلونے ہی لگتے تھے اسے۔“

شادی کے بعد جب جذباتی ریلوں میں کچھ ٹھہرا دیا۔ تو اسے بوریت، یکسیت اور تنہائی سے چھٹکارا پانے کے لیے ان کھلونوں کا خیال آیا۔ یہ خیال دلانے میں بھابیوں، آپا اور دوسرے لوگوں کا بھی ہاتھ تھا۔

”لے لے ناو، ابھی تک جیسی کی جیسی ہے۔“

”ایک بات کہوں؟“

”سو باتیں کہو جان؟“

”سو نہیں صرف ایک۔“

”ہاں کو؟“

وہ چند لمحے چپ رہا۔ اس کے قریب صوفے پر بیٹھی اپنی لمبی خوب صورت انگلیوں میں پڑی انگوٹھیوں کو اضطرابی انداز میں گھمائے کئی۔

”کیا بات ہے؟“ نوید نے اس کی تجبوتی لٹ چہرے سے پرے بٹلنے ہوئے اس کی

طرف دیکھا۔

”نوید! وہ جھینپتے ہوئے مسکرائی۔

”ہوں؟“

”ہاں۔“

”کیا بات ہے؟ یوں جھمک کیوں رہی ہو کہہ کیوں نہیں دیتیں۔ کیا کہنا چاہتی ہو؟“ نوید

نے اسے اپنے قریب کر لیا۔

اس نے اپنا سر نوید کے کندھے پر رکھتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر بولی۔ ”نوید۔ کیا

تم زندگی میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتے؟“

”کمی؟“

”ہاں کمی۔ سونا پن۔ خاموشی۔“

”کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ اتنی بھری پُری زندگی میں ان چیزوں کا کیا کام۔ میری تو زندگی لبالب

پیمانے کی طرح بھری ہوئی ہے۔ اتنی بھری ہوئی ہے کہ چھلک چھلک پڑتی ہے۔ اس نے زور

سے اسے اپنے ساتھ لگا کر دو بچا۔

”نہیں نوید۔“

”کیا نہیں؟“

”بچے کے بغیر۔۔۔“

”اوہ۔ تانیہ۔“ وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولا۔ ”تو تم یہ بات کہنا چاہ رہی تھیں؟“

وہ اس کی گود میں منہ چھپائے ہوئے مسکراتی آوازیں بولی۔ ”ہاں۔ ہاں نوید۔ اب ہماری

زندگی میں کوئی ممکنہ پھول کھلنا چاہیے۔“

”ہماری زندگی جھکتے پھولوں کا ڈھیر ہے۔“

”نہیں۔ اس پھول کی ٹمک سے تم آشنا نہیں ہو ابھی۔“

”لیکن تانیہ!“

”کیا؟“

”ہم فی الحال اس جھنجٹ میں نہیں پڑیں گے۔“

”کیا؟“ تانیہ نے ایسا دم اٹھتے ہوئے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے

اشباقی انداز میں سر ہلانے لگا۔

”لیکن کیوں؟“

نوید نے اپنی پانچ انگلیاں اسے دکھاتے ہوئے ہنس کر کہا: ”پانچ سال بعد دیکھیں گے۔“

تانیہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی تھیں اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا کلیجہ تھما لیا تھا۔

نوید اس کی حالت نظر انداز کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ”یہ تمہیں بچوں کا ایک ایسی کیسے خیال

آگیا؟“

”مجھے بچے بہت اچھے لگتے ہیں نوید۔ وہ رو ہانسی آوازیں بولی۔

”اوہو!“

”ہاں نوید۔ بہت اچھے لگتے ہیں۔ پیارے پیارے مٹے مٹے بچے۔“

نوید نے سر ہلایا اور گہری سانس لینے ہوئے بولا۔ ”بچے اچھے لگتے ہیں مجھے بھی۔ لیکن۔۔۔۔“



”جتنی ابھی نام نہ لو۔ چنچ چاہتی ہو تو چلو۔ امریکا جانے کا پلان بنا رہے ہیں۔ مجھے جانا تو ہے ہی“ دو سال بعد نہ سہی ابھی سہی۔“  
”تانیہ اُسے شکست دیتی رہی۔“

اور

وہ اپنی پلاننگ کا ایک ایک نقطہ اُسے بتاتا رہا، سمجھاتا رہا۔ بچوں کی اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ تانیہ گنگ سی بیٹھی ذہنی دھچکے کھا رہی تھی۔ ایک تو یہ موضوع ہی اس کے لیے انتہائی نازک اور حساس تھا۔ دوسرے وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اس میں اور نوید میں کبھی بھی کسی مسئلے پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ آج نوید اس سے اتنے اہم، اتنے سنجیدہ اور ایسے پیارے موضوع پر اختلاف کر رہا تھا۔ صرف اختلاف ہی نہیں، اسے قائل کر رہا تھا۔

لیکن

وہ قائل کیسے ہو جاتی؟

دو ہرے صدرے کے بوجھ سے اس کا ذہن ماؤف سا کر دیا۔ وہ یقین نہ کرنے کی ٹانگ وودو کر رہی تھی۔ ایسی حقیقت کا بوجھ نہیں تھی۔ اور جس کا کوئی پہلو ڈھک چھپ کر بے یقینی کا یقین نہیں دلاتا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ اب تک وہ سچ کی سولی پر ہلکے جھوٹے خوابوں میں جی رہی تھی۔ کئی دن وہ بوکھلائی بوکھلائی سی رہی۔ اس اختلاف رائے نے اسے یہ بات یاد کرادی تھی کہ وہ اور نوید دونوں ایک نہیں، دو الگ الگ حقیقی وجود رکھنے والے انسان ہیں۔ ٹوٹ کر بکھرنے والی کیفیت اس پر طاری تھی اور صدرے سے نڈھال ہو رہی تھی۔ وہ بہت دیر روٹی۔ نوید اس کی حالت دیکھ رہا تھا۔ کھد کی گہرائیوں تک جانے اور پہنچنے کی ضرورت نہیں تھی وہ اسے تانیہ کی جذباتیت سے منسوب کر رہا تھا اور اس کا دھیان ہٹانے کے لیے بھی کوشاں تھا کبھی اسے باہر گھمانے لے جاتا۔

کبھی اس کی بھابیوں سے ملانے لے جاتا۔

”لیکن؟“

”فی الحال میں اُن کی ذمے داریوں کا متحمل ہونا نہیں چاہتا“ وہ بولا۔ تانیہ نے ہونفوں کی طرح اسے دیکھا۔

”دیکھو تانیہ، اس وقت ہم دونوں زندگی سے ساری خوشیاں، سارا حسن، ساری محک کشید رہے ہیں۔ تم ہو اور میں ہوں۔ میں ہوں اور تم ہو۔ ہمارے درمیان کوئی نہیں۔ پتے۔ جیناں۔ ذمے داری۔ اُن میں تو ابھی سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”نوید!“

”ہاں تانیہ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ میری کچھ پلاننگ ہے۔ مجھے ان خطوط پر سوچنا اور عمل کرنا ہے۔ ہمیں پوری طرح سٹیل ہونے کم از کم پانچ سال لگیں گے۔“

”پانچ سال؟“

”ہاں۔ میں۔ میں ایک بڑی اور خوب صورت کوٹھی بنوانا چاہتی ہوں۔ بزنس مینجمنٹ، کاکورس۔ کمہ نے امریکا جانے کا ارادہ ہے۔ زندگی کی سہولتیں اور آسائشیں اکٹھی کر لوں گا۔ تب بچے۔“

”کیا اب ہمیں زندگی کی آسائشیں اور سہولتیں میسر نہیں ہیں؟“

”میں اس جگہ رکن نہیں چاہتا ہوں۔“

”آگے بڑھنے میں کچھ مانع تو نہیں ہوں گے؟“

”کیسے نہیں ہوں گے۔ بیڑیاں بن جائیں گے میرے بڑھتے قدموں کی۔ میں چند قدم بھی نہ چل پاؤں گا تانیہ بیگم۔ انہی جھنجھٹوں میں کہیں گم ہو جاؤں گا۔ کھو جاؤں گا اور عمر بھر اُسے انکار کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میں ابھی کھونا نہیں چاہتا۔“

”کیسی باتیں کر رہے ہو؟“

”حقیقت کی۔ سچ کی جو جھوٹ نہیں ہے۔“

”نوید۔ میں یکسانیت سے دو بھر رہی ہوں۔ مجھے تبدیلی چاہیے۔ اور یہ۔ یہ صرف بچے۔“

”کیا۔ یہ سچ ہے؟“ نوید بولھٹا گیا۔

اس نے پھر اثبات میں سر ہلادیا۔ ”مجھے محسوس ہو رہا ہے نوید۔ پورا ہفتہ اوپر۔“  
”نہیں۔ نہیں۔“ نوید نے سر جھٹکا۔

”کیسے نہیں۔ نوید۔ خدا نے۔ اس خالق نے میرے اندر تخلیق کا عمل شروع  
کر دیا ہے۔ نوید۔ میری خوشیاں۔۔۔“

”لیکن مجھے کوئی خوشی نہیں ہے،“

”نوید۔ ناشکری نہ کرو۔“

”اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے“

تانیہ نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ وہ الجھا الجھا اسے تگتا رہا۔ پھر پیر پختے ہوئے  
کمرے میں چلا گیا۔ اس کی ساری بلا رنگ پاپ میٹ ہو گئی تھی۔  
تانیہ دیکھی سی ہو گئی۔

لیکن

یہ کیفیت اس پر زیادہ دیر طاری نہ رہی۔ اس کیفیت کا سکون اور سکھ اتنا اہم، اتنا  
بڑا اور اتنا دلنواز تھا کہ یہ دکھ غیر محسوس سا ہو گیا۔ ویسے وہ بہت دن نوید سے روتی روتی رہی۔  
ڈاکڑ نے تانیہ کے انداز سے کی تصدیق کر دی۔ وہ ماں بننے کے عمل سے گزر رہی تھی۔  
اس پر مرشاری کی کیفیت طاری تھی۔

پچھ۔

اپنا پچھ۔

یہ تصور ہی اتنا جانفز تھا کہ تانیہ کو ہر طرف رنگارنگ مہکتے پھولوں ہی کا احساس ہوتا۔  
خوشیوں کے دھارے اس کے اندر سے پھوٹ رہے تھے۔ اپنے آپ پر مان محسوس ہوتا تھا۔  
اُدھور سے پن کی تکمیل لگتی تھی۔ نوید کو پا کر بھی وہ شاید ابھی الوہی خوشیوں کا احساس نہ کر پائی

کبھی بڑی آپا کے پاس دن گزارنے کو جانے دیتا۔

کبھی بازار لے جا کر ٹھہروں شاپنگ کروا دیتا۔

لیکن

تانیہ کے لبوں کی وہ جیتی جاگتی مسکراہٹ واپس نہیں آئی۔

پھر

یہ

جیتی جاگتی مسکراہٹ تو اس دن اس کے لبوں پر چھوٹی، جب اس کی آنکھوں میں بھی

حسّی کے رنگ چھلک چھلک گئے۔

اس نے اچانک ہی اپنے اندر کچھ تبدیلی پائی۔

کچھ محسوس کیا۔

کچھ جانا۔

کچھ پتا چلا تو وہ نوید سے اپنی خوشی چھپانہ سکی۔

”کیا۔ کیا ہوا۔ اتنی خوش کیوں ہو؟ بڑے دنوں بعد موڈ ٹھیک ہوا ہے۔“

”نوید!“

”ہوں۔“

”وہ۔ وہ۔“

”وہ کیا۔؟“

اس کے جواب میں اس نے مرشاری کے عالم میں نوید کے کان میں سرگوشی کی۔

”کیا؟“ نوید نے اس کی باہنیں لگے سے ہٹا کر حیرانگی سے اسے دیکھا۔

وہ اترتے ہوئے سر اثبات میں ہلانے لگی۔ پھر مٹا کر اس نے دونوں ہاتھوں سے

ہجرہ چھپالیا۔

وہ اس کی بات پر اتنا کڑوا ہوا تھا، پھر کہتی: ”منا کرتی تھی کہ بعض مرد اپنے بچوں ہی سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ لگتا ہے تم بھی ان مردوں میں سے ہو؟“

”تم بھی تو ان عورتوں میں سے ہو۔ جو بچوں کی خاطر شوہروں سے بے پروا ہو جاتی ہے؟“

”میں تم سے بے پروا کب ہوئی ہوں؟“

”تھوڑی اب ہوئی ہو۔ زیادہ ان حضرت کے آنے پر ہو جاو گی۔“

وہ نوید کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتی۔

”نوید!“

”ہوں۔“

”تمہیں بی بی چاہیئے یا بیٹا؟“

”بیٹی نا بیٹا۔ مجھے صرف تانیہ چاہیئے۔“

”اے اے باسے۔ کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہیں۔ تانیہ یہیں ہے تمہارا۔ پاس۔“

”پچھتے کی بات کرو۔ بیٹی پسند ہے یا بیٹا؟“

”تم اپنی کو۔“

”مجھے تو جو مل گیا پسند ہو گا۔ بیٹا ہو یا بیٹی اللہ کی دین ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”خواہش نہیں؟“

”اوں ہوں۔“

”نوید تم باپ بننے والے ہو۔ تمہاری کچھ ذمے داریاں ہوں گی۔“

”جانتا ہوں۔“

”تو ان ذمے داریوں کا احساس ہنسی خوشی کرو نا۔ بُری بات ہے۔ جب بھی بات کرتے ہو۔ جلتے کٹے لہجے میں کرتے ہو۔ تم خوش نہیں ہو؟“

تھی اب تو اس کی دنیا، اس کی دُنیا اس کی سوچ، اُس کے خیال اتنے وسعت پذیر تھے کہ بے تک پائی ہوئی بڑی بڑی خوشیاں بھی چھوٹی اور معمولی لگ رہی تھیں۔

وہ معروف ہو گئی۔ اپنے آپ میں۔ اپنے آنے والے بچے میں۔ اسے لگتا بہت سارے کام کرنے کو ہیں۔ وقت کم ہے۔ اسے بہت کچھ نپٹانا ہے۔ تیاریاں کرنی ہیں۔ ننھی مٹی چیزیں اکٹھی کرنی ہیں۔ کھلونے خریدنے ہیں۔ وہ اپنے کاموں میں لگ گئی۔ کبھی سلامتیاں بٹ رہی ہے۔ کبھی مشین پر جھکی ہے۔ کبھی ڈھیروں چیزیں خرید رہی ہے۔

بھابی نے اسے اس طرح معروف دیکھا تو ہنس کر کہا: ”تانیہ یہ کام تمہارے کرنے کے نہیں ہیں۔“

”کیوں؟“

”پہلی بار تو سب کچھ بہنوں، بھائیوں، نانیوں، دادیوں کی ذمے داری ہوتی ہے۔ فکر نہ کرو تمہیں ہر چیز بنی بنائی مل جائے گی۔“

”نہیں بھابی۔ میں تو ہر چیز اپنے ہاتھ سے بناؤں گی؟ یہ سارے کام آپ لوگوں نے کر دیے تو میں بھلا کیا کروں گی؟“

”تم ننھی مٹی جان کی آمد کا انتظار کرو۔“

”وہ تو میں کس رہی ہوں۔ ایک ایک لمحہ انتظار کے لطف ہمیز کرب سے گزرنے گزار رہی ہوں بھابی۔ لوگ تو دن گنتے ہوں گے۔ میں پل پل گن رہی ہوں۔“

”تیرے شوق کی انتہا ہے۔“

”بھابی آپ نہیں جانتیں کہ جب میں اپنے آنے والے بچے کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے کیا ہونے لگتا ہے۔“

وہ ایسی ہی باتیں نوید سے بھی کہتی تو وہ کبھی ہنس کر اور کبھی میزاری سے کہتا: ”بچے کے آنے تک تم پاگل ہو جاو گی۔“

نوبدرہنس پڑا۔

”ہوں بابا ہوں“

”پتھی؟“

”تمہاری خاطر۔ صرف تمہاری خاطر۔ تم خوش ہو اور میں تمہیں ہمیشہ خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔  
ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ابھی بچے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا پانچ سال بعد کا تھا۔“

”وہ اس کی بات پر ہنس پڑی؟“ میرا پلان نہیں تھا نا۔“

”بس ٹھیک ہے۔ اب مجھے پھر سے پلاننگ کرنا پڑے گی۔ لگتا ہے امریکا میں اکیلا ہی جاؤں گا۔“  
”وہ کیوں؟“

”تو اور کیا۔ تم اپنے بچے کے ساتھ نہیں رہنا؟“

”تو کیا بچہ ساتھ نہیں جاسکتا؟“

”اسنے اخراجات کون پورے کرے گا؟“

”نہ ہسی۔ جانے کی ضرورت نہ تھا بھی کیا ہے۔“

”جانا تو ضرور ہے۔“

”پھر ٹھیک ہے۔ جاؤ گے تو بیوی بچے کے ساتھ۔“

”اچھی دھونس ہے۔“

”دھونس نہیں جناب، حقیقت ہے۔ میں جانتی ہوں کہ تم اکیلے جا ہی نہیں پاؤ گے۔“

”کیوں جی؟“

”اس لیے کہ تم میرے بنا نہیں رہ سکتے۔“

”اسی لیے تو پانچ سال کا پلان۔۔۔“

”اوں ہوں۔ تم بچے کے بنا بھی نہیں رہ سکو گے، نوبدرہ۔ میں جانتی ہوں۔“

”کیسے جانتی ہو؟“

”ایسے کہ میری طرح تم بھی اپنے بچے کا اسی شدت سے انتظار کر رہے ہو۔“

”کیا نہیں کر رہے انتظار؟“ تانیرہ نے وثوق اور اعتماد سے پوچھا۔ ”سچ بتاؤ۔“  
نوبدرہ نے اسے بانہوں میں لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تانیرہ بچے مجھے بھی اچھے لگتے ہیں۔  
صرف اپنے منصوبوں کی وجہ سے میں ابھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ذمے داری آن پڑے۔ پر اب،  
ٹھیک ہے، خدا کو یہی منظور تھا۔ اور پھر تم بھی تو اتنی خوش ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں تمہاری  
خوشیوں کا حصے دار نہ ہوں۔“

”اوہ۔ نوبدرہ۔ تم کتنے اچھے ہو۔ تانیرہ اس کی بانہوں میں سمٹ گئی۔

دن ہنسی خوشی گزرنے لگے۔

ہر عورت کی طرح تانیرہ بھی اولین ایام میں کچھ تکالیف سے دوچار ہوئی۔ اس کے اندر اتنی  
بڑی تبدیلی رونما ہو رہی تھی۔ دو دو میں ایک نیا وجود دھل رہا تھا۔ طبیعت خراب ہونا ہی تھی۔  
کھانا ہضم نہ ہوتا۔ کئی چیزوں سے دل بیزار ہو گیا۔ کئی چیزیں من بھانے لگیں۔ صبح صبح ابرکاتیاں آتیں  
تو انسٹریاں دوہری ہو جاتیں۔ کھانا پیا اُلٹا دیتی۔ نوبدرہ اس کی حالت دیکھتا تو ہمدردی سے کشتہ لگتی  
تکلیف میں ہو۔“

”یہ تکلیف ہر ماں کو سنبھڑتی ہے۔“

”تمہیں ملال نہیں؟“

”کس بات کا؟“

”اپنے آپ کو گرفتار مصائب کہنے کا۔“

”نوبدرہ! کئی بار کہتا ہے اسی باتیں مت کیا کرو جتنی بڑی خوشی مجھے ملنے والی ہے اس کے سامنے

یہ تکالیف میچ ہیں۔“

”تمہارا تو دماغ ہی اُلٹ گیا ہے۔“

”وہ اس کی بات پر مسکرا دیتی۔ اس کے چہرے پر ایسی شفیق اور بھرپور مسکراہٹ پھیل جاتی کہ

نوبید کو لگا کائنات کا سارا حسن اس میں سمٹ آیا ہے۔

تین چار ماہ گزرنے پر تانیہ کی طبیعت آپ ہی آپ سنبھل گئی۔ اب نہ طبیعت میں سُستی رہی، نہ کھایا پیا کسی اٹل، نہ ہی الہکایتوں نے انٹریاں دوہری کیں۔ وہ اب پہلے سے کہیں زیادہ چاق و چوبند تھی۔ چہرے پر بھی ہلکا لکھار تھا۔ تازگی اور جگمگاہٹ تھی۔ نوبید تو نوبید تانیہ جب اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتی تو اپنے آپ پر بے طرح پیارا جاتا۔ مرنے کے نور کے اپنے ہی انداز ہوتے ہیں۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔

تانیہ! ایک دن نوبید نے کہا۔

”جی!“

”ایک چکر مری کا نہ ہو جائے“

”مری۔ اتنی سردی میں!“

”ہر برف پڑی ہے۔ میرے دو دوست اپنی فیلپز کے ساتھ ہوائے ہیں۔ میرا بھی چاہتا ہے۔“

پھر یہی تو وقت ہے، جو گھوما پھرا جا سکتا ہے پھر تو۔۔۔

”پھر تو؟“

”بھئی پھر تو تم پہاڑ پر جانے کے“ نوبید نے ہاتھوں سے پیٹ باہر نکلنے کا اشارہ کرتے ہوئے

ہنس کر کہا۔

”او۔ ہو۔“ تانیہ ہنس پڑی۔

”اس کے بعد جب کوئی ننھا ننھا یا ننھی مٹی آگئی تو گھومنا پھرنا خواب ہی بن جائے گا۔“

”کیوں بھلا؟“

”تمہارے انداز بتا رہے ہیں کہ تم بے حد مصروف، بیدار ہو جاؤ گی۔ سیر سپاٹے کا نام لوں گا تو

تھیں بے شمار کام یاد آ جائیں گے۔ کیوں کہ تم ان کاموں کو ہی اپنا اور عذاب بھونا بنا لو گی۔“

نوبید نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے ہنس ہنس کر کہا تو تانیہ اتر کر اُسے تکتے ہوئے بولی۔

”یہ تو ہو گا ہی۔“

”اس لیے تو کہہ رہا ہوں بھلی لوگ۔ چلو مری چلتے ہیں۔ فرصت کے دنوں کا کچھ تو فائدہ اٹھا دو۔“

تانیہ اس کی بات پر مسکراتے ہوئے بولی: ”ٹھیک ہے۔“

”تو تیل دی کر لو۔“

”کتنے دن کے لیے جاؤ گے؟“

”یہی دو چار دن۔ ایک آدھ دن پنڈی گزاریں گے۔“

”دفتر بند؟“

”نہیں تو۔ شعیب سے نا۔ تم میرے کام کی فکر نہ کرو۔ اچھا تو آج ہی تیل دی کر لو کل صبح

نکل جائیں گے۔“

”گرم کپڑے درکار ہوں گے۔ یہاں اتنی ٹھنڈ ہے، وہاں تو ادھر بھی ہو گی۔“

”ہاں ہو گی تو۔ اپنی شالیں اور میرا چٹخہ ضرور رکھ لینا۔ لیکن بہت زیادہ سامان اکٹھا نہیں کرنا۔“

”جی بہت اچھا۔ آپ دفتر تشریف لے جائیں۔ واپسی تک میں ساری تیاری کر لوں۔“

”ٹھیک؟“

”ٹھیک۔“

نوبید چلا گیا۔ تانیہ خوشی خوشی تیاریاں کرنے لگی۔ واقعی یہی وقت تھا جو وہ آسانی سے گھوٹنے

پھرنے جا سکتی تھی۔ بچہ ہونے کے بعد تو اس طرح فرصت ملنے کا امکان و سوال ہی نہ تھا۔

تانیہ نے سوٹ کیس اور بیگ تیار کیے۔ نوبید کا چٹخہ اسٹور میں گرم کپڑوں کے بڑے بکس

میں پڑا تھا۔ یہاں تو سردی اتنی پڑ ہی نہیں رہی تھی۔ جو چٹخہ استعمال میں آتا۔ لیکن مری لے کر جانا

ضروری تھا۔ نوبید بھی کہہ گیا تھا۔

تانیہ اسٹور میں گئی۔ بڑے بکس کے اوپر دو اور بکس پڑے تھے۔ جو خاصے وزنی تھے۔

اس نے گھسیٹ کر ایک بکس اُتارا۔

”اُف!“ اس کے لبوں سے نکلا۔ دوسرا بکس اُٹارنے کے لیے اس نے ملازم کو آواز دی۔ لیکن وہ شاید باہر گیا تھا۔ جواب نہ پا کر تانیہ نے خود ہی اُسے گھسیٹا۔

لیکن

بکس اُٹھا کر زمین پر رکھتے رکھتے اس کی کمر میں ایک ٹیس سی اُٹھری۔ وہ بکس وہیں چھوڑ دوں ہاتھوں سے کرتھام کر بھکی بھکی سی کھڑی ہو گئی۔ ٹیس انہی شدید بھی کر اس نے ہونٹ و انتوں تلے دبائیے چند لمحے وہ ہانکھیں بند کیے اسی طرح کھڑی رہی۔

پھر

ہوئے ہوئے سیدھا ہونا چاہا۔

لیکن

ہونہ سکی۔ کمر لگتا تھا ٹوٹ ہی گئی ہے۔ اس کے مُنہ سے بے اختیار چیخ نکلی گئی۔

چیخ کی آواز سن کر رجنے کپڑے وہیں چھوڑ، صابن لگے گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھی ادھر بھاگی آئی۔

”کیا ہوا بی بی؟“ اس نے تانیہ کو اس طرح جھکے دیکھا تو جلدی سے پوچھا۔

تانیہ درد سے بے حال ہونے ہوئے بولی: ”رجتے مجھے بیڈ تک لے چلو“

وہ سہارا دے کر اسے کمرے میں لے آئی اور بیڈ پر لٹایا۔ لیکن تانیہ سے سیدھا لٹنا نہ گیا کمر کپڑے وہ دوہری ہو رہی تھی۔

رجتے کو جب یہ پتا چکا کہ اس نے وزنی بکس اُٹھایا ہے تو سینے پر ہاتھ مار کر بولی: ”ہا۔

یہ کیا کیا بی بی آپ نے؟“

تانیہ درد سے بے حال ہو رہی تھی۔ رجنے اس کی کمر سہلانے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

ایسی حالت میں تو ذرا سا وزن بھی نہیں اُٹھانا چاہیئے تھا۔ آپ نے کیا کر دیا بی بی۔ مجھے بکالیا ہوتا

باہر سی تو نلی پر کپڑے دھو رہی تھی۔ اللہ خیر کرے“

رجتے کے سہلانے سے بھی تکلیف رفع نہ ہوئی۔ تانیہ سے درد برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ”صاحب کو بلا لیں جی“ رجتے نے کسی خدشے کے پیش نظر جلدی سے کہا: ”ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے“

رجتے تانیہ کے کہنے پر فون اُٹھا لائی۔ تانیہ نے مشکل فون ملایا۔ دفتر میں شعیب تھا۔ نوید کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

”وہ آئیں تو انھیں فوراً گھر بھیج دینا“ تانیہ نے کراہتے ہوئے کہا۔

”تکلیف کم نہیں ہو رہی تھی۔ تانیہ نے بڑی بھائی کو فون پر بتایا۔ تو وہ بے طرح گھبر کر بولیں: ”یہ تو سنے کیا کر دیا تانیہ۔ میں ابھی آتی ہوں۔ آرام سے لیٹی رہو۔ ہانا جُلنا نہیں“

”ہانا جُلنا تو جا ہی نہیں رہا بھابی!“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”میں آتی ہوں!“

بھابی نے بڑی آپا کو بھی مطلع کیا۔ دونوں آگے پیچھے پہنچ گئیں۔ تانیہ کی حالت دیکھ کر دونوں پریشان ہو گئیں۔

نوید ابھی تک نہیں آیا تھا۔

”اب کیا کریں؟“

نوید ابھی تک نہیں آیا تھا۔ بھابی نے دوبارہ فون کیا۔ وہ اب بھی دفتر میں نہیں تھا۔

”اب کیا کریں؟“ بھابی نے آپا سے کہا۔

”اسپتال لے جانا چاہیئے۔ گاڑی تو ہے۔ نوید کے انتظار میں رہے تو خدا خواستہ کچھ ہو نہ جائے

اے درد بہت زیادہ ہے“

”حماقت کی ہے اس نے“

”اتنا وزنی بکس گھسیٹ کر اُٹھایا“

”بلینڈنگ بھی ہو رہی ہے۔ ایک دم ہی بہت زیادہ ہونے لگی ہے۔“

”اسپتال لے چلتے ہیں، کہیں گزر بڑی نہ ہو جائے۔“

وہ تانیہ کو گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ نوید کو پتا چلا تو اس باختمہ سا ہو گیا۔ وہ بھی اسپتال جا پہنچا۔

اس وقت تانیہ کو آپریشن تھیرٹریے جا جا چکا تھا۔ بلیڈنگ بے انتہا ہو رہی تھی، آپریشن ضروری ہو گیا تھا۔

اور

پھر

وہ ہو گیا۔

ہو تانیہ کے لیے تو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ تانیہ کی جھولی بھرنے سے پہلے ہی خالی ہو گئی۔ بچہ ضائع ہو گیا۔ تانیہ کی جان کے لاسے پڑ گئے تھے۔ بروقت اسپتال نہ لایا جاتا تو اس کی جان کا خطرہ بھی موجود تھا۔ سب سنے تو اس کی جان بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔

لیکن

”تانیہ کو جب ہوش آیا اور صورتِ حال سے آگہی ہوئی تو وہ پاگوں کی طرح پیچ اٹھی۔“ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرا بچہ۔ میرا بچہ۔“

دو تین دن تانیہ کے حواس مختل رہے۔ وہ کبھی دھاڑیں مار مار کر روتی، کبھی چیخنے چلانے لگتی۔ اسے نادل کرنے کے لیے ڈاکٹر کو بڑے جتن کرنا پڑے۔

ایک ہفتے کے بعد وہ گھرا آئی۔ تو یہ حد کمزور ہو چکی تھی۔ نوید اس کی دیکھ بھال بڑی ہی دبا سے کر رہا تھا۔ اس کی طرف سے بے حد فکر مند بھی تھا۔ سارا سارا دن اور ساری ساری رات تیمارداری میں گزار رہا تھا۔ وہ ہر ممکن طریقے سے تانیہ کو بھلانے کی بھی کوشش کرتا۔

اس دن وہ تانیہ کے سر ہانے پٹی پر بیٹھا اس کے بالوں میں پیار سے انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا: ”تانیہ ہمت سے کاٹو۔ بچوں کا کیا ہے اور آجائیں گے۔ تھمدی یہ حالت...“

”نوید۔“ اس نے نوید کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے کہا۔ ”تم تو یہی چاہتے تھے نا۔“

”نہیں تانیہ نہیں۔ خدا کی قسم مجھے تو اب تم سے زیادہ اپنے بچے کی آمد کا انتظار تھا۔“

”جھوٹ۔ تم نے جان بوجھ کر میرا بچہ ضائع کیا ہے۔“

”کیا۔؟“

”ہاں۔“ وہ نونوار نظروں سے اُسے دیکھتی بستر سے اٹھ بیٹھی۔

”تانیہ۔ پلیز۔ ہوش کی باتیں کرو۔“

”ہوش تو اب آیا ہے مجھے۔ تم نے اسی لیے مری کا پروگرام بنایا تھا۔ اسی لیے مجھے چھڑکا

کے لیے کمانا تھا۔“

”تانیہ۔!“

”میں سب جانتی ہوں۔ تم نے بچے سے چھڑکا رہا پانے ہی کے لیے یہ چال چلی تھی۔ تم میرے

بچے کے قاتل ہو۔

”تم نے میرا بچہ مار ڈالا ہے۔ تم پانچ سال سے پہلے بچے...“

”تانیہ!“ نوید نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

”تانیہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر جھوٹ جھوٹ کر رونے لگی کئی دن اسی وہم اور فکر میں مبتلا رہی۔ نوید کے لیے یہ وقت انتہائی کٹھن اور صبر آزما تھا۔ وہ تانیہ کو پیار سے سمجھانے کی کوشش کرتا۔ وہ نہ سمجھتی تو غصے میں آجاتا۔ اسے جھڑکتا، جھنجھوڑتا اور حالات کو سمجھنے کے قابل بنانے کی کوشش کرتا۔ اس نے بھابی اور آپا سے بھی اس سلسلے میں تعاون اور مدد مانگی۔

زخم کو نہ چھیڑا جائے تو وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی بھرنے لگتا ہے۔ بھابی اور آپا نے نوید کو یہی مشورہ دیا کہ تانیہ کو اس کی حالت پر چھوڑ دے۔ تانیہ جیسی بڑی کے لیے یہ صدمہ واقعی ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لیے اسے جی بھر کر ماتم کرنے اور دوسروں کو کوسنے، موردِ الزام ٹھہرانے کی جھوٹ دے دی جلنے لگی۔ خود ہی سنبھل جائے گی۔

لیکن

بعض اوقات انسانی تدبیروں اور عقلمندی کے مشوروں پر تقدیر کھل کر قہقہے لگاتی ہے۔ اسے احساس دلاتی ہے کہ انسان بعض حالتوں میں انتہائی مجبور اور پابند ہے۔ جو چاہتا ہے کر نہیں سکتا۔ جو ہوتا ہے اسے روکنے کی ہمت نہیں رکھتا۔ اپنی ہار کو صبر و شکر کے ساتھ تسلیم کر لینے ہی میں مصہول ہوتی ہے۔

تانیہ کی بد قسمتی یہی نہیں تھی کہ اس کی جھولی بھرنے سے پہلے ہی خالی ہو گئی۔ بد نصیبی تو یہ ہوئی کہ اس کے اندر اس طرح ٹوٹ پھوٹ ہوئی کہ آئندہ ماں بننے کی صلاحیت ہی ختم ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر نے جب پچھ پچھتے بعد اس کا معائنہ کیا تو بڑے افسوس سے یہ انکشاف کیا کہ تانیہ آئندہ کبھی بھی ماں نہ بن سکے گی۔

اس بات سے نوید کو بے حد صدمہ ہوا۔ لیکن تانیہ تو بہن موت ہی مر گئی۔ ڈاکٹر کی بات وہ خود نہ مانتی تو شاید نوید اسے ہلاؤں کے سہارے لیے چلتا۔ لیکن ظلم تو یہ ہوا کہ اس نے اپنے کانوں سے یہ وحشت ناک خبر سن لی۔

اس کا جو رُخ مل ہوتا تھا۔ تمام تر خوفناکی کے ساتھ ہوا۔ تانیہ صدمے سے ٹڈھال ہو کر ایسی بیمار پڑی کہ بچے کی امید ہی نہ رہی۔

صدموں کی حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو ان سے بچنا قدرے سہل ہو جاتا ہے۔ اور حقیقت انسان اسی وقت تسلیم کر لے گا جس وقت اپنا سر رضائے انہی کے سامنے جھکا دیتا ہے، اپنی ہار مان کر اس کی برتری کو مان لیتا ہے، سب کچھ اسی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود بیگانہ ہو جاتا ہے۔ صرف اسی طرح اسے سکون اور تقویتِ قلبی میسر آتی ہے۔ انسان کے سامنے یہ راہ نہ ہوتی تو وہ صبر کے مہم اور اثرات سے آگاہ ہی نہ ہوتا۔ حادثات، صدمات اپنی مہربانیوں سے اس کے ذہن کو ماؤف کر دیتے اس کا دماغ زیرہ ریزہ ہو جاتا۔ اور یہ دنیا پاگلوں کا اجتماعی مسکن بن جاتی۔

نوید نے بڑی ہمت اور محبت سے تانیہ کو اس نقطے سے روشناس کرایا۔

”تانیہ اللہ کی رضا یہی تھی۔“

”صبر سے کام لو۔ خدا صدمہ سننے کی ہمت دے گا۔“

”اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ ہم سوائے سر تسلیم خم کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

خدا کو یہی منظور تھا۔ ہم تم معترض ہونے والے کون؟ وہ جو چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ بندہ تو بے بس ہے، عاجز ہے، مجبور و لاچار ہے۔ اپنی حیثیت کو سمجھو تانیہ۔ خدا کا شکر ادا کیا کرو۔ سب کچھ اسی پر چھوڑ دو۔ جب میں ہوں، تو پھر علم کیوں کرتی ہو۔ میں خدا سے تمہاری زندگی اور قسمت کی دعا کرتا ہوں، تم میرے لیے یہی کیا کرو۔“

”پاپے آپ کو تنہا کبھی نہ سمجھنا تانیہ۔ ہم دونوں زندگی بھر کے ساتھی ہیں۔ موت ہی ہمیں جدا کرے گی۔ زندگی نہیں۔“

تانیہ سنبھلنے لگی۔ اس نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ یہ رضائے الہی تھی۔ لیکن

اس کے باوجود اپنے اندر ممتا کے پھرتے طوفانوں کو نہ دبا سکی۔ وہ اکثر نوید سے کہتی ہیں کیا کروں نوید۔ میرے اندر جو پیدائشی مابِ چھپی بیٹھی ہے۔ وہ چین بیٹے نہیں دیتی۔ میں اس کا کیا کروں؟ نوید بڑا متاثر ہوتا۔ لیکن تانیہ سے ہنس کر کہتا: ”اے ماروالو۔“

”وہ مرقی نہیں نوید۔ اور چاہت سے جینے لگی ہے مجھے بچوں کی ضرورت ہے۔“

اس رات بھی جب وہ نوید کے بازو پر سر رکھے بستر پر چٹ پڑی تھی۔ اور نوید اسے امریکا جانے کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ اس کی باتیں سن کر انہی کہتے ہوئے بولی۔ ”مجھے بچہ چاہیے نوید۔ مجھے امریکا جانے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ مجھے بچہ اور صرف بچہ چاہیے۔“

”لیکن....“

”یہی کہو گے ناکہ اب میرے بچہ نہیں ہو سکتا۔“

”اور قدرت کا فیصلہ ہے۔“



ہیں اس کی رضا کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے، دکھ اور صدمہ مجھے بھی ہوا ہے، لیکن میں نے ان سے نباہ کر لینے کا عہد کر لیا ہے، کیا ہوگا اگر ہمارے بچے نہیں ہوں گے، دُنیا میں اور بھی سینکڑوں مثال ہیں جن کے سہارے جیا جاسکتا ہے، کوئی تعمیری کام سوچو۔ وقت بھی گزرے گا اور خدا بھی خوش ہوگا۔“

”ایک بچے کو پیدا کرنے اور پالنے سے بڑا بھی کوئی تعمیری کام ہے؟“  
 ”اوہ خداوند! بس بھی کرو۔ ٹھیک گیا ہوں میں یہ رٹ سُن کر۔“  
 ”تانیہ چند لمحے چُپ رہی۔ نوید نے اک گہری سانس لی اور تانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے لگا۔ وہ بے قابِل رحم نظر آ رہی تھی۔“

”نوید۔ میں تمہارے ساتھ، اپنے ساتھ کیسے جھوٹ بولوں؟ مجھے بچے چاہئیں۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ نوید جھنجھلا کر بولا۔  
 ”کیا ٹھیک ہے؟“ وہ تجسس سے اس کی طرف جھکی۔  
 ”تمہیں بچے چاہئیں؟“

”ہاں۔“  
 ”تو پھر میرے لیے ایک عدد بیوی ڈھونڈو بچے ہو جائیں گے۔ تم اپنی حسرت انھیں پال کر پوری کر لینا۔“

”ہاں۔“ تانیہ کی آنکھوں میں چمک اُبھری۔

لیکن

دوسرے لمحے گھور اندھیرا پھیل گیا، وہ دکھی سی بولی، ”کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟“  
 ”ایسا کر سکتی ہو؟ اپنے آپ سے پوری ایمانداری سے سوال کر کے مجھے بتاؤ تانیہ۔ کیا تم ایسا کر سکتی ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے نوید کو دیکھا، پھر بے اختیارانہ اس کے سینے پر سر

”نوید۔ یہ میرے ساتھ ہی کیوں ہوا۔ ہزاروں عورتیں اور بھی تو ہیں۔ ایسی بھی ہیں جنہیں سرے سے بچوں کی خواہش ہی نہیں ہوتی، لیکن دھڑا دھڑکنے جتنے جاتی ہیں۔ وہ۔ وہ ہمارے رشتے کی بھابی عاصمہ ہیں نا، جن کے سات بچے ہیں۔ اب نہ چاہنے کے باوجود اٹھویں بچے....“  
 ”تانیہ کوئی اور بات کرو۔ پلیز۔“

”وہ یہ بچہ تمہیں چاہتیں۔ کیا ہوتا جو خدا ان کی جگہ ہمیں دے دینا یہ بچہ۔“  
 نوید نے اپنا بازو اس کے سر کے نیچے سے نکال لیا اور آدھا دھڑاٹھا کراس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ وہ پھر بہک رہا تھی۔ نوید کا دل کٹنے لگا۔  
 ”نوید!“ تانیہ نے بائیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔

”ہوں؟“

”کیا واقعی ہمارے وہاں کوئی بچہ نہیں ہوگا؟“  
 ”ہاں۔“

”بچوں کے بغیر زندگی سونی اور ویلن ہوتی ہے۔“  
 نوید نے سر تکیے پر رکھ دیا۔ تانیہ کی باتوں کا وہ کیا جواب دیتا وہ خود ہی بولے چلی گئی۔

کچھ دیر بعد تانیہ نے نوید کو جھنجھڑ کر کہا، ”سو گئے ہو؟“  
 ”نہیں۔“

”نوید!“

”ہوں؟“

”مجھے بچے کی ضرورت ہے نوید۔ مجھے بچہ چاہیے۔“

نوید اٹھ کر بیٹھ گیا۔ تانیہ کو بھی اٹھا کر بٹھا دیا، پھر اک لمبی پٹوری تقریر کر ڈالی، اسے سمجھایا حالات سے سمجھوتہ کرنے کو کہا۔

”تانیہ تم جو کچھ سوچتی رہتی ہونا، وہ اسٹاپ کر دینا۔ اس کی مرضی یہی تھی۔ ہم بندے ہیں

نامرادی سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ یہ بات اس نے تجربے سے سیکھی تھی۔ امریکا کے قیام دوران اس نے اپنا پورا چیک اپ کروایا تھا۔ ایک نہیں دوا کا نام لکھنا کالوجسٹ نے اس کا معاملہ کیا تھا۔ انہوں نے بھی وہی کہا تھا جو یہاں کے ڈاکٹر نے کہا تھا۔ لاعلاج مرض کی تشخیص ہو گئی تھی۔ بغیر دوا کے کوئی علاج تو ہی قرار لیا گیا تھا۔ پھر یہاں تائید کی میڈیسن سے ملی تھی۔ اولاد والے جوڑے۔ بے اولاد جوڑے۔ لے پالک بچوں کو پالنے والے جوڑے۔ یہاں اس نے مشاہدہ کیا تھا کہ لاولد ہونے کو کوئی جان کاروگ نہیں بناتا۔ ایسے معمر جوڑوں سے بھی وہ ملی تھی جو بے اولاد تھے۔ اور پھر بھی خوش و خرم زندگی گزار رہے تھے۔ بچوں کی محبت کو جانوروں سے پیار کر کے پورا کر لیتے تھے۔ ایسے میاں بیوی بھی دیکھے تھے جن کے بچے نہیں ہو سکتے تھے۔ اور انہوں نے نسکین کے بے یتیم خانے سے بچے حاصل کر کے پال لیے تھے۔ اس نے ایسے ماں باپ بھی دیکھے تھے جو تین بچے پال سکتے تھے۔ دو اپنے پیدا کیے تیسرا یتیم خانے سے لے کر پال لیا۔ قوم کا ایک بچہ گھریلو فضا میں پل گیا۔ تائید ان سے مل کر بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس کی بیوی کی کیفیتوں کو سکون مل گیا تھا اور اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ پاکستان واپس آکر وہ بھی کسی بے سہارا بچے کو گود لے کر اپنی نسکین بھی کرے گی اور ایک بے سہارا بچے کا سہانا مستقبل بھی بنائے گی۔

واپس آکر مستقبل ہوتے ہوتے بھی سات آٹھ ماہ لگ گئے۔

تائید کا مصروفیت میں دھیان شاید بٹا ہی رہتا۔ لیکن اچانک ہی ایک ایسا واقعہ پیش آگیا۔ جو وہ بچے کے متعلق پھر سے سوچنے لگی۔

یہ واقعہ عامر بھائی سے متعلق تھا۔ اس کے آٹھویں بچے کی پیدائش متوقع تھی کہ اس کے میاں کو فالج کا ایک ہو گیا۔ مالی حالات پہلے ہی اچھے نہ تھے۔ اس پر دوہری افتاد۔ وہ بے حد پریشان تھی۔ اُس نے تائید سے کہا ”تمہارے بچے نہیں ہیں۔ یہ ہونے والا تجھے تم گود لے لو تو میری پریشانی بہت حد تک کم ہو جائے گی۔“

”آپ دے دیں گی کچھ بھے؟“ تائید نے بے صبری سے پوچھا۔

رکھ کر بچکیوں سے روتے ہوئے بولی۔ ”نہیں نوید۔ میں تمہیں شیئر نہیں کر سکتی۔“

نوید نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جب تم یہ بھی نہیں کر سکتیں اور یہ بھی جانتی ہو کہ تمہارے بچے نہیں ہو سکتے۔ تو پھر ہر وقت کیوں بکنتی رہتی ہو۔ اپنی ناامیدی کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتیں۔ اپنی نامرادی سے سمجھوتہ کیوں نہیں کر لیتیں۔ میں نے بھی تو کیا ہے مجھے صرف تمہاری ضرورت ہے۔ تم، جو میری ہو۔“

وہ سسکتی رہی۔

نوید بولا۔ ”آئندہ میں تمہارے مُنہ سے کوئی ایسی بات نہیں سنوں۔ سمجھیں۔ وعدہ کرو کرتی ہونا۔ وعدہ۔“

تائید نے یونہی سر ہلا دیا۔

نوید اسے تسلیاں دلا سے دیتا رہا۔ اپنی بے پایاں اور بے لوث محبت کے سہارے بیٹنے کی آس دلاتا رہا۔

نوید نے امریکا جانے کے انتظامات مکمل کر لیے۔ تائید بھی ساتھ جا رہی تھی۔ وہ بھی تیاریوں میں لگن ہو گئی۔ ذہن اس طرف لگ گیا۔ اور بڑی حد تک وہ پرسکون ہو گئی۔ تین سال دونوں نے امریکا میں گزارے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ نوید نے اُسے خوب گھمایا پھرایا۔ تائید نے بھی وقت گزاری کے لیے چھوٹے موٹے کورسز کیے۔ بہت سے لوگوں سے ملی کئی ایک سے دوستانہ مراسم بھی قائم ہوئے۔ وقت اتنا مصروف گزارا کہ تین سال یوں لگا پلک جھپکنے میں گز گئے ہیں۔ تائید کی صحت بہت اچھی ہو گئی تھی۔ ماحول اور وقت نے اسے مچور کر دیا تھا۔ اب وہ پہلی سی جذباتی لڑکی نہیں تھی۔ نوید اس کے ذہنی رویوں کی صحت مند تبدیلی سے بہت خوش تھا۔ لیکن۔

بات یہ نہیں تھی کہ تائید کے دل سے بچے کی لگن مٹ گئی تھی۔ اس کے اندر پیدائشی ماں باپ بھی ہاتھ پھیلائے اپنے چھوٹے بچے کی راہ تک رہی تھی۔ فرق صرف یہ آگیا تھا کہ اب تائید نے اپنی

"میں کیا کروں گی اس کا۔ میرا بس چلتا تو ضائع کھوا دیتی۔ ہمارے حالات تو دیکھ ہی رہی ہو۔  
میں اس کا بوجھ اٹھانے سے قاصر ہوں۔ تم چاہو۔ تو میں یہ بچہ تمہیں دے دوں گی۔ پیدا ہوتے  
ہی لے لینا۔ میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں کہ میرا اس بچے پر کوئی سختی نہیں ہوگا کہی واپس نہیں لوں گی۔  
تانیہ کے دل میں اٹنگ اٹھی۔ اور اس نے اسی دن نوید سے بات کی۔

"نوید ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔"  
"کو۔"

"تم مانو گے؟"

"پہلے بات تو سنوں۔"

"تانیہ نے چند لمحے ادھر ادھر کی باتیں کر کے تہید باندھی۔ پھر بولی۔ "ہمارا گھر بالکل سٹو ہے؟  
"تو پھر؟"

"بچہ ہونا چاہیئے؟"

"پھر وہی باتیں شروع کروں؟"

"سنو تو سہی۔"

"ہوں؟"

"نوید۔ میں بچہ گود لینا چاہتی ہوں۔"

"کی؟"

"ہاں نوید۔ تم اجازت دو تو؟"

"نوید کچھ نہیں بولا۔ صرف اس کا منہ تکتا رہا۔"

"نوید۔ میں جانتی ہوں۔ تمہارے بچے ہو سکتے ہیں۔ لیکن میں تمہیں شیر نہیں کر سکتی۔ ایسا

تصور بھی میرے لیے محال ہے۔"

"تو پھر زندگی گزر رہی ہے، گزارتی چلی جاؤ۔"

"یہ بھی ممکن نہیں۔ ہم بچہ گود لے لیتے ہیں نوید۔ گھر میں رونق ہو جائے گی۔ زندگی یوں ہی  
بے مقصد گزر رہی ہے، اس کا مصروف۔"  
"کسی کا بچہ گود لوگی؟"

"ہاں۔ کیا حرج ہے۔ بچہ تو ہوگا۔"

"نہیں تانیہ۔ نوید تے منفی انداز میں سر ہلایا۔"

"کیوں؟" تانیہ نے پھٹی پھٹی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بس۔"

"یہ کیا بات ہوئی۔ کوئی وجہ بھی ہونا چاہیئے؟"

"وجہ یہی ہے کہ میں کسی دوسرے کا بچہ گود لینے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

"تمہارے اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں؟"

"پھر بھی نوید۔"

"نوید تانیہ کی کسی بات کا جواب دینے کے بجائے اٹھ کر باہر چلا گیا۔"

"کئی دن دونوں میں اس سلسلے میں بات نہیں ہوئی۔ ہاں تانیہ کے ذہن میں مسلسل خیالات  
کے تانے بانے بنتے رہے۔ وہ بچہ گود لینا چاہتی تھی۔ عاصم کا ہونے والا بچہ اسے باآسانی مل  
سکتا تھا۔ وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اپنے ہی خاندان کا بچہ تھا۔ پھر عاصم کے بچے تو بھرت  
اور ذہین بھی تھے۔ آنے والا بچہ بھی پہلے بچوں ہی کی طرح کا ہوگا۔"

"تانیہ نے عزم تو کر لیا تھا لیکن نوید کو سانپے میں ڈھالنا ذرا مشکل نظر آ رہا تھا۔ تانیہ نے  
بھی ہر مشکل سے منکرانے کا فیصلہ کر لیا۔"

"اور پھر اس دن اس نے نوید سے کہہ ہی دیا۔ "نوید یا تو بچہ گود لینے کی ہامی بھرو۔ یا پھر

وجہ بتاؤ۔"

اپنے اعصاب اور ذہن پر مستقل بوجھ ڈال لوں، یہ ٹھیک نہیں۔  
 "تانیہ نے ایک گہری سانس چھوڑی۔

نوید اس کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے بولا: "تانیہ میرے بچے ہو سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو  
 لیکن میں نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں اور تم جانتی ہو کیوں؟"  
 "تانیہ کچھ نہیں بولی تو وہ بولا: "اس لیے کہ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو۔ میں تمہیں دکھ  
 نہیں دے سکتا۔ تمہارے بچے نہیں ہو سکتے۔ اگر سچی بات میرے ساتھ ہوتی۔ تو کیا تم مجھے چھوڑ  
 دیتیں؟"

وہ رکا اور پھر خود ہی بولا: "نہیں۔ تم مجھے کبھی نہیں چھوڑتیں۔ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں بچوں  
 کی خاطر تمہیں چھوڑ کر کسی دوسری عورت کو تمہاری جگہ دے دوں۔ ناممکن۔ انتہائی ناممکن۔"  
 "تانیہ نوید کے گلے لگ کر سسکنے لگی۔  
 اس دن بات آئی گئی ہو گئی۔  
 لیکن

"تانیہ اپنے ذہن سے یہ بات نہ نکال، بلکہ جوں جوں عاصم کی ڈیوری کے دن آسپتھے  
 وہ زیادہ بے چین ہو رہی تھی۔

اس لیے اٹھتے بیٹھتے یہی اصرار کرنے لگی۔

نوید کسی طور غیر بچہ گود لینے کے حق میں نہیں تھا۔

"وہ کوئی غیر بچہ نہیں ہو گا۔ عاصم میرے رشتے کی ہسی، بھابی ہے، پھر اس کے بچے کتنے خوب  
 صورت ہیں، ذہین ہیں۔ یہ بچہ بھی...."

"تانیہ؟" نوید اُلجھ گیا۔ "میں نے سینکڑوں بار کہا ہے میں کوئی غیر بچہ گود نہیں لوں گا۔ تمہاری  
 تسکین کی خاطر میں اپنا سکون منتظر نہیں کر سکتا۔ مجھے بچوں کی خواہش ہے۔ لیکن میں نے اس حقیقت  
 سے فرار کی کبھی کوشش نہیں کی کہ تم میری خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتیں، اس لیے میں نے یہ خواہش

"وجہ یہی ہے کہ میں کسی دوسرے کے بچے کو گود لینے کے حق میں نہیں ہوں۔"

"نہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے بچے نہیں ہو سکتے اور یہ بھی کہ میں بچوں کی دیوانی ہوں۔"  
 نوید نے تانیہ کی طرف دیکھا اور پھر اس کی سنجیدگی کو نظر انداز کرتے ہوئے مسکرا کر بولا: "میرے  
 ایک دوست نے اسکول کھول رکھا ہے۔ اس سال اس نے نرسری بھی شروع کی ہے۔ بہتر نہ ہو  
 گا کہ تم اسکول چھوڑ کر لو۔ نرسری کا سیکشن بھی تمہیں دلا دوں گا۔ صبح ساڑھے سات سے ساڑھے گیارہ  
 بجے تک ایک نہیں کئی بچوں سے دل بہلا لیا کرنا۔"

"تانیہ کندھے اُچکاتے ہوئے بولی: "تجویز بُری نہیں۔ لیکن میں مول ٹائم کی خواہاں ہوں۔"  
 "یہ تو مشکل ہے۔"

"نوید بات مذاق میں نہیں اُڑاؤ۔ مجھے وجہ بتا دو۔ تم کیوں بچہ گود نہیں لینا چاہتے؟"  
 نوید سنجیدگی سے بولا: "تانیہ جو بچہ میرا نہیں ہو گا۔ میں اسے کیسے اپنا سکوں گا جس کی رگوں میں  
 میرا خون نہیں ہو گا۔ وہ میرے لیے اجنبی ہی تو ہو گا۔ پر اسے بچوں سے فحشی طور پر پیرا کیا جاسکتا ہے  
 لیکن انہیں مستقل اپنا یا نہیں جاسکتا۔ یہ میرا خیال ہے۔"

"تمہارا خیال سو فیصد درست تو نہیں ہو سکتا۔ پالنے کی محبت اپنی جگہ بہت مضبوط ہوتی  
 ہے۔ گھر میں جانور رکھیں تو ان سے پیار ہو جاتا ہے۔ لے پالک تو انسانی بچہ ہو گا۔"

"اور جس انسانی بچے کو میں پیار، توجہ اور شفقت نہ دے سکوں۔ کیا یہ ظلم نہ ہو گا؟"  
 "تم دو گے۔"

"میں نہیں مانتا۔ صرف خون کے رشتے اپنا آپ منوا سکتے ہیں تانیہ؟ تانیہ چپ رہی۔  
 نوید کچھ رگ رگ کر دوبارہ بولا: "مجھے یقین تھا کہ تم کبھی نہ کبھی بچہ گود لینے کی ضد کرو گی۔ اسی  
 لیے میں عرصے سے اس پسند کو ذہن میں رکھ کر اپنے آپ کا تجزیہ کر رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ  
 میں وہ پیار، توجہ اور شفقت جو ایک بچہ چاہتا ہے، جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، کبھی اس  
 غیر بچے کو نہیں دے سکوں گا، اور یہ اس کی حق تلفی ہو گی۔ اور میں دانستہ کسی کی حق تلفی کر کے

ہی دلی سے نکال دی ہے۔ دنیا میں سینکڑوں لوگ بے اولاد ہیں ایک ہم بھی ہیں۔ میں نے اس دن تمہیں ملاقات میں زمری جوائن کرنے کا کہا تھا۔ لیکن اب پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ چاہو تو وقت گزاری اور مشغل کے لیے جوائن کر سکتی ہو۔

”تانیہ اس کی لمبی چوڑی تقریر کو سُنی ان سُنی کرتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھ سے پیار کرنے ہو؟“

”یہ کہنے یا جملانے کی ضرورت نہیں۔“

”تو پھر میری خاموشی کی خاطر تم اتنا بھی نہیں کر سکتے نوید؟“

”اوتانیہ۔ پلیز اس موضوع پر بات نہ کیا کرو۔“

”یہ موضوع میری زندگی ہے۔“

تانیہ روتے لگی۔ نوید مضطرب ویلے چین نظر آنے لگا۔

پھر

اس دن جب تانیہ اسی طرح رورور کر نوید سے بچہ گود لینے کے لیے اصرار کر رہی تھی

اور نوید بار بار انکار کر رہا تھا۔ تو تانیہ بولی: ”چلو تم بچے سے کوئی سروکار نہیں رکھنا۔ میں

مانڈ نہیں کروں گی۔“

”تم بچے کی خاطر مجھے نظر انداز کر دو گی؟“

”یہ بات نہیں۔ بچہ میری ضرورت ہے۔“

وہ رورور کر ضد کرنی رہی، اصرار کرتی رہی، اُسے مجبور کرتی رہی۔

”تم بچے کے لیے اس طرح دیوانی ہو گی۔ میں نہیں جانتا تھا۔“

تانیہ روتے ہوئے بولی: ”اب تو جان لیا ہے نا۔ اب تو مان جاؤ۔ بچہ میری زندگی ہے۔

اس کے بغیر میں مڑ جاؤں گی نوید۔ مڑ جاؤں گی۔“

”تانیہ ہوش کی باتیں کر دو۔“

”مجھے بچہ چاہیئے۔“ وہ زور سے بولی۔

”مجھے عزیز کے بچے کی ضرورت نہیں! وہ بھی غصے میں آگیا۔“

”تو۔ تو پھر؟“

”پھر یہی صورت رہ جاتی ہے کہ میں دوسری شادی کر کے تمہاری بچوں کی خواہش پوری کر

دوں۔ بولو۔ منظور ہے؟“

”نوید!“

”میں سنجیدہ ہوں۔“

”تم۔ تم۔“

”دیکھو تانیہ میں یہ نہیں چاہتا۔ لیکن تمہاری یہی ضرورت ہے تو پھر اس کے سوا کوئی دوسری راہ

نہ ہو گی۔ سوچ لو۔ اچھی طرح سے۔ اسی طرح زندگی گزارنا چاہتی ہو۔ تو ٹھیک۔ میں خوش ہوں

مانوش نہیں۔ لیکن اگر تم بچوں کے بغیر جی نہیں سکتیں۔ تو میں یہی کر سکتا ہوں۔ دوسری شادی

کروں۔ بچے ہو جائیں تم انہیں پالو سنبھالو۔“

”تو۔ تم بچہ گود نہیں لو گے۔ عاصمہ بھابی کا بچہ۔“

”نہیں نہیں۔ نہیں۔“

”نوید۔ یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟“

”آخری اوداٹل۔ تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک چن لو۔ تمہاری خوشی میری خوشی ہو گی!“

”تیسری راہ بھی تو ہے۔“ تانیہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

”گود لینے کی؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تو نوید فیصلہ کن انداز میں بولا: ”بالکل نہیں۔ صرف دو راستے

ہیں۔ سمجھیں۔“

اور

اب

کئی دنوں سے تانیہ سوچ رہی تھی۔ دیوانگی سے بھی اور فرزانگی سے بھی۔ راستے دلوں ہی دشوار تھے۔ تیسری راہ کی تو نوید نے گنجائش ہی نہیں رکھی تھی۔ تانیہ کئی دفعہ نوید سے بدن ہوئی۔ وہ پرے درجے کا خود غرض شخص لگا۔ ہٹ دھرم ضدی اور اپنی انا کا قیدی نوید اسے بار بار احساس کثرتی کا شکار بھی محسوس ہوا۔ اس نے روایتی مرد بھی گردانا جو صدیوں قبروں سے اپنی من مانی کرتے اور عورت کو ظلم کا شکار کرتے آیا ہے۔

لیکن

یہ سہجوں کا ایک ہی رخ تھا۔ دوسرا رخ دیکھتی تو یہ ساری باتیں بیچ نظر آتیں۔ نوید ان سے بہت اونچا بہت پرست اور بہت بچا آدمی لگتا۔ وہ کسی دوسرے بچے کو توجہ پیارا نہ شفقت نہیں دے سکتا تھا۔ یہ بیچ اس کے وجود کے اندر سے آگیا تھا۔ اس نے اس بیچ کو چھپایا نہیں تھا۔ بر ملا کہہ دیا تھا۔ وہ کسی پر ظلم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بیچ کسی کی حق تلفی نہیں کر سکتا تھا۔ ظاہر داری اور فریب کا لبادہ نہیں اڑھہ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے واشگاف الفاظ میں تانیہ سے کہہ دیا تھا کہ وہ عزیز بچے کو گود نہیں لے گا۔ وہ تو بچوں کے بغیر بھی تانیہ کے ساتھ ہنسی خوشی جینے پر رضامند مند تھا۔

تو

پھر

ایسا شخص خود غرض کیسے ہو سکتا تھا؟ وہ جھوٹا نہیں تھا۔ فیزی نہیں تھا۔ ہٹ دھرم اور سندی نہیں تھا۔ اس نے تو دونوں راہیں تانیہ کے سامنے پوری سچائی سے رکھ دی تھیں۔ انتخاب تو اس پر چھوڑ دیا تھا۔

لیکن

یہ انتخاب ہی تو سب سے کٹھن مرحلہ تھا۔

کبھی کبھی تو تانیہ اپنے آپ کو کوسنے لگتی۔ اپنا وجود خود غرضی کا پسیر لگنے لگتا۔

اس کی سوچیں دوریہ متوازی سڑکوں کی طرح چل رہی تھیں۔ اس سڑک کا کوئی اختتام تھا نہ اس کا۔ سوچ سوچ کر دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ نوید کو کسی دوسری عورت سے شینر کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ تو کسی عورت پر اس کی نظر پڑتے بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ نوید اس کا تھا۔ صرف اور صرف اس کا تھا۔ اس نے کئی بار اپنے آپ کو ٹولا۔ کہیں گنجائش نظر نہ آئی۔

لیکن

دوسری طرف بچہ بھی اس کی ضرورت تھا۔ زندگی تھی۔ بانجھ دھرتی کا روگ چھپا نہیں تھا۔ جس دھرتی سے کوئی کو نپل نہ پھوٹے، جس پر کوئی سبزہ نہ لہلہائے۔ اس پر دیرانی کی دھول ہی اڑتی رہتی ہے۔ وہ ایس دھرتی کا روپ بھی نہیں دھارنا چاہتی تھی۔ کو نپل اور سبزہ مستعار ہی سہی، اس کی دیرانی کو پاٹ تو سکتا تھا۔ اس کے بانجھ پن پر پردہ تو ڈال سکتا تھا اسے سنسن دیکھا تو بخش سکتا تھا۔

اس نے بہت سوچا۔

بہت سوچا۔

بہت ہی سوچا۔

اور پھر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔

دو متوازی چلنے والی سڑکیں آپ ہی آپ کسی مقام پر آکر ایک ہو گئیں۔ اب تانیہ کو منزل پر پہنچنا دشوار نہ رہا۔

وہ فیصلہ کر کے انتہائی مطمئن ہو گئی۔

پھر

اس رات

جب دونوں ساری مصروفیات نپٹا کر رات سونے کے لیے اپنے بیدارم میں آگئے۔

”نوید۔ تم نے میرے سامنے دو راستے کھلے چھوڑ دیے تھے۔“  
 ”ادہ خدایا۔ وہی گھسیٹا موضوع۔ کوئی اور بات کرو۔“  
 ”نوید۔ میری زندگی کو تم نے جس موڑ پر چھوڑا۔ وہ فیصلہ کن ....“  
 ”تانیہ!“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔“ تانیہ بولی۔

نوید نے غور سے اسے دیکھا اور دھیرے سے بولا: ”واقعی؟“

”ہاں۔ اور اس سے میں تمہیں آگاہ کرنے والی ہوں۔“

نوید خاموشی سے اسے نکلتا رہا۔ کمرے کی فضا بڑی گمبیر ہو گئی۔ روشنی کے باوجود نوید کو سیاہی کے غبار پھیلنے محسوس ہوئے۔

”نوید۔ مجھے پتہ چاہئیں۔ تم شادی کرلو۔ تمہارے بچے۔“ تانیہ کی آواز ٹوک گئی۔

”تانیہ!“ نوید نے اس کے لرزتے وجود کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

تانیہ نے قہر میں توجہ کی اور نوید کی طرف دیکھے بغیر بولی۔ ”بڑے دنوں کی کشمکش اور تذبذب کے بعد میں اس موڑ پر پہنچی ہوں۔ تم نے تیسری راہ نہیں چھوڑی تھی۔ صرف دورانے میرے سامنے رکھے تھے۔ میں۔ میں تمہیں دوسری شادی کی بخوشی اجازت دیتی ہوں۔ تم مجھے اس سلسلے میں خود غرض کہہ سکتے ہو۔ میں اپنی غرض کے لیے تمہیں دوسری شادی کی اجازت دے رہی ہوں!“

”تانیہ!“ شدت جذبات سے نوید کی آواز پھٹ گئی اس کا مضبوط جوان جسم بھی اس کے اس فیصلے سے لرز اٹھا۔

”تم۔“ تانیہ تم۔ بچے کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے کو تیار ہو گئی ہو۔“

”کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا بھی پڑتا ہے۔ وعدہ کرو نوید کہ تم۔ مجھے اب بچے سے محروم نہیں رکھو گے۔ میرا نہیں تمہارا اپنا کچھ تو ہو گا نا۔ اپنا کچھ۔ جسے تم بھرپور توجہ دینا چاہو اور محبت دے سکو گے!“

نوید نے ٹیپ آن کر دیا اور اس کی دل پسند موسیقی کا ترنم ہولے ہولے کمرے میں بکھرنے لگا۔ وہ بیڈ کے سامنے پڑے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ کے کش لیتے ہوئے موسیقی کی لہروں میں مستی سے جھولنے لگا۔

تو

تانیہ کھڑکی کے قریب آکر کھڑی ہو گئی۔

”ہیلو جان من! نوید نے صوفے پر بیٹھے بیٹھے بازو پشت پر لے جاتے ہوئے کھڑکی کے

قریب کھڑی تانیہ کو جھوننا چاہا۔

”نوید۔“ تانیہ خود ہی صوفے کی پشت پر اس کے ہاتھوں کی گرفت میں آ گئی۔

”ہوں۔“

”تم سے کچھ پانیں کرنی ہیں۔“

نوید اٹھ اٹھا۔ جلدی سے اٹھ کر اس کے قریب آیا اور اس کی ٹھوڑی اونچی کہتے ہوئے

اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ”کچھ خاص باتیں؟“

”ہاں!“ تانیہ نے چہرہ اس کے ہاتھ سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”بڑی سنجیدہ ہو۔“

”بات بھی سنجیدہ ہے۔“

”واقعی؟“

”ہاں۔“

”تو پھر کہو۔“

تانیہ چند لمحوں پر چپ رہی۔ بظاہر تو پُر سکون تھی۔ لیکن جس لمحے پر وہ جست لگانے والی

تھی۔ وہ بڑا نقلی تھا۔

”ہاں کہو۔ کیا کہنا ہے؟“

”تانیہ۔“ نوید نے بازوؤں میں اسے بچھ کر اس طرح سینے سے لگایا۔ جیسے وہ دو الگ الگ نہیں، ایک ہی وجود کے دو رخ ہوں۔

بچے کی خاطر تانیہ یہ انتہائی اقدام بھی کر گزرے گی، نوید نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس نے لرزتی کانپتی تانیہ کو بیڈ پر لٹا دیا۔ اور خود انتہائی اضطراب اور بے قراری سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

تانیہ سنبھل کر بولی۔ ”میری خواہش پوری کر دو گے نوید۔ تمہارے بچے میرے ہی بچے ہوں گے۔ اس گھر کی ویرانی اور سناٹا دور ہو جائے گا۔ نوید۔ میری خالی جھولی میں بچہ آجائے گا۔ نا؟“

”ہاں آجائے گا۔ ضرور آجائے گا۔“ نوید نے بے تاثیر لہجے میں کہا۔

”ادہ نوید۔ تم بڑے عظیم ہو۔“ تانیہ نے آنکھیں بند کر کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے ہمیشہ گئے۔

نہ جانے اظہارِ تشکر سے، یا کرب و اذیت سے۔ رات رُک رُک کر ہٹھکھٹھک کر گزرتی رہی۔

نیند دونوں ہی کو نہ آئی۔

لیکن چپ دونوں ہی رہے۔

اس چپ میں اتنا شور نہ تھا، اتنی شوریدگی تھی، اتنا ہنگامہ تھا کہ دونوں پر بے قراری اور بے چینی ہی غالب رہی۔ تانیہ صبح ہی بستر سے اٹھ گئی۔ نوید کسٹنڈی سے بڑی دیر تک کڑوٹیں ہلاتا۔ اس دن وہ دفتر بھی نہیں گیا۔

اور اسی دن بھابی کا فون آیا۔ انہوں نے اطلاع دی تھی کہ عاصم کے بیٹا ہوا ہے۔ اسے گود لینا ہے تو ابھی لے لے۔ فون نوید نے ہی ریسو کیا۔

”کس کا فون تھا؟“ تانیہ نے جانے کی پیالی واپس رکھتے ہوئے پوچھا۔

”بھابی کا۔“ نوید نے تانیہ کی طرف غور سے دیکھا۔ جس کے چہرے پر رات کی بیقراریوں کے

عکس ساتھ ساتھ فیصلے کی سنگین چھاپ بھی تھی۔

”کیا کنتی تھیں۔ مجھے نہیں دیا فون۔“ تانیہ نے پوچھا۔

”تمہاری عاصم بھابی کے بیٹا ہوا ہے۔“ نوید نے تانیہ کے چہرے پر نظریں بدستور جائے رکھیں۔

تانیہ کے چہرے پر لپک جھپک کئی رنگ آئے۔ لیکن اس نے جلد ہی اپنے اوپر قابو پایا۔

”چلو تانیہ تیار ہو جاؤ۔“ چند لمحوں بعد نوید نے کہا۔

”کہاں جانا ہے؟“

”تم تیار ہو جاؤ۔“

”میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔ شاید میں اس وقت کہیں نہ جانا چاہوں۔“

”ٹھیک سہتہ تم آرام کرو۔ میں جانا ہوں۔“

نوید جلدی جلدی ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے میں چلا گیا۔ ننھوڑی دیر بعد وہ تیار ہو کر گاڑی کی طرف جا رہا تھا۔ تانیہ اس کے ساتھ ساتھ آئی۔

گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے پوچھا: ”کب تک لوٹو گے؟“

”پتہ نہیں۔“ نوید نے کہا۔

تانیہ اس مبہم جواب سے کچھ پریشان ہو گئی۔

دو تین گھنٹوں بعد جب نوید لوٹا تو اس کے ساتھ بھابی بھی تھیں۔ تانیہ اپنے بیڈ روم میں بستر میں لیٹی تھی۔ سوئی نہیں تھی مگر سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی تھی۔

نوید اور بھابی آگے پیچھے بیڈ روم میں داخل ہوئے۔ بھابی کے بازوؤں میں کچھ تھا۔

”تانیہ!“ نوید نے اسے پکارا۔ تو وہ بستر سے اٹھ بیٹھی۔

نوید نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔ پھر بھابی کی طرف مڑا اور ان کے ہاتھوں سے نیلے کپس میں لپٹا بچہ لے کر تانیہ کی جھولی میں ڈالتے ہوئے بولا: ”مبارک ہو۔“



”یہ - یہ کیا -؟“ وہ گڑبڑا سی گئی۔

”بیٹا - ہم دونوں کا۔“ نوید نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تانیہ ہراساں سی کبھی بچے اور کبھی نوید کو تنگ رہی تھی۔

بھابی نے بھی مبارک باد دی اور بولی: ”نوید نے مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ تمہاری قربانی سے وہ اتنا متاثر ہوا ہے کہ تمہارے لیے عاصم کا بچہ گود لینے کو بخوشی تیار ہو گیا ہے۔“

نوید تانیہ کے قریب بیٹھتے ہوئے اس کی کمر میں بازو حائل کرتے ہوئے بولا: ”سچ مانو۔ تمہاری خواہش کی شدت کا مجھے رات ہی احساس ہوا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بچے کے لیے تم اتنا بڑا ظلم اپنے آپ پر کر گزرنے کو نیا رہو جاؤ گی۔ لیکن میں اپنی تانیہ پر یہ ظلم کیسے کر سکتا ہوں۔“

بھابی کمرے سے نکل گئیں نوید نے تانیہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا اب تو خوش ہونا؟ واقعی بہت خوب صورت اور پیارا بچہ ہے۔“

”لیکن - لیکن نوید - تانیہ اب تک پورے حواس میں نہ آئی تھی۔ ہل چل سی ہو رہی تھی اس کے اندر۔ وہ خوف زدہ بھی نظر آ رہی تھی اور بے یقینی سے بھی دو چار تھی۔ گہرا کہ بولی: ”لیکن آپ تو کسی غیر بچے کو ترجیح پیار...“

نوید نے تانیہ کو بازو کی لپیٹ میں لیتے ہوئے مسکرا کر کہا: ”گھر میں جانور رکھیں تو اس سے پیار ہو جاتا ہے، یہ تو انسان کا بچہ ہے تانیہ۔ اور پھر تو ہمیں پیارا وہ ہمیں پیارا۔ کیوں جی کیسے؟ ویسے یہ نیسری راہ بُری جی نہیں...“

”تم بہت عظیم ہو نوید۔ بہت عظیم۔“ تانیہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے نوید نے اسے گلے لگا لیا۔

زندگی ایک بار پھر جی اٹھی۔ مگر رنگ قہقہے اور دھنک رنگ خوشیاں اس کا مزاج

رما کے دھم دگمان میں بھی نہیں تھا۔ کہ یہ دونوں اس سے اس طرح دشمنی کر رہے ہیں۔ وہ دوست دشمن کی تمیز نہ کر سکی۔ بات بڑھی۔ گھر والے زیور مانگتے رہے یہاں نے زیور نہ دیا۔

اور۔

نوبت طلاق تک پہنچی۔

طلاق ہو گئی۔ رما بوکھلا گئی۔ رو رو کر مڑا حال کر لیا۔ وہ راشد سے بچھڑ گئی تھی۔

راشد سے۔

جواں کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد تھا۔ جس نے اُسے پیار و محبت کے معنوں سے آشنا کیا تھا اور جو اپنی وجودی خامیوں کے باوجود اُسے اچھا لگتا تھا۔ جو اس کا اپنا تھا لڑائی جھگڑوں کے باوجود جو اُسے تحفظ کا احساس دلاتا تھا۔

لیکن۔

یہاں اور سلیم بڑے گھاگ تھے۔ نفرتوں کا غبار انہوں نے جس مقصد کے تحت پھیلا یا تھا وہ پورا ہو گیا تھا۔ انھوں نے تو لمبا چوڑا پلان بنالیا تھا۔ رما پیر بنانے کی شین بن سکتی تھی۔ وہ رما کو اپنے ہاں لے آئے تھے اور اس پر محبتوں، عنایتوں اور نوازشوں کی بارشیں برسا رہے تھے۔ تسلی پیار اور محبت سے اس سانچے کو بھول جانے کی تلقین کرتے تھے۔

رما بستر سے اٹھ بیٹھی۔ اپنے خوبصورت ہاتھوں کو مسٹے ہوئے اس نے ایک گہری سانس کھینچی پھر دیوار پر لگے کاک پر نگاہ ڈالی سلیم اور یہاں کو گئے گھنٹہ بھر ہو گیا تھا۔ وہ اب لوٹنے ہی والے تھے۔ وہ نبیل کے ہاں حق جہر، زیورات اور دوسری ضروری باتوں کا فیصلہ کرنے گئے تھے۔ نبیل بہت امیر کیر آدمی تھا پہلی بیوی مرچکی تھی۔ دو سالہ معصوم سی بچی کا باپ تھا۔ اس بچی ہی کی خاطر وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔

کل نبیل کی دوسری اور رما کی تیسری شادی تھی۔

رما نے اک انگلٹرائی لی اور بستر سے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی۔ برش اٹھا

دوسرے دن وہ خوب بن سنور کر یہاں کے ہاں جانے کے لیے تیار تھی۔ ساکس نے سیف کھول دی۔

”مے لوجو کچھ پہنا ہے۔ یہاں کی سسرال جانا ہے۔ ٹھیک ہی کہتی تھی وہ زیور ایسے موقعوں پر ہی تو پہنا جاتا ہے“

اس نے دوسٹ گئے میں ڈلے اور باقی ڈبوں سے چپکے سے زیور نکال کر بٹوے میں ڈال لیا۔ ہاتھوں میں جتنی انگوٹھیاں آسکتیں تھیں ڈال لیں۔ جڑاؤ کرے اور درجن بھر چوڑیاں بھی پہن لیں۔

”تقریب تو ایک پہنا تھی۔ یہاں کے گھر سے جب وہ واپس لوٹی تو زیور اس کے بدن پر نہیں تھا۔ ساکس کی نظر اس پر پڑی چھوٹے ہی پوچھا۔

”گلو بند اور ہار جو پہن کر گئی تھیں وہ؟“

”یہاں کے ہی گھر رکھ آئی ہوں۔“

”کیوں؟“

”شام اُترنے لگی تھی۔ اس نے کہا اتنا زیور پہن کر نہ جاؤ“

”تمہیں تو سلیم چھوڑنے آیا تھا۔“

”ہاں۔“

”پھر زیور وہاں رکھنے کی کیا ننگ تھی؟“

وہ جواب دیے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پھر بھی زیور اتنے بڑے جھگمگے کا سبب بنا کر گھر والوں نے رما کو دھکے دے کر نکالا۔

”زیور واپس لے کر آؤ۔“

زیور اب سلیم اور یہاں کے قبضے میں تھا۔ ہاتھ آئی چمیز کیسے واپس دے دیتے۔ دھوکا

بازی پر اُتر آئے تھے اس لیے رما کو وہ بھڑکانے لگے۔